کانفرنس نمبر

جلد (۶) شمارہ (۱)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:۔ سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسؤل
سید فخر الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالنور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو و انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔
(ش) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہٰذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	ﻌﮧ	صہ ۸ر	مے ر
نصف صفحہ	صہ	عال ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	عال ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰	۸ر	۶ر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

جلد (۶) شمارہ (۱)

بابتہ آبان ۱۳۴۲ ف م اکتوبر ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

مدرس سے خطاب

از مولوی محمد عبد السلام صاحب ذکی

خلق خالق نے کئے عالم ہیں بے حد و شمار — دشت و دریا و زمین و آسمان و کہسار
دلفریب و حسن زاد لکش مناظر نور بار — بلبل و گل نغمۂ شیریں فضائے پر بہار
بھاپ بجلی ہی نہیں انسان کی خدمت کے لئے
سجدہ کرتے ہیں ملک اس کی فضیلت کے لئے

ایسے اشرف کی دماغی قوت و قلب و جگر — اک خدا کی شان ہے پرواز اس کی عرش پر
ان کا کیا کہنا حکومت جن کی ہو اُن پر مگر — نوع انساں کے بنانے کا ہے سہرا جن کے سر
اے مدرس تیرا رتبہ کیا رفیع الشان ہے
قالب قومی میں تو روح رواں ہے جان ہے

مانتے ہیں کس کو ہے پیغمبروں کی سروری — جانتے ہیں جزو ہے پیغمبری کا شاعری
ایک معنیٰ سے مگر تدریس ہے پیغمبری — اس لئے تدریس کو خالق نے بخشی برتری
علم الاسماء سے تدریس بشر اول ہوئی
قرارتِ اقراء سے تعلیم نبی افضل ہوئی

شہ جہاں جب قید ہستی میں رہا قید پسر — مشغلہ تدریس کا سمجھا نہایت خوب تر
گو کھلے کے نام نامی سے بھی ہیں ہم باخبر — عمر جس نے وقف کردی قوم کی تعلیم پر
اپنے جیسے فرد پیدا کرنا اس کا تھا خیال
پیارے شاگردوں سے غفلت ایک لمحہ تھی محال

اے مدرس فرض ہیں تیرے فضائل سے سوا — جوش و ہمت اور خوبی سے تو کر ان کو ادا
ذوق علم و فضل کا ایسا تو دیوانہ بنا — تا کہ گہوارے سے مرقد تک پڑھے بچہ سدا
اپنی ذہنی قوتوں کی کھاد دے کر صبح و شام
نونہالوں کی کیا کر آبیاری تو مدام

تیری تیاری سبق کی مشکلوں کا آئینہ　　　تیرا پیشہ ہے نہایت شکل و صبر آزما
جب کتب بینی سے تو اک علم کا دریا بنا　　　ہو سبق دلچسپ ہر تقریر تیری دلربا
ہر مدرس کا نمونہ بھی نہایت نیک ہو
صحت و علم و عمل میں جس کی ہستی ایک ہو
تربیت سے اُن کی غافل ہو نہ اک لحظہ کبھی　　　خدمت قومی کی خاطر وقف کر دے اپنی جان
تیری ہستی ہو خلوص و درد کی ان مول کان　　　تیرے اوصاف حمیدہ سے ہو ظاہر تیری شان
مائیہ شان سیادت ہوں ترے اوصاف بھی
منبع چشم عنایت ہوں ترے الطاف بھی

قطعات

دلچسپیاں جو لیتے ہیں تعلیم میں سوا　　　ممنون اُن کے دل سے ہیں سارے اساتذہ
کیا خوف ہے سفینۂ تعلیم کو ذکی　　　سلطان علیم بیڑے کے ہیں جب کہ ناخدا

دیگر

میہمان اپنے بصد شان و جلال آتے ہیں　　　علم کے شمس مہ نور و جمال آتے ہیں۔
جن کے جلوؤں سے بنی کانفرنس زینت طور　　　ایک ہی سال نہیں سال بسال آتے ہیں۔

دیگر

کیا تجربوں کا خاص خزانہ نہیں ہے یہ　　　فن کی دکاں میں ملنے کا سودا نہیں ہے یہ
چُن لیجئے کنارہ پہ اس کے دُر و صدف　　　ہے بحر فیض تنگیٔ صحرا نہیں ہے یہ

روئداد
پانچویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ
منعقدہ ۲۶ و ۲۷ ر امرداد ۱۳۴۰ف
پہلا اجلاس

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا پانچواں سالانہ جلسہ بتواریخ ۲۶ و ۲۷ ر امرداد ۱۳۴۰ف سٹی کالج کی شاندار عمارت میں زیر صدارت مولوی سمیع اللہ بیگ صاحب نواب مرزا یار جنگ بہادر میر مجلس عدالت العالیہ سرکار عالی منعقد ہوا۔

پہلے روز اجلاس اول میں سب کام وقت پر ہوئے۔ افتتاح نمائش کے بعد مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی منصرم صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و میر مجلس انجمن نے تحریک کی کہ عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کر کارروائی کانفرنس کے آغاز کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ اس کی تائید جناب جی۔ اے چندرو ارکر صاحب ایم۔ اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی نے کی۔ قرارت اور بھجن کے بعد جناب ریورنڈ ایلیسن صاحب پرنسپل ویسلین مشن ہائی اسکول سکندرآباد نے انگریزی میں اپنا جامع مگر مختصر خطبہ استقبالیہ پڑھا جو بجنسہ ٹیچر کی اس اشاعت میں درج ہے۔ اس کے بعد مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی منصرم صدر دارالعلوم نے اردو میں خطبہ استقبالیہ پڑھا جو ذرا طویل اور رپورٹ انجمن کی بہت سی باتوں پر حاوی تھا۔ یہ بھی بجنسہ ناظرین ٹیچر کی اطلاع کی غرض سے کہیں اور جگہ درج ہے اس کے بعد معتمدی عمومی نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں سابقہ منظور شدہ تحریکات کے متعلق جو کارروائی ہوئی، اس کا ذکر کیا اور رسالہ کی مالی حالت کی اصلاح کے لئے اپیل کی۔

اس کے بعد عالی جناب صدر نشین صاحب نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

(۱) "انجمن ہذا اپنے پرجوش رکن اور سررشتہ تعلیمات کے ایک نیک نام اور سرگرم عہدہ دار مولوی عبدالسلام ناظر مدارس بیدر کے انتقال پر قلبی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے۔ اور ان کے پسماندگان سے اپنی دلی ہمدردی ظاہر کرتی ہے"۔ جس کو حاضرین نے خاموش کھڑے

ہوکر قبول کیا۔

اس تعزیت کی تحریک کی منظوری کے بعد فاضل صدرنشین صاحب نے اپنا بلیغ خطبہ صدارت بزبان انگریزی پڑھا، جس کا اردو ترجمہ بغرض استفادہ ناظرین اسی اشاعت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مس ڈی بوٹھ صاحبہ صدر معلمہ شاخ کندر گارٹن سینٹ جارج گرامر اسکول نے تخفیف خطرۂ طفولیت کے عنوان سے اپنی دلچسپ تقریر سنائی اس کے ختم ہونے پر جناب جی یس پرکاش راؤ صاحب نے بزبان انگریزی رفریشر کورس کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرتے ہوئے حسب ذیل تحریک پیش کی۔

"اس کانفرنس کی رائے میں اس لحاظ سے کہ بعض ٹرینڈ اساتذہ کچھ عرصہ کے بعد تعلیم کے جدید طریقوں سے ناآشنا ہوجاتے ہیں۔ لہذا ایسے مدرسین کے لئے بلدہ میں ایک رفریشر کورس کا وقتاً فوقتاً انتظام کیا جانا چاہیئے جس میں ممالک محروسہ کے منتخب مدرسین شریک ہوسکیں"

اس تحریک کی تائید جناب مولوی سید تجمل حسین صاحب بی۔اے۔ بی ٹی اور تائید مزید جناب مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نقوی بی۔اے نے فرمائی۔ اس میں مولوی شیخ ابوالحسن صاحب نے ترمیم پیش کی کہ اصل تحریک میں لفظ "بلدہ" سے پہلے "نارمل اسکول" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ اس ترمیم کو محرک صاحب نے قبول کرلیا اس لئے اصل تحریک اس ترمیم کے ساتھ باتفاق آرا منظور ہوگئی۔

دوسرا اجلاس

سب سے پہلے مولوی حبیب اللہ صاحب دفا مدرس مدرسہ فوقانیہ بیدر نے باجازت صدر صاحب ایک نظم بعنوان زمزمۂ تعلیم پڑھی جس کے آخر میں صاحب موصوف نے بلدہ میں اپنے تبادلہ کی خواہش کا اظہار فرمایا۔

اس نظم کے بعد تعلیم سائنس کی کمیٹی کی رپورٹ جناب یس ہوزدن صاحب میر مجلس کمیٹی مذکور نے پڑھی۔ اس رپورٹ کا اقتباس اردو اور انگریزی میں چھاپ کر حاضرین میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ رپورٹ مذکورہ کے منظور ہونے کے بعد جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب نے حسب ذیل تحریک پیش کی۔

"اس کانفرنس کی رائے ہے کہ تمام مدارس شاہی میں صہ ۲/۱ سہ - سہ ۲/۱ لعہ اور لسہ ۲/۱ مار کے تین جدید سائیڈ گریڈ ان "مدرسین کے لئے قائم فرمائی جائیں جو علی الترتیب (سہ تا صہ) - (مسہ تا مسہ) (للعہ تا مسہ) اور (مصہ تا لسہ) کے گریڈ میں انتہائی یافت تک پہنچ گئے ہوں اور یا تو بلحاظ عمر یا کسی اعلیٰ امتحان میں کامیابی حاصل نہ کرسکنے کے لحاظ سے اپنے موجودہ گریڈ سے اعلیٰ گریڈ میں ترقی نہ پاسکتے ہوں"

شیخ صاحب موصوف نے مجوزہ سائیڈ گریڈوں کی ضرورت پر کافی روشنی ڈالی اور جناب چندر ولاکر

صاحب نے اس کی تائید میں بذریعہ اعداد شمار دوسرے سررشتہ جات میں تین سائیڈ گریڈوں کا ہونا بیان کرتے ہوئے ان کی اہمیت کی زیادہ وضاحت فرمائی مولوی سید خیرات علی صاحب مددگار صدر مہتمم بلدہ کی تائید مزید کے بعد یہ تحریک باتفاق آرا منظور ہوگئی۔

اس کے بعد مولوی سید ظہور علی صاحب نے ایک لکچر بزبان انگریزی بعنوان "صدر مدرس" پڑھا یہ لکچر اس قدر دلچسپ اور گدگدانے والا تھا کہ بعض اوقات خود مقرر صاحب کو مسلسل تالیوں اور قہقہوں کے شور کی وجہ سے اپنی تقریر میں رکنا پڑتا تھا۔ صاحب موصوف نے ایک حقیقی صدر مدرس کا خاکہ نہایت عمدگی سے اور پُر مذاق طریقے پر کھینچا۔

شب کے نو بجے حسب پروگرام سب سے پہلے جناب مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ایم۔ اے کیوریٹر نمائش گاہ بلدہ نے بعنوان "بعض نادر سکہ جات" بذریعہ فانوس طلسمی انگریزی میں تقریر فرمائی۔ جو بہت دلچسپ تھی۔ اس کے بعد جناب مولوی سید یوسف صاحب مددگار ناظم آثار قدیمہ نے "رائچور کے آثار قدیم" پر انگریزی تقریر فرمائی۔ فانوس طلسمی کے یہ دونوں لکچر دلچسپ تھے مگر بوجہ بارش حاضرین کی تعداد کم تھی۔

تیسرا اجلاس

ٹھیک سوا نو بجے شروع ہوا سب سے پہلے باجازت عالی جناب صدر نشین صاحب مولوی عبد السلام صاحب ذکی مددگار مدرسہ وسطانیہ اردو شریف نے ایک مختصر سی نظم پڑھی۔ پھر جناب چندر وارکر صاحب نے حسب ذیل تحریک پیش کی۔

"اس کانفرنس کی رائے ہے کہ جملہ صدر مہتمم صاحبان تعلیمات جہاں کہیں ممکن ہو اپنے معائنہ میں مضامین درسی کے مخصوص مدرسین سے امداد لینے کے مجاز گردانے جائیں۔ ایسے مددگار صاحب کا ان مدرسین میں سے انتخاب کیا جائے' جو کم از کم چھ سال کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہوں اور ان کو اس کام کے لئے مناسب معاوضہ ملنا چاہیئے۔"

چندر وارکر صاحب نے اس تحریک کے پیش کرنے میں نہایت مدلل تقریر فرمائی۔ اس کی تائید بجائے مولوی عبد النور صاحب صدیقی کے جو بعض خانگی وجوہ کی بنا پر تشریف نہ لا سکے' عبد السلام صاحب ذکی نے فرمائی اور جناب سالم بن سعید صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء نے تائید مزید فرمائی۔ جناب شیخ ابو الحسن صاحب نے اس تحریک سے اختلاف فرمایا کہ اکثر صدر مہتمم صاحبان مدارس تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں اس لئے وہ ہر مضمون کا امتحان لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد جناب سید محمد اعظم صاحب ایم۔ اے صدر سٹی کالج نے اس تحریک

کے متعلق موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک ترمیم پیش فرمائی کہ انگریزی میں تحریک کے الفاظ میں might کے بجائے should کا لفظ ہونا چاہئے۔ چنانچہ محرک صاحب نے اِس ترمیم کو قبول کرلیا۔ اور تحریک بغلبہ آرا منظور ہوگئی۔ پھر سید محمد شریف مشہدی نے باغ بانی کے متعلق اپنا مضمون اُردو میں پڑھا۔ تربیت اخلاق کی سب کمیٹی کی رپورٹ جو بسوط اور دل چسپ ہے، مولوی سید غلام محمود صاحب معتمد کمیٹی نے سُنائی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ بھی اُردو و انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر حاضرین میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ رپورٹ مذکور کے منظور ہونے کے بعد مولوی عبدالجبار صاحب مدرس مشاغل دستی سٹی کالج نے اپنا مضمون بعنوان "تعلیم مشاغل دستی" انگریزی میں پڑھا۔

چوتھا اجلاس

اس اجلاس میں سب سے اول جناب راجیا صاحب صدر مدرس ضلع محبوب نگر نے باجازت عالی جناب صدر نشین صاحب اپنا تیار کردہ بالفریم حاضرین کو دکھایا اور اُردو و تلنگی الفاظ اور اعداد لکھنا پڑھنا سکھانے میں اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتایا۔ پھر مدارس ثانویہ امدادی کے انتظام کے متعلق جناب مولوی معین الدین صاحب قریشی نے حسب ذیل تحریک پیش فرمائی۔

"اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ہر ایک امدادی مدرسہ ثانویہ میں ایک باقاعدہ انتظامی مجلس ہونا چاہیئے جو سررشتہ تعلیمات کی مسلمہ ہو۔ صدر مدرس اس مجلس کا رکن ہو۔ اور اُس کو مدرسے کے اندرونی انتظام میں وہی اختیارات حاصل ہوں جو مدرسہ شاہی کے صدر مدرس کو حاصل ہیں اور موجودہ قواعد امداد میں ایسی ترمیم فرمادیجائے، جس کی رُو سے مذکورہ شرائط کی تکمیل منظوری امداد کے لئے لازمی گردانی جائے"۔

صاحب موصوف نے اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے اُردو میں ایک مبسوط تقریر فرمائی جس کی تائید میں جناب آر سُبّا راؤ صاحب صدر مدرس مدرسہ مفیدالانام نے انگریزی میں تقریر فرمائی۔ جناب سیمسن صاحب کو اس تحریک سے اختلاف تھا موصوف نے بیان کیا کہ تحریک کا جزاول و جز سوم یعنے مجلس انتظامی کا ہونا اور صدر مدرس کا رکن ہونا کافی ہے۔ جزدوم مجلس کا مسلمہ سررشتہ ہونا۔ اور جز چہارم "صدر مدرس کو مدرسے کے اندرونی انتظام میں ..... الخ غیر ضروری ہے۔ لہذا حسبہٖ ترمیم کردی جائے۔ اس ترمیم کی تائید جناب راؤبہادر ونکٹ ریڈی صاحب نے فرمائی، مگر افسوس کہ محرک صاحب نے اس کو منظور نہ کیا اور یہ ترمیم (۱۳) کے مقابلے میں (۶۰) آرا سے نامنظور ہوئی۔ اور اصل تحریک بغلبہ آرا منظور ہوئی۔ اس کے بعد جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے سائنس پر تقریر فرمائی۔ کیوں کہ

صاحب موصوف بوجہ کسلمندی مزاج حسب پروگرام لکچر تیار نہ کرسکے۔

اس کے بعد جناب میر مجلس صاحب انجمن نے آئندہ کانفرنس میں رپورٹیں پیش کرنے کے لئے منتخب شدہ مضامین ڈرائینگ۔ السنہ علمی۔ اور مینول ٹرینگ (دستی مشاغل) کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد مولوی نظیر حسین شریف صاحب نے بحیثیت معتمد نمائش کمیٹی رپورٹ نمائش سنائی جس کے ختم پر (۱۴) انعام تقسیم ہوئے، اور عالی جناب صدر نشین صاحب کی آخری تقریر کے بعد مولوی سید ظہور علی صاحب نے عالی جناب صدر نشین صاحب اور دیگر حضرات کا جنہوں نے کانفرنس میں مدد دی تھی بالخصوص جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب اور جناب مولوی عبد الرحمن خاں صاحب نیز سر رشتہ آثار قدیم کے عہدہ داروں کا نام بنام شکریہ ادا کیا۔ حضور پر نور، صدر نشین صاحب کانفرنس نیز سید محمد اعظم صاحب و سید ظہور علی صاحب کے لئے تین تین چیرز کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔

خطبہ استقبالیہ اجلاس پنجم کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد

ریورنڈ ال۔ ہمیس۔ بی۔ اے پرنسپل ویسلین مشن ہائی اسکول سکندرآباد

میں مسرت کے ساتھ اُس عزت کی قدر کرتا ہوں جو آپ نے آج مجلس استقبالیہ کا صدر نشین منتخب کرکے مجھے بخشی ہے۔ میں اسے صرف ذاتی قدر افزائی نہیں سمجھتا بلکہ سکندرآباد کے سارے ہم پیشوں کی خدمات کا اعتراف سمجھتا ہوں۔ حیدرآباد کی تعلیمی برادری کے ساتھ جو قریبی تعلق بلدہ کے مدارس کو حاصل ہے وہ ہم لوگوں کو جو تالاب کے اس طرف رہتے ہیں حاصل نہیں ہماری مثال متبنّٰی کی سی ہے لیکن ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم آپ ہی کے ہیں اور خوش ہیں کہ برادری کے مشوروں میں ہماری جگہ بھی متعین ہے۔

مجلس استقبالیہ کے صدر نشین ہونے کی حیثیت سے میرا پہلا فریضہ یہ ہے کہ بڑی خوش دلی کے ساتھ کانفرنس کے مشہور زمانہ صدر عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر کا پر خلوص خیر مقدم کروں یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ آپ کی مصروفیتوں کا شخص اپنے دو کامل دن ہماری کانفرنس کے بحث و تمحیص کو خاموشی سے سننے کے لئے وقف کردے۔ ہم آپ کی اس موجودگی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ جب ساری کارروائیوں کے ختم پر آپ نظر بازگشت ڈالتے ہوئے تقریر

فرمائیں گے۔ تو ہم آپ کی پختہ رائے اور قانونی دماغ سے پورا پورا فائدہ حاصل کرینگے۔ جناب ممدوح نے صدارت قبول فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ آپ کو تعلیمی اُمور سے کس قدر دلچسپی ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ اس فرض کو بھی تسلیم کر لیا جو آپ پر تعلیم کی جانب سے عائد ہوتا ہے۔

جناب والا!

اجازت دیجئے کہ میں اس فرض کی توضیح کرتے ہوئے آپ کو یاد دلاؤں کہ مدارس کے بغیر علماء ایسا وجود میں نہیں آسکتیں اور مدرسین کے بغیر اُن میں حکام نہیں پائے جاسکتے۔ ہم نیازمندی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم مدرسین کا وجود ریاست میں بڑی اہم چیز ہے۔ جس طرح موٹر بغیر پیٹرول کے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی اسی طرح ملک بھی بغیر مدرسین کے ترقی کا قدم آگے نہیں اٹھا سکتا۔

ہمیں مزید خوشی اس سے ہے کہ جناب ناظم صاحب بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کی شرکت محض سر سے چھدا اُتارنے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کی غرض ہمدردی اور کھلے دل سے مدرسین اور مدارس کے مفاد کو یکساں طور پر ترقی دینا ہے اس موقع پر ہماری آنکھیں مولوی سید علی اکبر صاحب کو ڈھونڈھتی ہیں۔ چونکہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہم ان کی نسبت جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ صدر مہتمم ہونے کی حیثیت سے اُن میں نقاد عہدہ دار اور مہربان مشیر کی دو خوبیاں غیر معمولی طور پر جمع ہیں۔ جب میں نوآموز مدرس تھا صدر مہتمم صاحبان کا معاینہ ایک ہیبت ناک منظر برپا کر دیتا تھا۔ طلبہ اور مدرسین مارے خوف کے کانپ جایا کرتے تھے اور اُن کا کام اپنی اصلی حالت سے بہت گرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مولوی سید علی اکبر صاحب کے معائنہ کے وقت یہ حالت نہیں ہوتی۔ اُن کے احترام کا خیال بغیر خوف کے پیدا ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے دوستانہ انداز اور حقیقی مفید ہدایات کا ممنون ہوں۔ ہم ان مدرسین حضرات کا بھی دل سے خیر مقدم کرتے ہیں جو یہاں موجود ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اس کانفرنس میں انہیں اپنے دل کو گرمانے اور مزید معلومات حاصل کرنے کا کچھ نہ کچھ مواد ملے گا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان کانفرنسوں کے انعقاد کا فائدہ کیا ہے؟ ان میں بجز ہما ہمی اور بے سود تیز و تند بحث و مباحثہ کے اور کیا رکھا ہے۔ مجھے اس رائے سے کلیتاً اختلاف ہے اگر اجازت ہو تو میں کانفرنس سے جو دو نہایت مفید مقصد حاصل ہوتے ہیں بتاؤں۔

پہلی بات یہ ہے کہ کانفرنس کے انعقاد سے سررشتہ تعلیمات کی پالیسی کی نسبت ہمیں اظہار رائے کا موقع ملتا ہے اگر کوئی شکایت ہے تو ہم اُسے بیان کر سکتے ہیں نصاب نامہ

میں ترمیم، مدارس کی تنظیم، مدرسین کی شخصیت سے متعلق اور دوسری باتیں یہاں اُٹھائی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمیں ملک کے تعلیمی امور کے انتظام میں اگر براہ راست کوئی اختیار نہیں تو اظہار رائے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ جتنی سرگرمی سے ہم کانفرنس میں حصہ لینگے اتنا ہی ہمارا اثر قوی ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ سب کا سب بیک وقت نہیں ملے گا۔ اصلاحات کا تبلانا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اُن کا عمل میں لانا۔ اگر ہمارے مطالبات معقول ہیں اور ہم جم کر اُن پر اڑے رہیں تو وہ کلیۃً نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ ریاستوں کے محکمے ساری دنیا میں سست رفتاری کے لئے بدنام ہیں (اگرچہ ان کی سست رفتاری کے وجوہ معقول ہیں) لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ جمہور کے صحیح اور نیک انجام رائے کے اثر ہمیشہ کے لئے محفوظ رہیں۔ اس معاملہ میں ریاست کے سر رشتہ تعلیمات نے ہمارے خیالات و آراء کے قبول کرنے میں ہرگز تاخیر نہیں کی۔ پچھلے کاغذات کو دیکھکر مجھے جرات ہوتی ہے کہ حکام نے کس طرح انجمن اساتذہ کے کانفرنس کی بہت سی تجاویز کو شرف قبولیت بخشا ہم ان میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں اگرچہ ان کے علاوہ اور بہت سی ہیں۔ مدارس میں طبی معائنہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان پر نظر ثانی اور بالخصوص سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دینا۔ پیشہ کی تعلیم کا انتظام۔ جسمانی ریاضت کی تعلیم۔ مدرسین کے لئے پرو وی ڈنٹ فنڈ کا قائم کرنا۔ طبقہ وسطانیہ کے امتحان کا برخاست کیا جانا۔ عثمانیہ میٹرک کے امتحان کے لئے تین سال کی تعلیم کا انتظام کرنا۔ ان سب امور کے متعلق گذشتہ کانفرنس میں تجاویز منظور کی گئیں اور ہر ایک پر عمل کیا گیا۔ ابھی گذشتہ سال کانفرنس میں یہ بات اُٹھائی گئی تھی کہ تحتانیہ اور وسطانیہ کا نصاب نیا تیار کیا جائے آج ہم اس نصاب کو پہلی چمکدار جلد میں اپنے ہاتھوں میں پاتے ہیں۔ اس مثال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا یہ سر رشتہ نہ صرف ترقی کی راہ پر گامزن ہے، بلکہ اُن کانفرنسوں کی کارروائیاں بے نتیجہ نہیں ثابت ہوئیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کانفرنس کی بدولت ہمارے ہاتھ میں تعلیم کی ترقی کا ایک حقیقی آلہ موجود ہے بشرطیکہ ہم اس کو سمجھ کر استعمال کریں۔

دوسرا مقصد جو کانفرنس کے انعقاد سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم نئے خیالات سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ ہلاکت اور گناہوں میں سب سے سنگین گناہ جس میں مدرس مبتلا ہوسکتا ہے وہ پرانی باتوں کا پرانے طریقے سے تعلیم دینا ہے۔ پامال لیک میں پڑ جانا تباہی لاتا ہے۔ نئے نئے معلومات نہایت حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ہر طرف چشمے

کی طرح ابلتے رہتے ہیں جو مدرس اس سے بے خبر ہے وہ اپنے فرض کے انجام دینے میں کوتاہی کرتا ہے ہے ایسے شخص کو گلی سڑی چیزوں کے ساتھ کسی عجائب خانہ کے الماری میں پڑا رہنا چاہیئے نہ کہ نئی اور بڑھتی ہوئی بات کی کُنہ کے متلاشی پود کی تعلیم کا فرض اس کے ذمہ ہونا چاہیئے۔ جو شخص اس کانفرنس میں شریک ہوا ہے وہ نئے خیالات لئے بغیر یہاں سے نہیں اٹھ سکتا ان خیالات کو سمیٹنا ہمارا کام ہے اور چاہیئے کہ جب موقع ہاتھ آئے نئے نئے طریقوں پر کاربند ہونے کی کوشش کریں۔ ہم زمانہ سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ میرا یہ ذاتی شعار ہے کہ ہر سال کوئی نہ کوئی نئی چیز چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات نیا طریقہ کام نہیں دیتا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم کوشش کریں اور ناکامیاب رہیں یہ بُرا ہے کہ ہم سرے سے کسی چیز کو آزما کر دیکھیں ہی نہیں۔ دنیا میں تعلیم کے کام سے بہتر کوئی دوسری شئے نہیں اور کسی دوسری چیز کو اتنی اہمیت نہیں! کسی چیز کا اثر اتنا دُور رس نہیں جتنا کہ تعلیم کا۔ بس یہ بات قریب قریب جرم کے ہے کہ بہتر سے بہتر معلومات اور بہتر سے بہتر طریقے جو میسر ہوں کام میں نہ لائے جائیں۔ اس کانفرنس کو چاہیئے کہ اس بات میں ہماری مدد کرے۔ مجلس استقبالیہ کی طرف سے میں یہ اُمید ظاہر کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اور نیز اُن کے علاوہ اور طریقوں سے کانفرنس بہت کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔

رسالۂ جامعہ

زیر ادارت مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری و ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے پی ایچ ڈی

یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے۔ جو تقریباً سات سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور اپنے بلند پایہ علمی مضامین کے باعث ملک میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جامعہ کے مضمون نگاروں میں ہندوستان اور یورپ کے مشہور انشا پرداز شامل ہیں جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ ان تمام حضرات کے مضامین ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے ہیں۔

- پروفیسر فریڈرش مائینکے (برلین)
- محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن)
- مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی
- ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب پی ایچ۔ڈی
- زبید احمد صاحب بی۔اے (لندن)
- مولانا سید سلیمان صاحب ندوی
- ملک اسلم خاں صاحب بی اے (کیمرج)
- سجاد ظہیر صاحب بی۔اے (آکسن)
- یوسف حسین خانصاحب بی۔اے (عثمانیہ) (پیرس)
- ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

رسالہ کی خوبیوں کا اندازہ نمونہ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے جو صرف ایک کارڈ لکھنے پر مفت ارسال کیا جاتا ہے۔ البتہ تازہ پرچہ ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔ رسالہ کی سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے اور اراکین اکاڈمی کی خدمت میں مفت پیش کیا جاتا ہے۔ مفصل کیفیت خط و کتابت سے معلوم کیجیئے۔

منیجر رسالہ "جامعہ" دہلی

خطبۂ استقبالیہ

شیخ ابوالحسن۔ بی۔ اے۔ ال ٹی پرنسپل فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم بلدہ حیدرآباد

جناب صدر و خواتین ذوالاحترام و حاضرین کرام! انجمن اساتذہ حیدرآباد نے مجھ جیسے ہیچمیداں اور نووارد کو مجلس استقبالیہ کی طرف سے آپ حضرات کا خیر مقدم کرنے کے لئے مقرر فرما کر میری نمایاں عزت افزائی کی اس لحاظ سے خود اراکین انجمن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرا خوشگوار فرض ہے کہ انجمن اساتذہ کی طرف سے ہمارے صدر منتخب عالیجناب مولوی مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب الملقب بہ نواب مرزا یار جنگ بہادر میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن جیسی علم دوست و ہمدرد تعلیم ذات ستودہ صفات نیز معزز مہمانوں اور محترم اساتذہ کی خدمت میں انجمن ہذا کی اس پانچویں سالانہ کانفرنس کی شرکت کی تقریب میں ہدیہ خوش آمدید پیش کرتے ہوئے تہ دل سے خیر مقدم کروں۔

گذشتہ چار کانفرنسوں کے مواقع پر عالیجناب نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر و نواب مہدی یار جنگ بہادر و جناب خان فضل محمد خاں صاحب اور نواب اکبر یار جنگ بہادر جیسی ممتاز و علم دوست ہمدرد قوم ہستیوں نے جو حیدرآباد کے طبقہ عہدہ داران میں قابل فخر و مباہات ہیں کانفرنس ہذا کی کرسی صدارت کو زینت بخشی ہے۔ اور اس روایت کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے اس وقت ہم میں علم قانون کے زبردست ماہر و نقاد و میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد جیسی ہستی بحیثیت صدر منتخب رونق افروز ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال گزرے کہ قانون کو تعلیم سے کیا نسبت لیکن قانون ایک اکتسابی چیز ہے اور تعلیم ایک فطری ضرورت اور لازمہ انسانیت ہے تو پھر ایسا شخص جو ان صفات سے متصف ہو کیونکر نہ ایسے تعلیمی جلسہ کے صدارت اور اس کی رہنمائی کا مستحق ہو۔ اس لئے ہم اراکین انجمن اساتذہ نہ صرف اس ایک بلکہ متعدد وجوہ کی بنا پر خاص طور سے خوش قسمت ہیں کہ اس سال عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر جیسی ذی مرتبت و ذی اقتدار و ماہر تعلیم ہستی ہماری صدر ہے جن کی علمی قابلیت و لیاقت، ادبی ذوق و علمی انہماک، پختہ تجربہ و پبلک سرگرمی، مسلمہ فراست و صداقت اظہر من الشمس ہیں جن اصحاب نے نواب صاحب موصوف کی تالیفات و مضامین مثل اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور آپ کا معرکۃ الآرا مضمون ڈومنین اسٹیٹس نیز

خطبہ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس جو (۴۸) صفحات پرشتمل ہے بہ نظرِ غور ملاحظہ فرمایا ہے وہ یقیناً اس امر میں میرے ہم نوا ہونگے کہ ہمارے منتخب صدر اُن منتخب افراد میں سے ہیں جن کو قدرت نے جملہ کمالاتِ انسانی سے متصف کیا اور ایک سوچنے والا دماغ اور ہمدرد دل بخشا ہے۔ مسئلہ تعلیم میں صاحب موصوف کی کامل وسیع النظری و صحت استدلال اس بات سے ظاہر ہے کہ آج سے پانچ سال قبل نواب صاحب موصوف نے ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ میں اپنے ماہرِ فنِ تعلیم نہ ہونے کا اعتراف فرماتے ہوئے مسئلہ تعلیم پر جن خیالات کا اظہار فرمایا اُس کی توقع مسلمہ ماہرینِ فن سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ نواب صاحب موصوف ایک عملی انسان ہیں آپ نے پانچ سال قبل مسئلہ تعلیم کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج بھی ویسے ہی مسلمہ اصول سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے ۔

معزز حاضرین !

آج ہم نے نواب صاحب موصوف کو اُن ہی خیالات کے اعادہ کی زحمت دی ہے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آج ہم ان تعلیمی مسائل کی علاوت سے جن میں بہت ہی اہم ترقی و تغیر پذیر (۵) سال کے تجربات کی چاشنی بھی شامل ہوئی ہے۔ شیریں کام و لذت اندوز ہونگے۔ اور قوی اُمید ہے کہ طبقہ اساتذہ کے لئے یہ خیالات واقعی اُن کی زندگی میں مشکلات کی دور کرنے میں مشعل ہدایت کا کام دینگے ۔

نواب صاحب موصوف نے مسئلہ تعلیم کے متعلق خطبہ مذکور میں تین خیال پیش فرمائے تھے ۔

اول یہ کہ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو ہمیں اپنی زندگی بسر کرنے اور کسی قدر آرام سے بسر کرنے میں معاون ہو۔

دوسرے یہ کہ ہماری تعلیم ایسی ہو کہ بلحاظ ضروریات زمانہ موجودہ افراد سے مقابلتاً بہتر افراد تیار ہوسکیں۔

تیسرے یہ کہ ہماری تعلیم ایسی ہوتی چاہیئے کہ جو ہم کو اپنے ہمسایوں اور ہم وطنوں کے ساتھ امن و سکون اور خوشی سے زندگی بسر کرنے میں مدد دے ۔

معزز حاضرین ! یہ تینوں خیالات ایسے ہیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور ہر انسان کو خاص کر اساتذہ صاحبان کو ہمیشہ کے لئے شمع ہدایت اور مطمع نظر بنالینا چاہیئے۔

نواب صاحب موصوف صنعتی و پیشہ وری تعلیم کے بھی حامی ہیں جس کی شدید ضرورت پر صاحب موصوف نے آج سے پانچ سال قبل اظہار خیال فرمایا تھا اور یہ ضرورت آج بھی ویسی

ہی شدید ہے جیسے کہ پہلے تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری فیاض گورنمنٹ کے سامنے اس کی ایک وسیع اسکیم زیر غور ہے اور انفرادی طور پر اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی اس خصوص میں گورنمنٹ کے فوری خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ بے روزگاری و بیکاری کے اہم مسئلہ سے ہمارے ملک کو شروع ہی سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آئے۔

گزشتہ کانفرنسوں میں آپ انجمن کی تاریخ مقاصد اور کام کے متعلق سُن چکے ہیں اور آپ اسی جلسہ میں سال گذشتہ کی کارگزاری اور انجمن کی مصروفیتوں کا اندازہ معتمد صاحب عمومی کی رپورٹ سے فرماسکیں گے۔ لہذا میں صرف ان ضروری اور مقامی مسائل پر اکتفا کروں گا جو کانفرنس ہذا اور تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگرچہ انجمن اساتذہ حیدرآباد جس کے طفیل میں ہم اس وقت یہاں مجتمع ہوئے ہیں ابھی اپنے عہد طفولیت کی منزلیں طے کر رہی ہے لیکن اس نے گذشتہ چھ سال کے عرصہ میں نہایت مفید اور نتیجہ خیز کام نہایت خاموشی اور استقلال کے ساتھ انجام دیئے ہیں جو لایق تحسین ہیں۔

اس انجمن کی بدولت بلدہ کے مختلف مدارس کے معلمین میں باہمی ارتباط اور برادرانہ تعلقات قائم ہو چکے ہیں اور اس نے تعلیمی ضروریات اور ان کی مختلف مشکلات پر غور اور اس کے حل کرنے میں اور مدرسین کو رسالہ حیدرآباد ٹیچر کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے اس انجمن نے ایک حد تک حیدرآباد کے اساتذہ میں اپنے پیشہ کے ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کر دیا ہے اور اس کے تسلسل و استقلال کے لئے ہمیشہ کوشاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب کہ یہ انجمن ریاست کے جملہ تعلیمی خیالات وضروریات کو عملی جامہ پہنا کر رہیگی تعلیم کے اُن پیچیدہ مسائل کو جو ابھی تک اُلجھے ہوئے ہیں سُلجھانا اس انجمن کا عین نصب العین ہے۔ یہ انجمن اپنے فریضہ کو کما حقہ ادا کرنے میں قاصر رہیگی۔ اگر اس کی جانب سے ہمارے ہر دلعزیز و بیدار مغز ناظم تعلیمات جناب خان فضل محمد خان صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔ کیونکہ نہ صرف انجمن ہذا بلکہ اُس کے آرگن حیدرآباد ٹیچر کو بھی صاحب موصوف کی سرپرستی و رہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ جس توجہ اور گرمجوشی سے ہماری جملہ کارروائیوں میں صاحب موصوف نے دلچسپی اور ہمدردی کا ثبوت دیا ہے اس کے ہم سب بہ دل ممنون ہیں۔ آپ حضرات کو یہ خبر سُن کر یقیناً انتہائی خوشی حاصل ہوگی کہ ہماری فیاض گورنمنٹ نے کتب خانہ انجمن ہذا کو ایک ہزار کے یکمشت رقم خریدی کتب کے لئے عطا فرمائی ہے اور پندرہ روپیہ کی ماہانہ امداد بھی جاریہ اخراجات کے لئے منظور فرمائے

گئے ہیں جس کے لئے ہم عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات کے شکر گزار ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی ہستی ہے جس کو ہماری آنکھیں یہاں ڈھونڈ رہی ہیں اور وہ بظاہر یہاں موجود نہیں ہے لیکن ہم سب کے دل میں موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم سب بھی اس کی نظر باطنی میں موجود ہونگے۔ وہ کون یعنی ہماری انجمن کے مستقل صدر مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ ۔ ہم اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں کہ صاحب موصوف جیسی ذیشان اور جامع کمالات ہستی ہماری انجمن کے صدر رہے۔ ممدوح مذکور ہماری انجمن کے روح رواں ہیں گو کہ صاحب موصوف اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں لیکن (دل کے آئینہ میں ہے تصویر صدر جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی) یہ ہماری غفلت شعاری و احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ان کی مسلسل و مستقل مستعدی اور غیر محدود سرگرمی اور غیر معمولی محنت کا شکریہ نہ ادا کریں جس نے انجمن اور اس کے سہ ماہی ارگن کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اس کے بعد انجمن ہذا ہمارے موجودہ صدر انجمن مولوی سید ظہور علی صاحب کے مساعی جمیلہ کی بیحد ممنون ہے جن کی ان تھک کوششوں اور غیر معمولی محنت کا نتیجہ ہے کہ سال حال کے سالانہ کانفرنس اساتذہ کا انعقاد بروقت اور اسی آن بان سے ہو رہا ہے جیسا کہ گذشتہ موقعوں پر ہوا ہے۔

انجمن اساتذہ حیدرآباد چونکہ آل انڈیا فڈریشن آف ٹیچرس ایسوسی ایشنز سے ملحق ہے اس لئے ہماری ریاست کے باہر بھی وہ تسلیم کی جا چکی ہے۔ ہر سال انجمن کی طرف سے چند نمایندے فیڈریشن کے اجلاس میں حصہ لینے کے لئے بڑے دنوں (کرسمس) کی تعطیلات میں جو ہر سال کسی بڑے شہر میں منعقد ہوا کرتا ہے۔ جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۳۸ف میں مولوی سید ظہور علی صاحب اور مسٹر جنیدر وارکرنے فیڈریشن میں انجمن ہذا کی نمایندگی کی تھی ۱۳۳۹ف میں خود جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و مولوی فخر الحسن صاحب ملا۔ و مولوی عبد النور صاحب صدیقی نے انجمن ہذا کی نمائندگی کی۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس انجمن کو اپنی سرگرمیوں کا دائرہ تمام ممالک محروسہ میں وسیع کرنا چاہیئے۔ بظاہر کوئی امر اس کو ممالک محروسہ سرکار عالی کے مرکزی انجمن بنانے میں مانع نہیں ہے۔ مختلف اضلاع و اکثر تعلقات میں ایسی ہی تعلیمی انجمنیں قائم ہیں ہر صورت ہر مستقر ضلع پر اسکی ایک شاخ قائم کی جائے اور اگر وہاں پر اب تک کوئی ایسی انجمن قائم ہے تو اس کو اس میں ضم کرنا چاہئے ورنہ جہاں قائم نہیں ہے وہاں ایسی انجمن کے قیام کی کارروائی کی جائے اگر عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات اس جانب اپنی ادنیٰ سی توجہ فرمالیں تو یہ مشکل جلد آسان و

حل ہو سکے گی۔

سہ ماہی رسالہ حیدرآباد ٹیچر جو انجمن ہذا کا آرگن ہے تمام ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہندوستان کے مختلف صوبوں نے اس کو اور اس کے مضامین کو مستحسن قرار دیا ہے اور ممالک غیر کے اکثر اہل قلم اور انشا پرداز اس کے مضامین نگار اور قلمی معاون ہیں لیکن تاحال اس کی مالی حالت ایسی نہیں ہے جو اس کو انجمن اساتذہ کے سالانہ زر امداد سے مستغنی کر دے۔ حامیان تعلیم اور عام اساتذہ و ممبران انجمن سے اُمید ہے کہ اس کی امداد و اعانت اور اشاعت کو اپنا فرض بنا کر اس کو ہر طرح سے کامیاب اور مستغنی بنانے کی کوشش فرمائیں گے۔ اب میں اپنے معزز محترم مہمانوں کی طرف مخاطب ہوتا ہوں اور شرکت کانفرنس اساتذہ کے لئے ازراہ ہمدردی و دلچسپی تعلیمی آپ کی زحمت فرمائی اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں ساتھ ہی یہ عرض کرنے کی بھی جرات کرتا ہوں کہ آپ صاحبان تعلیمی معاملات میں اگر اور زیادہ دلچسپی اور کسی قدر ایثار سے کام لے کر ہمارے مشکل اور اہم کام کو آسان اور خوش گوار بنانے میں انجمن ہذا کی اعانت فرمائیں تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔ جس سے ہماری ترقی میں مزید عزت پیدا ہوگی۔ اس قسم کی دلچسپی کے اظہار کا بہترین موقع یہ ہو سکتا ہے کہ آپ حضرات اساتذہ کی امداد کے لئے اپنے بچوں کے خانگی اوقات میں اُن کی تعلیمی اور تفریحی مشاغل اور اخلاقی حالت کی نگہداشت کریں ان میں ورزش جسمانی کا شوق اور مطالعہ کا صحیح ذوق پیدا کریں۔ اس طرح سے اساتذہ و والدین کے باہمی ارتباط و نگرانی اور اتحاد عمل سے ہم نونہالان ملک کے علمی جسمانی اور اخلاقی تربیت اور اس کی صحیح نشو و نما کر سکتے ہیں۔ آپ حضرات مجھے معاف کرینگے اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس بیسویں صدی میں بھی اکثر ایسے والدین سے سابقہ پڑا ہے جن کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے بچے کس جماعت میں زیر تعلیم ہیں اور اُن کا تعلیم دلانے سے آیندہ کے لئے کیا مقصد ہے۔ بچے کا رجحان کس طرف ہے اور اس کو کس شعبہ زندگی کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ والدین کو ان باتوں کا افسوس ناک اور رنج دہ علم اس وقت ہوتا ہے جب کہ خدانخواستہ ان کا شکار غفلت بچہ سالانہ امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے یا جب کبھی بروقت عدم ادائی فیس کی وجہ سے اس کا نام جماعت سے خارج ہو جاتا ہے اور مکرر ڈبل فیس داخل کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

اس کی سخت و شدید ضرورت ہے کہ ہم اپنا تھوڑا سا وقت اپنے معصوم' ناواقف اور ناتجربہ کار بچوں کے تعلیمی حالت اور اُن کی آیندہ زندگی کی تیاری پر صرف کریں۔ جیسا کہ آج کل دوسرے تمام متمدنہ ممالک کا دستور و عمل ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اپنی نکتہ چینیوں سے کسی کی

دل آزاری کروں بلکہ اس تمام سمع خراشی سے صرف یہ مدّعا ہے کہ حالات کے خرابی و ابتری کو آپ کی نگاہیں بے نقاب اور ان کے صحیح رنگ میں دیکھ لیں اور مائل بہ اصلاح و ترقی ہوں۔

اب میں اپنے ہم پیشہ اساتذہ یعنی تعلیمی برادری کے کارکنوں کے طرف متوجہ ہوتا ہوں اور آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے آپ کے اتحاد عمل کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا طبقہ ایک ایسے پیشے سے تعلق رکھتا ہے جس کی بہت کم عزت کی جاتی ہے بلکہ حالیہ فضا میں دنیا کا سلوک بعض اوقات حقارت کے درجہ تک پہونچ جاتا ہے لیکن اس سے ہم کو پست ہمت سُست یا غمگین نہ ہونا چاہیئے۔

باوجود اس حقارت آمیز سلوک کے دنیا اس کو تسلیم کرتی ہے کہ معلمی کا پیشہ دنیا میں شریف ترین پیشہ ہے اس پیشہ کی کامیابی کے لئے محنت و ایثار دو لازمی جزو ہیں آپ کے سر چند اہم ذمہ داریاں ہیں خصوصاً نونہالان قوم و ملک کی نگہداشت، مدرسہ میں ان کی تعلیم و تربیت اور بازیگاہوں میں ان کی نگرانی اس خصوص میں آپ کے فرائض روز افزوں ترقی پر ہیں اور آپ نہ صرف ان کی تعلیمی ترقی ہی کے جواب دہ ہیں بلکہ ان کے اخلاق و تربیت کی نشو و نما کا اہم کام بھی آپ ہی کے ذمہ ہے۔ ہر مدرس کو اپنے عملی نمونہ سے طلبہ کی رہنمائی کرنی پڑتی ہے۔ جس میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ آپ کے کسی قول و فعل سے ان کے دلوں پر کوئی بُرا نقش نہ بیٹھے اور آپ کے کسی قابل اعتراض لب و لہجہ۔ چال ڈھال حرکات سکنات سے جس کی نقل اتارنا اُن کا فطری خاصہ ہے۔ اُن پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ اکثر شکایات سُنی جاتی ہے کہ بعض مدرسین صرف اتنا کام کر لینا کافی سمجھتے ہیں کہ گرفت سے بچے رہیں اور اُن کو اُن کی سالم ماہانہ تنخواہ کے ملنے میں رکاوٹ نہ ہو یہ طرز عمل نہایت نازیبا ہے۔ جس قدر جلد ایسی شکایتوں کا دفعیہ اور ازالہ ہو جائے بہتر ہے۔ ہم کو اپنے اس شریف پیشہ کی لاج رکھنا چاہیئے۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قسم کا غیر ذمہ دار مزدور نہ سمجھیں بلکہ یہ خیال کریں کہ وہ بنی نوع انسان کے حقیقی خادم اور ہمدرد ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے محنت و ایثار ان کے دو نہایت اہم صفات ہیں ان کو جوش و سرگرمی کے ساتھ نہ صرف اپنے مفوضہ کار تعلیمی کو انجام دینا چاہیئے بلکہ طلبہ کے جسمانی و اخلاقی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی ان کو اپنے سر لینا چاہیئے ورنہ ان امور کی کمی کی صورت میں ہمارے ملک کی تعلیم کا مستقبل کبھی اُمید افزا نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسی خامیوں کا دور کرنا اور مدرسین میں جوش اور سرگرمی کی روح پھونکنا ہی ایسی انجمنوں اور کانفرنسوں کا خاص مقصد ہے۔

معزز حضرات!

اب میں کانفرنس ہذا کے بعض دوسرے اغراض و مقاصد اور کارروائیوں پر مختصر تبصرہ کرکے اپنی تقریر کو ختم کر دوں گا۔

انجمن ہذا کی پہلی دو کانفرنسوں نے مسائل فن تعلیم کو نظر انداز کر دیا تھا اس لئے تیسری کانفرنس منعقدہ امرداد ۱۳۳۸ف سے ایسے مسائل کو بھی جن کا تعلق تعلیم کے فنی پہلو سے ہے بہ نظر افادہ شریک پروگرام کیا گیا۔ اس امر کی تکمیل کے لئے یہ ضروری خیال کیا گیا۔ کہ ایسی سب کمیٹیوں کا جن کا تعلق خالصتاً فن تعلیم کے مسائل سے ہو تقرر کیا جائے چنانچہ ہر سال ان کمیٹیوں نے اپنے متعدد اجلاس منعقد کئے اور اب سال بسال ان کی سعی و کوشش کے نتائج غور و خوض کے لئے مختصر رپورٹوں کی شکل میں آپ کے روبرو پیش کئے جانے والے ہیں یہ حیدرآباد کی پہلی کانفرنس ہے جس میں مختلف مضامین نصاب اور تعلیم کے متعلق مدرسین کے نکتہ نظر سے رپورٹیں پیش کی گئیں ان کمیٹیوں کے جملہ ارکان ایسے مدرسین منتخب ہوئے ہیں جو سب کمیٹی کے مفوضہ مضمون سے دلچسپی و عملی تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح سے یہ کمیٹیاں طبقہ مدرسین کی حقیقی ترجمان ہوتی ہیں۔ رپورٹیں بے حد غور و خوص کے بعد مرتب ہوتی ہیں جن کی سفارشیں عملی پہلوں سے تعلق رکھتی ہیں اور مدرسین کے دشواریوں اور ضرورتوں اور خیالات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ سال گذشتہ تعلیم انگریزی۔ تعلیم ریاضی پیشہ ورانہ تعلیم۔ تعلیم اُردو اور تعلیم جسمانی کی رپورٹیں سنائی گئیں اور سال پیوستہ صرف تعلیم جغرافیہ۔ تعلیم تاریخ کے دو سب کمیٹیوں کی رپورٹیں سُنائی گئیں سال حال کے لئے بھی تعلیم سائنس و تعلیم ڈرائنگ اور مدارس میں اخلاقی تعلیم کے مضامین کا اعلان کیا گیا تھا۔ مگر صرف تعلیم سائنس و مدارس میں اخلاقی تعلیم کے دو رپورٹیں مکمل ہو سکیں جو علحدہ آپ حضرات کے سامنے پیش ہونگی ۔

معزز حضرات!

کانفرنس ہذا میں علاوہ ضروری مسائل فن تعلیم کی رپورٹوں اور مفید لکچروں کے ہر سال چند ضروری تحریکات پیش ہوتی ہیں اور کافی غور و بحث کے بعد منظور یا نامنظور کی جاتی ہیں جو تحریکات منظور ہوتی ہیں ان کو صرف احاطہ کانفرنس تک ہی محدود رکھا نہیں جاتا بلکہ دوران سال میں برابر اس کی نسبت ارباب مقتدر اور دفاتر متعلقہ کو توجہ دلائی جاتی رہتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس ہذا کے ساعی بیکار اور صدا بصحرا کا مصداق نہیں

بن رہی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر تحریکات بارآور ہو رہی ہیں۔

آپ حضرات سے رخصت ہونے سے پیشتر میں اپنے ہم پیشہ مدرسین سے یہ کہہ دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس دور ترقی میں جب کہ مدارس میں ضروریات زمانہ کے مطابق جدید مضامین نصاب کی بھرمار ہے اور نئی نئی ایجادات کی معلومات لازمی ہے۔ تو جدید معلومات کے ہمراہ جب تک ہم بھی دنیا کے ساتھ قدم بقدم نہ چلیں ہمارا اس سفر میں پیچھے رہنا اور ترقی کی برکات سے محروم رہنا لازمی ہے۔ ہماری اور ہمارے ملک کی کامیابی و ترقی اسی وقت یقینی ہوگی۔ جب کہ ہم لوگ محنت، باہمی ہمدردی اور اشتراک عمل اور ایثار کو اپنا نصب العمل بنا دیں۔ اپنی ہستیاں درس و تدریس کے لئے وقف کر دیں اور اپنی محنت و انہماک سے اپنی درس گاہوں کو موقر و ممتاز بنائیں۔ معلمین پر لازم ہے کہ تعلیم میں اپنے اپنے متعلقہ مضامین کی تیاری اور دوسرے مضامین سے ان کے ارتباط میں انتہائی کوشش اور دلچسپی سے کام لیں ورنہ ان اوصاف کے بغیر کامیابی کی اُمید رکھنا فضول ہے۔

اس امید کے ساتھ ان تمام معاملات اور کانفرنس کے جملہ کارروائیوں کو ہمارے قابل و محترم صدر سے فاضلانہ رہبری حاصل ہوگی۔ میں آپ حاضرین کی سمع خراشی کی معافی کا طلبگار ہو کر آپ حضرات اور جناب صدر ممدوح کا نہایت فراخ دلی سے مکرر خیر مقدم کرتا ہوں۔

خطبۂ صدارت حیدرآباد ٹیچرز کانفرنس

منعقدہ ۲ جولائی ۱۹۳۱ء

از

(عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر)

معزز حاضرین!

اظہار تشکر میں اس کو اپنے لئے باعث عزت خیال کرتا ہوں کہ مجھے ایک ایسی انجمن کا صدر نشین بنایا گیا ہے جس کے اراکین نے اُن لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے جو اس ملک میں خزینۂ علم انسانی کے محافظ بننے والے ہیں اور اس ملک کے خیالات و تمدن کے آیندہ رہبر و لیڈر ہونے والے ہیں۔

میرے مدرس دوستو! میں آپ کے پیشے کے متعلق اُن بہت سے فنی امور پر کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا جن کے متعلق رائے قایم کرنے کے آپ ہی اصحاب بہترین اہل ہو سکتے ہیں اور جن کی بابتہ آپ اس کانفرنس میں تحریکات پیش فرمائینگے لیکن آپ غالباً اُن والدین اور ان اہل ملک کے خیالات معلوم کرنا پسند کرینگے جن کے بچوں کو آپ تعلیم دے رہے ہیں۔ اور جو اس بات سے خوب واقف ہیں کہ آپ کی محنت کا ثمرہ کس قدر شیریں رہا ہے اور کس قدر تلخ۔

اس خطبہ میں جو کچھ میں کہوں گا وہ بحیثیت والدین یا اہل ملک یا غیر ماہر فن عرض کرونگا۔ یہ تو میں بتا سکوں گا کہ درد کس مقام پر ہو رہا ہے لیکن علاج بتلانے سے قاصر ہوں۔ اس وقت جو اظہار خیال کا موقع مجھے عطا فرمایا گیا ہے اس پر میں اسوسی ایشن کا شکر گزار ہوں۔

ثانوی جماعتوں کے اصول تعلیم میں حقیقی تبدیلی کی ضرورت ہے تعلیم کے تین مدارج ہیں۔ ابتدائی۔ ثانوی اور اعلیٰ۔ اس وقت صرف ثانوی کے متعلق میں کچھ عرض کرتا ہوں تخمیناً چھ سال گزرے مجھے حیدرآباد کی ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی عزت بخشی گئی تھی۔ اُس وقت میں نے اس بات پر بہت زور دیا تھا کہ ہمارے ملک کی ضروریات کے لحاظ سے جو اصول تعلیم موزوں ہو اس کو معین و مشخص کر دینے کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے اس وقت یہ بھی بتلایا تھا کہ موجودہ طریقۂ تعلیم کس طرح رائج ہوا اور اپنا اصلی مقصد

پورا کرنے کے بعد بھی کس طرح اب تک زندہ ہے۔ میں ان تمام باتوں کو اس وقت نہیں دُہرانا چاہتا لیکن اس مضمون کی اہمیت کے اعتبار سے وہی خیالات کا اعادہ ایک جداگانہ پیرایہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اُن کوششوں کو جو سرکار اشاعت تعلیم کے لئے کر رہی ہے اُن کی اہمیت کو کم کرنا ہرگز ہرگز میرا مقصود نہیں۔ گذشتہ ۱۵ سال میں سررشتہ تعلیمات کا خرچ چند لاکھ سے بڑھتے بڑھتے اسی لاکھ تک پہونچ گیا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن اگر میں اُن خیالات کا اظہار کروں جن کا مجھ کو یقین ہے تو معاف فرمایئے گا۔ موجودہ طریقۂ تعلیم مفید اور کماؤ افراد قوم کی تعداد میں خرچ کی مناسبت کے ساتھ اضافہ کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ہم ابھی تک تعلیم کے متعلق کوئی ایسی مستحکم پالسی قرار دے کر اس پر کاربند نہ ہو سکے جو زمانہ موجودہ کی ضروریات کے لئے مفید ہوتی۔ ہم کو خاص قسم کے ثانوی مدارس میراث میں ملے ہیں اور اسی قسم کے مدرسوں میں ہم اور اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ گزشتہ چند سال میں ہمارے ہاں کے صرف مدارس وسطانیہ و فوقانیہ کی تعداد (۱۰۹) سے (۱۵۵) ہو گئی ہے۔ اور ان مدرسوں کے طلبہ کی تعداد بڑھتے بڑھتے (۲۵) ہزار سے (۴۱) ہزار تک پہونچ گئی ہے۔ لیکن ان مدارس کی نوعیت تعلیم میں کوئی بین تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جو تعلیم فوقانیہ اس وقت تک رائج رہی ہے اُس میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی کی ایک کرن بھی بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ بقول شخصے علم شئے بہ از جہل شئے۔ لیکن فکر معیشت جو آج دنیا میں سب کے دامن گیر ہے۔ ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم ذرا ٹھیریں اور غور کریں کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری ثانوی تعلیم کا طریقہ بالکل بدل دیا جائے۔ اب حالت یہ ہے کہ بحیثیت ایک باپ کے میں سوچتا ہوں کہ میرے لڑکے نے میرا بوجھ کہاں تک ہلکا کر دیا۔ ایک ٹیکس دہندہ کی حیثیت سے میں غور کرتا ہوں کہ مدرسوں کے روز افزوں طلبہ نے ہمارے ملک کی دولت میں کس حد تک اضافہ کر دیا۔ اور ایک کاشتکار جس کا لڑکا سرکاری مدرسے میں پڑھ رہا ہے۔ وہ اس فکر میں پڑ گیا ہے کہ اُس کے لڑکے کو جس ڈھنگ کی تعلیم دی جا رہی ہے اس سے خاندان کو یا اُس کے پیشہ زراعت کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ غرض کہ بحیثیت اہل ملک۔ بہ حیثیت والدین اور بہ حیثیت ایک کاروباری آدمی کے اسی قسم کے سوالات ہمارے دلوں میں آ رہے ہیں۔ اور ان کا جواب اطمینان بخش نہیں ملتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ملازمت کے بارے میں بہ حیثیت ایک عہدہ دار کے جن اشخاص کو مجھے مایوس کرنا پڑتا ہے۔ اُن کی تعداد سال بہ سال بڑھتی جا رہی ہے۔ جن تنخواہوں پر نوکری کرنے کے لئے

بعض میٹرک اور ایف۔ اے پاس رضامند ہو جاتے ہیں اُن سے زیادہ تنخواہیں ہمارے باورچی اور خدمت گار پا رہے ہیں۔ بہت سے مدبرین ملک کہتے ہیں کہ برٹش انڈیا کی موجودہ بے چینی اور شورش کے اسباب کے منجملہ نصف اسباب معاشیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ ثانوی جماعتوں کے تعلیم یافتہ اشخاص کے زبردست گروہ نے بیکاروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے تو اس لحاظ سے گورنمنٹ کے لئے یہ مسئلہ اور بھی قابل توجہ ہو جاتا ہے کہ اُن طلبہ نے کس حد تک ملک کی قوت میں اضافہ کیا ہے اور جو روپیہ اُن پر صرف ہوا وہ بہ اعتبار نتائج کہاں تک جائز تھا۔

اس امر کے ثابت کرنے کے لئے زبردست شہادت موجود ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہمارے ثانوی مدارس کا عام طریقہ تعلیم بے حد بدلنے کے قابل ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ اس میں پیشہ کی تعلیم کے عنصر کا اضافہ کیا جائے۔ ان امور میں ہم کو جرمنی سے ڈنمارک سے اور دیگر متمدنہ ممالک یورپ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جو بات اب مسلمہ ہو گئی ہے اُس کو میں ضرورت سے زیادہ دُھرانا نہیں چاہتا۔ میں ان کوششوں سے بھی ناواقف نہیں ہوں جو موجودہ ناظم صاحب تعلیمات اس بارے میں فرما رہے ہیں۔ آپ کی ایک کانفرنس نے تعلیم پیشہ وری کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر کی تھی اور اس نے ایک مفید رپورٹ مرتب کی ہے۔ لیکن پیشہ وری تعلیم کی تائید میں کوئی مستقل پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے رفتار ترقی جیسی کہ چاہیئے تھی ہنوز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی رقمی گنجایش لامحدود نہیں ہے۔ سرکار موجودہ طریقہ کے مدارس کو پہلو بہ پہلو اُن مدارس کے قایم نہ رکھ سکے گی جن میں دولت پیدا کرنے والے افراد جدید پالیسی کے تحت تیار کئے جائیں گے۔ اُس وقت بعض قدیم نہروں کو جن میں پبلک کا روپیہ چلا جا رہا ہے سُکھا دینا پڑے گا اور نئی نہریں کھودنی پڑیں گی۔ توسیع تعلیم کا کام ملتوی کر دینا پڑے گا۔ اور موجودہ تعلیم گاہوں کو خاص طریقہ پر مستحکم کرنے کا کام شروع کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ ہم کو چند ایسے ایف۔ اے کی جماعتوں کو بند کرنا پڑے جو حال میں چند ثانوی مدارس کے ساتھ اضافہ کر دی گئی ہیں وہ اس لئے نہیں کہ بے کار ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ جو نفع اُن سے حاصل ہوتا ہے وہ اُن کے اخراجات کے مقابلے میں بہت گھٹا ہوا ہے۔ وہی روپیہ جدید پالیسی کے تحت زیادہ فائدہ بخش کام میں لگایا جا سکے گا۔ جب ایک مرتبہ جدید پالیسی اختیار کر لی جائے گی تو پھر آیندہ ہر اسکیم اور ہر تعلیمی جدید امداد کا توازن جدید

پالیسی کے معیار ہی پر کیا جائے گا۔ اگر ہم موجودہ طریقہ تعلیم کو قائم رکھیں جو سال کے سال بے کاروں کی تعداد بڑھا رہا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیں گے جس سے ہمارے ملک کو جلد یا بدیر دوچار ہونا ہے۔ جیسا کہ زمانہ کے علامات و قرائن سے ظاہر ہے۔ اس جدید تعلیمی پالیسی سے کسی شورش کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل ملک اس تبدیلی کا خیر مقدم کریں گے۔ موجودہ اسکول بند نہیں کئے جائیں گے۔ بلکہ اُن کی اصلاح کردی جائے گی۔ اس ترکیب سے ہم اُن دروازوں کو بند کردیں گے جو فضا کو مکدر کر رہے ہیں اور اُن کی جگہ ایسے روشن دان کھول دیں گے جن میں سے تازہ اور خوش گوار ہوا داخل ہو۔ اگر گورنمنٹ کا رجحان اس پالیسی کو مناسب طریقے سے نافذ کرنے کا ہو تو میں عرض کروں گا کہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سرگرم ماہرینِ فن کی ایک کمیٹی حتی الامکان جلد مقرر فرمائی جائے۔

مدرسین کو فن تعلیم کے دوش بدوش رہنا چاہئے گزشتہ پچاس سال میں بہت سے فنون نے باقاعدہ علمی شکل اختیار کرلی ہے۔ منجملہ ان کے فن تعلیم بھی ہے۔ میرا تعلق قانون پیشہ طبقہ سے ہے۔ اور یہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں ہر وقت اپنے تئیں قوانین نافذہ و نظائر عدالت ہائے عالیہ سے باخبر نہ رکھوں گا تو میرا کام ناقص ہو جائے گا اور میں اپنے فرائض باحسن الوجوہ انجام نہ دے سکوں گا اور یہی حالت ہر پیشے کی ہے۔ تعلیم کے طریقوں میں بھی بہت سے تغیرات ہو گئے ہیں اور روز بروز ہوتے جارہے ہیں اور بجائے زجر و توبیخ کے اب ترغیب و تشویق اصول تعلیم قرار پائے ہیں۔ چوں کہ حواس ظاہری کے ذریعہ سے دل و دماغ و ادراک پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ لہذا انہیں حواس کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ آج کل بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ اس کو کیوں کر عمل میں لائیں۔ یہ اُستاد کی قابلیت پر منحصر ہے۔ جس طرح جسم کے ظاہری امراض کے اطبا کے لئے ضرورت ہے کہ کسی بیماری کا نسخہ تجویز کرنے سے قبل وہ تمام اعضاء و جوارح کا کامل علم حاصل کرلیں۔ اسی طرح جسم کے باطنی اعضاء یعنی دل و دماغ کے کل پرزوں کے لئے بھی جو ہمارے جسم پر حکمراں ہیں اور جو بہت نازک و پیچیدہ ہیں اس علم کے جاننے کی بڑی ضرورت ہے۔ جس میں اُن کا نظام قائم رکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں۔ میری رائے میں کسی مدرس کو کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے نہ صرف علم اجسام انسانی و علم نفسیات

(فزی آلوجی وسائکولوجی) کے جاننے کی ضرورت ہے بلکہ اس کو فن تعلیم وتربیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ رہنا چاہئے۔ اس فن تعلیم کی ترقی انسان کے باطنی قویٰ کے علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ جاری ہے مگر عموماً مدرسین کی یہ حالت ہے کہ اُن کو اتنی استطاعت نہیں کہ فن تعلیم کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں اور جتنے رسالہ جات اس وقت جاری ہیں اُن کو فراہم کرسکیں۔ عموماً مدرسین کے فرائض مفوضہ کے نوعیت کے مقابلے میں ان کا معاوضہ کم ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کی کانفرنس تجدید کنندہ معلومات کا ایک نصاب تعلیم تجویز کرنے والی ہے۔ جو بلاشک حصول مقصد کے لئے بہترین تدبیر ہوگی۔ میں اتنا اور کہوں گا کہ گورنمنٹ اس کانفرنس کو ایک اچھا کتب خانہ مہیا فرمادے۔ جو خصوصاً فن تعلیم کی کتابوں اور رسالوں پر مشتمل ہو۔ اور ان کا مطالعہ بہ ذریعہ گشت ممبران کانفرنس کرسکیں۔ اس مقصد کے لئے جو رقم منظورہ ہے وہ ناکافی ہے۔ اس کے سوا سالانہ دو انعام بھی مقرر کئے جائیں یعنی ایک انعام ہزار روپیہ کا اور دوسرا پانسو کا۔ یہ انعامات ممبران کانفرنس میں سے اُن کو دئے جایا کریں۔ جو تعلیم پر سب سے بہتر کوئی رسالہ لکھیں میرے خیال میں اس سے فن تعلیم کو بہت تقویت پہونچے گی۔

جسمانی نشو ونما جب سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ علم اجسام ونفسیات کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ بغیر جسمانی نشو ونما کے دماغ کی باقاعدہ ارتقاء غیر ممکن ہے۔ اس کی اہمیت تسلیم کرنے میں ہماری ریاست دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہے یہاں یورپ کا کامیاب شدہ ایک اُستاد اس شعبہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور طلبہ کی جسمانی ترقی کی دیکھ بھال کے لئے مختلف طور سے کوشش کی جارہی ہے۔ اسکوٹ کی تحریک کو بارآور کرنے کے لئے بھی ہر ممکن طریقہ سے ترغیب دی جارہی ہے۔ بہرحال اس بارے میں دو امور کی جانب میں آپ کی توجہ معطوف کرتا ہوں۔ اول یہ کہ امتحانات میں لڑکوں کی جسمانی حالت کے لحاظ سے کچھ نمبر دئے جایا کریں مثلاً ایک رجسٹر حاضری رکھا جائے جس میں کھیل اور ورزش میں شریک ہونے والوں کی حاضری غیر حاضری درج ہوا کرے یا کوئی اور تدبیر ایسی اختیار کی جائے جس سے لڑکوں کی جسمانی ترقی کا اندازہ علیٰ قدر مراتب ہوسکے اور اس کے لئے کچھ نمبر فیصدی حاصل کرنا لازم کردیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مضمون میں کامیابی کے واسطے خواہ کتنے ہی کم نمبر کیوں نہ رکھے جائیں تب بھی اس ترکیب سے جسمانی نشو ونما پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اگرچہ اس میں مجھے کچھ عملی مشکلات بھی نظر آتی ہیں لیکن وہ ایسی نہیں ہیں جو حل نہ ہوسکیں۔ دوسرے یہ کہ سرکاری اور امدادی دونوں قسموں کے مدرسوں میں طلبہ کا معاینہ

طبی لازم قرار دے دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی عملی طریقہ نقائص کے رفع کرنے کا بھی اختیار کیا جائے۔ ہمارے طلبہ کی عام صحت گویا ایک قومی سرمایہ ہے۔ اس خزانے کی حفاظت یا اُس کو کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنے کا کون ذمہ وار ہے۔ جس طرح ایک باپ اپنے لڑکے کی دماغی اور جسمانی نشوونما کو نظرانداز کر کے اپنی غلطی کی سزا بڑھاپے میں پاتا ہے اسی طرح ایک ملک بھی من حیثیت المجموع اپنے افراد کی دماغی اور جسمانی کمزوریوں کا دفعیہ نہ کرنے کا خمیازہ جلد یا بدیر بہرحال اٹھاتا ہے۔ تاریخیں شاہد ہیں کہ قانون معاشرت انسانی کے تحت اس غفلت کے پاداش میں قوموں کی قومیں نیست و نابود کر دی گئی ہیں۔ کسی ملک کے بچوں اور طالب علموں کی صحت اور تندرستی اس ملک کا بہترین سرمایہ ہے۔ مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے حال ہی میں ایک بیش بہا کتاب زبان اردو میں تالیف فرمائی ہے۔ اس کا عنوان "ڈنمارک اور اس کا طریقِ تعلیم" ہے۔ یہ کتاب جعفری صاحب ممدوح کے عینی مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ڈنمارک میں طلبائے مدارس کے طبی معائنہ پر کس قدر زور دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کی صحت سے اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا کہ سلطنت کو اپنی رعایا کی صحت سے ہے۔ اس قسم کے امور میں والدین اور سلطنت کے علی الترتیب خواہ کچھ ہی فرائض ہوں مگر ایک بات بالکل صاف ہے۔ وہ یہ کہ والدین چند برس میں مر جاتے ہیں اور ان تمام تکالیف سے نجات پا جاتے ہیں جو ان کی اولاد کی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر سلطنت قائم رہتی ہے اور ان لوگوں کی جسمانی کمزوریوں کی وجہ سے جو اس کی دولت کا سرچشمہ ہوتے ہیں وہ پشت ہا پشت تک مصیبتیں اُٹھاتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے یہاں بھی معائنۂ طبی کا مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے۔ اُمید ہے کہ اس پر ضرور لحاظ فرمایا جائے گا۔ میں آخر میں یہ کہوں گا کہ اگر اُستاد یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے شاگرد اسپورٹس میں دلچسپی لیں تو اُس میں اُن کو بھی اس سے بڑھ کر حصہ لینا چاہیئے جتنا کہ وہ اب تک لیتے رہے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ہر اُستاد کھیل کے میدان میں روزآنہ موجود رہیگا۔ آپ چاہے اس قاعدہ کو غیر معمولی یا ضرورت سے زائد سخت کہیں مگر آج ہمارے ملک کے افراد ارتقاء کی بہت نازک مدارج طے کر رہے ہیں۔ ہم رفتار ترقی بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب کسی انتظار کا موقع نہیں ہے۔ غیر معمولی کمی کو پورا کرنے کے لئے غیر معمولی کوشش ہی درکار ہوتی ہے۔ ترکی نے تعلیم کے بارے میں جو کچھ تدبیریں شروع کی ہیں اس سے میرا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ اُستادوں کے اعضاء و جوارح بھی قانون ورزش جسمانی کے اس طرح تابع ہیں جیسے کہ طالب علموں کے قویٰ۔ زیادہ دلچسپی پیدا کرانے کے لئے ہم اُستادوں کے تقرر کے وقت کھیل میں انکار دلچسپی لینا ایک لازمی شرط قرار دے سکتے ہیں۔ مجھے شبہ نہیں ہے کہ اسپورٹس میں جتنی زائد دلچسپی استاد لیں گے اتنی ہی ترقی اُن کے شاگردوں کے شوق میں ہوگی۔

اساتذہ وطلبہ کے والدین میں تعاون و اتحاد

بحیثیت ایک باپ کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اساتذہ وطلبہ کے والدین میں اتحاد و تعاون ہو مجھے اُمید ہے کہ طلبہ کے سرپرست میرے اس خیال کو پسند کریں گے۔
اگر یہ ممکن ہو تو ہر دو مہینے کے بعد کوئی ایک دن ایسا مقرر کیا جائے جس میں طلبہ کے سرپرست اور مدرسے کے اساتذہ باہم مل کر بچوں کی تعلیم کی نسبت ضروری امور پر تبادلہ خیالات کیا کریں۔ اپنے بچے کے ضعیف اور قوی پہلوؤں سے واقف ہونے کے علاوہ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ایک سمجھدار اور دوراندیش سرپرست اُستاد سے معلومات حاصل کر کے کوئی صحیح رائے قایم کر سکے گا کہ اُسے اپنے بچے کو بلحاظ قابلیت رجحان اور صلاحیت کے کونسا پیشہ اختیار کرانا چاہیئے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق سرپرست بطور خود کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس بارے میں بہت سی غلطیاں ہمارے بچوں کی زندگی تباہ کرنے کا باعث ہوئی ہیں۔ اور بہت مرتبہ ایک گول سوراخ میں چوکھونٹی کیل ٹھونکنے کی کوشش کی گئی ہے وقتِ ضرورت استاد کسی لڑکے کے والدین کے دل میں یہ خیال بٹھادیں گے کہ اس بارے میں وہ اپنے بچے کی ابتدائی زندگی کی نوبت پر کوئی قطعی رائے قایم کرلیں کہ انہیں اپنے بچے کو کونسا کام سکھانا چاہیئے ہر اُستاد کے پاس رازمیں ایک نوٹ بک بھی رہنی چاہیئے جس میں اپنے طلبہ کی رفتار وروش اور چال چلن وغیرہ کے متعلق وہ اپنے مشاہدات کے نتائج کو درج کرتا رہے۔ اس سے بہت سی دوسری باتوں میں بھی مدد ملے گی۔ اگر استادوں اور سرپرستوں کے ایک جگہ جمع کرنے کے اصول کو سرکار منظور فرمائے تو میرے خیال میں اس سے کوئی ایسی اسکیم مرتب ہو سکے گی جس میں طرفین کی بھلائی مضمر ہو۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ لڑکا برسوں تک مدرسے میں پڑھتا رہتا ہے اس کی طالب علمانہ زندگی ختم بھی ہو جاتی ہے مگر اُس کے باپ کو کبھی یہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ہوتا کہ اُس کے لڑکے کو کون تعلیم و تربیت کر رہا ہے۔ بہرحال استادوں اور سرپرستوں کے درمیان روابط پیدا کرنے کے لئے ہم کو کچھ عملی قدم بڑھانے چاہیئے۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسا دشوار امر نہیں ہے۔

تہذیب اخلاق

ہمارے طلبہ کی تہذیب اخلاق کا مسئلہ اس وقت تمام اہل علم اور ہندوستان کے بہی خواہوں کی توجہ اپنی طرف معطوف کرا رہا ہے۔ اور ہر شخص اس پر متفق ہے کہ ہمارا موجودہ طریقہ تعلیم ہم کو تہذیب اخلاق میں اُس قدر مدد نہیں دے رہا ہے۔ جتنی اس سے توقع تھی۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ اسپورٹس کھیل اور اسکوٹ کی تحریک مذکورہ بالا مقصد کی تکمیل میں بڑی حد تک امداد کر سکتی ہے۔ اور ان تحریکات کو ہر قسم کی تقویت دینی چاہیئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ

بچوں کے گھر کے اثرات کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے مگر میں فی الحال تہذیب اخلاق کے صرف اسی جزو کی نسبت بحث کروں گا جس کا تعلق کلاس کے اندر اور کلاس کے باہر استاد کی ذات سے ہے۔ دینیات واخلاقیات کی تعلیم خواہ فہرست نصاب میں شریک ہو یا نہ ہو لیکن اگر کوئی اُستاد اخلاق کے کچھ اصول وقواعد اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرنا چاہے تو اُس کے لئے اس کو بے شمار موقعے مل سکتے ہیں کھیل کے میدان میں وہ سکھا سکتا ہے کہ خودداری کے ساتھ نرم و تواضع وانکساری کس طرح کام میں لائی جا سکتی ہے۔ جو لوگ کھیل میں اپنے حریف کو شکست فاش دیتے ہیں اُن کی عزت کس طرح کی جاتی ہے۔ بلا لحاظ قوم و مذہب کسی شخص سے محض اس کے عمدہ صفات کی وجہ سے کس طرح محبت کی جاتی ہے۔ جماعت کے کمرے میں جب وہ کوئی ایسا سبق پڑھا رہا ہو جس کا مقصود کوئی خاص اخلاقی اصول سکھانا ہے تو وہ اُس کے سمجھانے میں چند منٹ صرف کر کے اچھی طرح اُس کی تشریح و توضیح کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ حق اور سچائی کا بیان ہے۔ استاد ایک منٹ کے لئے کتاب بند کر کے موقع و محل کے لحاظ سے اس کے متعلق خود کچھ بیان کر سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس بات کی تشریح کرنے میں کہ حق کیا چیز ہے۔ کس طرح انسان کے ہر خیال میں حق سرایت کرتا ہے۔ حق کی کیا خوبیاں ہیں۔ حق کس طرح انسانی اخلاق کو سانچے میں ڈھالتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ایک اچھا اُستاد اپنی کلاس کو چند منٹ کے لئے محو کر سکتا ہے۔ ایک اچھا اُستاد اپنے شاگردوں ہی کے اہل وطن میں سے کسی کی بہادری کے کارنامے بیان کر کے اُن کو تھوڑی دیر کے لئے مسخر کر سکتا ہے۔

اس وقت میں اپنی حد سے آگے بڑھا جا رہا ہوں! اور اس کوچے کا ذکر کر رہا ہوں جس سے میں نابلد ہوں۔ یعنی تھوڑی دیر کے لئے میں استادوں کا استاد بننا چاہتا ہوں۔ لیکن میں بحیثیت ایک عام شخص کے جو فن سے ناواقف ہو وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم کے طریقہ سے تہذیب اخلاق میں بہت کچھ فرق پڑ جایا کرتا ہے۔ اُستاد اُستاد میں بھی بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک اُستاد ہے کلاس میں آتا ہے۔ کتاب کھولتا ہے اور صرف اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ کسی جملے کے ان الفاظ و فقرات کے معنی اپنے شاگردوں کو سمجھا دے جو اُن کی سمجھ میں نہ آتے ہوں۔ اُس کو اُس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سبق کا کیا اثر طلبہ کے اخلاق پر مرتب ہوا۔ برخلاف اس کے ایک دوسرا استاد ہے جو سبق کے منشاء و مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ سمجھانے میں جان لڑا دیتا ہے اور زندگی کے اعلیٰ صفات کو اپنی آواز، حرکات، سکنات اور قوت بیانیہ کے زور سے شاگردوں کے دلوں پر نقش کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک اُستاد چند سکنڈ میں ایک سوتے ہوئے لڑکے کو بغیر اسے چھوئے ہوئے

جگا سکتا ہے اور ایک لڑکے کے ہنسوڑ چہرے کو اپنے طریقہ تعلیم سے سنجیدگی و متانت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ بہت سے وکیلوں کے بھونڈے طرز بیان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جج اجلاس پر اونگھنے لگتا ہے۔ برخلاف اس کے کسی وکیل کے پر لطف طرز اور جوشیلے لہجہ سے بہت سے سوتے ہوئے جج جاگ اُٹھتے ہیں۔ مہینوں میں بلکہ روز آنہ اُستاد بتدریج اپنے شاگردوں کے دل و دماغ میں گھر کرتا جاتا ہے اور چپکے چپکے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شاگرد میں بہت سے ایسے اوصاف کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ جن پر اثر ڈالنے کا تہیہ اُستاد نے کر لیا تھا۔ ایک اچھا اُستاد شاذونادر ہی اپنے شاگردوں کے قلوب پر اپنے اخلاق کا گہرا اثر چھوڑنے میں ناکام ہوتا ہے۔ اگر آپ اُستادوں کے اخلاق کا معیار اونچا کر دیں گے تو شاگردوں کا اخلاق خود بہ خود بڑھ جائے گا۔ اگر اُستاد کے اخلاق میں کمی آئی تو لڑکوں کا اخلاق تحت الثریٰ کو پہونچ جائے گا۔ میرے خیال میں ہمارے طلبہ کے اخلاق کی تہذیب کا سوال ایسا سوال ہے جو ہمارے اساتذہ کی ٹریننگ اور قابلیت کے سوال سے تعلق رکھتا ہے۔

مدرسین کا وقار بڑھانا چاہئے معلمی کا پیشہ دُنیا میں ایک شریف ترین پیشہ ہے لیکن روپیہ پیدا کرنے کے نقطہ نظر سے زیادہ زرخیز نہیں ہے۔ مدرس بھی انسان ہے۔ گھر بار رکھتا ہے۔ اور اس دنیا کی افکار و مصائب کا اُس کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اگلے زمانے میں شاگرد و استاد یا گرو کا رشتہ ایسا مقدس رشتہ تھا جس کا درجہ باپ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایک اعتبار سے اُستاد اپنے شاگرد کا مالک و آقا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل صحیح ہو یا غلط۔ صورت بدل گئی ہے اور اُستاد کا وہ وقار باقی نہیں رہا۔ تاہم معلمی کا پیشہ ایسا ترغیب دہ ہونا چاہیے کہ ہمارے بہترین افراد اس طرف رجوع ہو سکیں۔ چونکہ اس پیشہ میں روپیہ زیادہ نہیں ملتا اس لئے میں اس تجویز سے بالکل متفق ہوں کہ مدرس کے بچوں کے لئے تعلیم میں خاص خاص سہولتیں ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے پراویڈنٹ فنڈ کھول دینا چاہئے اور ہر طرح کی رعایت اس کے ساتھ ملحوظ رکھنی چاہئے۔ تاکہ وہ حتی الامکان دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکے۔ اگر عطائے خطابات سے کسی کی خدمات کا اعتراف مقصود ہے یا اگر دربار اور سرکاری تقاریب میں مقام نشست سوسائٹی میں کوئی خاص امتیاز پیدا کر دیتا ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ سررشتہ تعلیمات کے بہترین افراد کی خدمات کا اعتراف بھی اسی طریقے سے کیوں نہ ہو۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ اگر ممکن ہو تو تعلیم کے بارے میں اُن کو اس سے بڑھ کر آزادی اور اختیارات دینے چاہئیں۔ جتنے کہ اُن کو اب

حاصل ہیں۔ غرض کہ مدرسین کا وقار بڑھانے کے لیے بہت گنجائش ہے۔ مدرسین کو بھی اپنے پیشے کی نسبت وہی بلند اور شریفانہ خیال رکھنا چاہئے جو ہمیشہ سے ہندوستان میں مشہور چلا آرہا ہے وہ یہ کہ تعلیم دینا نیکی و انسانی ہمدردی کا ایک کام ہے نہ کہ کسب معیشت کا ذریعہ اگلے لوگ معلمی پر فخر کیا کرتے تھے۔ جب تک ایک مدرس کے دل میں اس قسم کے پاکیزہ خیالات اور جذبات موجزن نہ ہوں وہ اپنا کام اچھی طرح نہیں کرسکتا۔

تعلیم نسواں قومی نقطۂ نظر سے آج کل کوئی شخص تعلیم نسواں کی قدر و قیمت کا منکر نہیں ہے۔ بے پڑھی لڑکیاں بہ نسبت خواندہ لڑکوں کے قوم پر زیادہ بار خاطر ہوتی ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کا سوال دراصل نصف بنی نوع انسان کی تعلیم کا سوال ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ معاشیات کا بھی مسئلہ ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے بغیر ہم اُن کے قوائے ذہنی و عقلی کے فوائد سے محروم ہیں۔ ان کو اگر باقاعدہ طور پر چلا دیا جاوے اور کام میں لایا جائے تو ہماری دولت اور ذرائع آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ اس ضمن میں ایک چیز ہے جس کی طرف میں نے ۱۹۲۵ء میں جب کہ میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا صدرنشین بنایا گیا تھا اشارہ کیا تھا اگر اُس کی اہمیت کے خیال سے اس کا اعادہ میں اس وقت بھی کردوں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ ہماری لڑکیوں کی تعلیم ان اصول پر نہ ہونی چاہئے جو ہمارے لڑکوں کی تعلیم کے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری لڑکیوں کے لیے کسی مدرسہ نسواں میں سینیر و جونیر کیمبرج کے نصاب کی تعلیم کیا کام آسکتی ہے۔ شاید پانچ فی صدی لڑکیوں کے لئے وہ مفید ہو تو ہو۔ ان پانچ کی خاطر ہم پچانوے فی صدی لڑکیوں کے حقیقی فائدے کا خون کر رہے ہیں۔ ہم کو لڑکیوں کے لئے تعلیم کا دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ مدارس نسواں کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں اصلی ضروریات کے لحاظ سے بہت کم تبدیلیاں ہوئیں میں یہاں اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ معاملہ بڑا اہم ہے۔ اور ان عہدہ داروں کی عاجلانہ توجہ کا محتاج ہے جو اس ریاست میں سر رشتہ تعلیم کے ذمہ دار ہیں۔ جہاں تک معلمات کا تعلق ہے میں صرف ایک ریمارک کرنا چاہتا ہوں۔ جو والدین کسب معیشت کے خیال سے اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اُن کو اپنی لڑکیوں کے لئے معلمی سے بڑھ کر کوئی مفید اور شریف پیشہ نہیں مل سکتا۔ بحیثیت مجموعی ہندوستانی تعلیم کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ لوگ اب ضروریات زمانہ کو زیادہ سمجھتے جا رہے ہیں۔ اگر ہمارا ملک دنیا کی ترقی یافتہ و مہذب اقوام

کی فہرست میں مناسب جگہ لینا چاہتا ہے تو اس پر تعلیم نسواں واجب ہے۔ روز بروز معلمات کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے اور جس تعداد میں یہ درکار ہیں ملک اتنی فراہم نہیں کر سکتا۔ وقت اب آ رہا ہے کہ ہماری معلمہ خواتین اپنے حسب منشا معاملات کو طے کرا سکیں گی جس قدر جلد ہماری ریاست کوئی موزوں طریقہ تعلیم نسواں اختیار کرے اور معلمات کے ذریعے سے لڑکیوں کے ٹریننگ کے لئے جماعتیں کھول دے اتنا ہی اچھا ہے۔

مدارس کی فہرست نصاب اس بات کے بیان کرنے میں کہ مدرسوں کے لئے مختلف نصابوں کی فہرست کس طرح مرتب کرنی چاہیئے۔ میں اپنی حد سے تجاوز کر کے آپ کے حدود میں داخل ہو رہا ہوں اور اس طرح گویا ان مضامین کے جاننے کا ادعا کر رہا ہوں جن کا میں ماہر نہیں ہوں لیکن مسئلہ تعلیم زمانہ گذشتہ میں بھی اکثر میرے دل میں جاگزیں رہ چکا ہے اس لئے اگر اس موضوع پر میں آپ کے سامنے اظہار خیال کروں تو مجھے معاف فرمائیے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جماعتوں کے واسطے فہرست نصاب مرتب کرنے میں ہم غلط ترتیب سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یعنی ہم گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے لگا رہے ہیں۔ میں عام طریقہ کا ذکر کر رہا ہوں اگر کہیں استثنائی صورت ہو تو اُس کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ہماری ریاست میں ہی نہیں بلکہ برٹش انڈیا کے بڑے حصے میں بھی یہی حالت ہے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے نصاب کا وہی ایک پُرانا ڈھاریچ چلا آ رہا ہے کہیں ہم اس میں خفیف سا تغیّر کر دیتے ہیں باقی طریقہ تعلیم وہی قدیم ہی ہے اور اس کی نوعیت اور پالیسی میں فرق نہیں آیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر زمانہ گذشتہ میں کوئی غلطی تعلیم کی پالیسی میں ہو گئی ہے تو وہی غلطی زمانہ مستقبل میں بھی چلی جا رہی ہے۔ ہماری ضروریات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر پُرانا طریقہ نہیں توڑا جاتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نصاب تجویز کرنے میں اکثر ہم اپنی اصلی ضروریات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ میرا منشا غالباً ذیل کی مثالوں سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔

فرض کیجئے کہ ہم اپنے لڑکوں کے نقائص کو سوچنا شروع کریں اور اُن کے معلوم کرنے کے بعد پھر ہم اُن کے علاج کا خیال کریں تو آگے بڑھنے کی یہ قدرتی ترتیب ہو گی۔ نسخہ تجویز کرنے سے پیشتر مرض کی تشخیص ہونی چاہیئے۔ اگر ہم اس طرح دیکھنا شروع کریں تو ہمارے طلبہ میں حسب ذیل عیوب ہمیں نظر آتے ہیں۔

الف۔ جدّت خیالات و تصوّرات کا فقدان اور کسی نئے کام کو شروع کرنے کی عدم قابلیت

ب ۔مشرقی خوبیوں سے لاعلمی ۔ ماضی اور ہندوستان کی معاشرت کی اصلی کیفیات سے علٰحدگی کا رجحان ۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم ان کے اصول معاشرت سے مطابقت نہیں رکھتی۔

ج ۔اخلاق حمیدہ کی کمی۔

د ۔جسمانی نشوونما کا انحطاط۔

ھ ۔فنون لطیفہ سے (بالخصوص اپنے ملک کے) بے توجہی۔

میں نے یہ پانچ نقص صرف اپنے منشاء کو واضح کرنے کے لئے نوٹ کئے ہیں ان پانچوں نقائص کو اول ہم اپنے سامنے رکھیں پھر اس طرح نصاب تجویز کریں کہ یہ بڑے بڑے عیب رفع ہو جائیں ۔مثلاً پہلا نقص یعنی فقدان جدت کے نقص کے رفع کرنے کی غرض سے ہم کو اپنا نصاب ایسا بنانا چاہیئے کہ طلبہ کو خود اپنی ترقی کرنے اور اپنے صفات ذاتی کے ظاہر کرنے اور بڑھانے کا زیادہ موقع ملے ۔ہم کو مخصوص چند کتابوں کا پابند نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ آج کل ہے۔

اگر ہم مذکورہ بالا ترتیب سے چلیں گے تو طلبہ کو پڑھاتے وقت غالباً ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ لڑکوں کی ان صفات و خواص کے اُبھارنے میں زیادہ زور دیں جو اُن کے دماغ کی ساخت میں ودیعت کی گئی ہیں اور اُس کا خیال نہ کریں گے کہ اُن کے دل میں صرف چند ایسے خیالات کا ذخیرہ جمع کر دیں جن کو اُن کے دماغ کبھی ہضم نہ کر سکیں۔

کسی کتاب کے الفاظ و فقرات سمجھا دینے سے غالباً ایک مضمون کا لکھنا نصاب میں زیادہ وقعت رکھے گا۔ البتہ کتب مجوزہ بطور رہنما کے کام دیں گی ۔موجودہ رد کھے پھیکے نصابوں میں قومی ضروریات کے اعتبار سے قوائے انسانی کو کام میں لانے اور اُن کو ترقی دینے کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے ۔اس لئے ہم کو مختلف نصابوں اور مضامین میں اس طرح ردوبدل کرنا پڑے گا کہ امتحان کے نتائج سے یہ پتہ چل سکے کہ ہمارے طلبہ نے ان نقائص کے رفع کرنے میں کہاں تک کوشش کی ہے ۔آج کل جس قدر انتظامی امور میں قابلیت کا اور کامیاب طلبہ کی تعداد کا ہم خیال رکھتے ہیں اتنا اصلی علم و تعلیم کا ہم لحاظ نہیں کرتے ۔بجائے تعلیمی قابلیت و نوعیت کے ہم کامیاب طلبہ کی تعداد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔تعلیم کے بارے میں ہمارا یہ نقطۂ نظر بدل دینے کے قابل ہے ۔تعلیم کا یہ منشا نہیں ہے کہ طالب علم کے دماغ میں چند واقعات جمع کر دئے جائیں بلکہ اس سے مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی انسان ترقی کرے۔

اسی طور سے ابتدائی لکھنے پڑھنے اور حساب کا نصاب مقرر کرنے میں دیہاتی زندگی کی عام معاشرت کو پیش نظر رکھنا ضرور ہے۔ دیہاتی زندگی سے طلبہ کو نا آشنا رکھنا سخت نقصان دہ ہوگا۔

مذکورہ بالا نقطۂ نظر سے اگر ہم نصاب تعلیم پر غور کریں تو بعض مضامین کو خارج کرنا پڑے گا اور بعض نئے مضامین شامل کرنے ہوں گے۔ مثلاً اخلاقی عیب کی اصلاح کے لئے طالب علم کو اس کے عام طرز عمل کے اعتبار سے اور نیز استاد کی راز کی اس نوٹ بک کے لحاظ سے جس میں تمام طلبہ کے چال چلن درج ہوں کچھ نمبر اسی طرح ملنے چاہیئے جیسے کہ نصاب کے دوسرے مضامین میں دے جاتے ہیں۔ اس سے مراد نصاب میں ایک جدید مضمون کا اضافہ کرنا مقصود ہے۔ اس طرح ہم کو ایسی کتابیں تجویز کرنی چاہئیں جو ہمارے سامنے ہندوستان کا حقیقی مُرقّع پیش کرتی ہوں۔ جن کے مطالعہ سے طالب علم کے دل میں اپنے وطن اپنے تمدن اور اپنی تہذیب سے محبت پیدا ہو جائے۔ اگر ضرورت ہو تو اُن کو قومی گیت یاد دلائے جائیں۔ حیدرآبادی مدرسے کے طالب علم کو یہاں کی قدیم عمارات کی جو شہر کے اطراف واکناف میں پھیلی ہوئی ہیں خوبصورتی و کمال کے پہچاننے اور سمجھنے کے قابل بنایا جائے۔ چند میل کا چکر اس کی آنکھیں کھول دے گا۔ کتاب کی خشک تعلیم سے کہیں زیادہ یہ موثر ہوگا کہ طالب علم کو کسی دن صنّاعی اور تاریخی نقطۂ نظر سے قلعہ گولکنڈہ اور سلاطین قطب شاہیہ کے مقبروں کی سیر کرائی جائے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی سیر و گشت کو بھی نصاب تعلیم میں مقرر کر دینا چاہیئے۔ اور طالب علم کی جانچ پڑتال کے وقت یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس قسم کے ذرائع سے اس نے اپنے وطن اور اپنے ملک کے کس قدر معلومات حاصل کئے ہیں۔ جرمنی میں میں نے دیکھا کہ لڑکے لڑکیوں کی جماعت کو اس غرض کے لئے باہر لے جا رہے تھے۔ اس سے بھی مقصود ایک مضمون کا اضافہ ہے۔ جس کے واسطے نمبر ہوں گے اور جس سے ایک خاص نقص رفع ہوگا۔ جسمانی نشو و نما کے سوال کو بھی اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

مجھے یقین ہے کہ گذشتہ پچاس سال سے دنیا کے کسی اسکول کے طالب علم پر امتحان میں کامیابی کا اس قدر بار نہ پڑا ہوگا جتنا کہ ایک ہندوستانی طالب علم پر۔ اس محنت شاقہ کا بڑا سبب کچھ تو ذریعہ تعلیم ہے۔ لیکن جہاں تک اس ریاست کا تعلق ہے۔ یہ مشکل بہت کچھ حل ہو گئی ہے۔ بہرحال مختلف جماعتوں کے ترتیب مضامین اور تجویز نصاب میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ تاکہ طالب علم کو اوقات درس کے بعد کھیل کود اور اسپورٹس میں حصہ لینے کے

لئے کافی موقع مل سکے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسا طالب علم جو درجہ اول میں کامیابی کا خواہاں ہوتا ہے وُہ ہمیشہ وقت کی قلت کی شکایت کرتا ہے کہ اس کو ورزش جسمانی میں حصہ لینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس عیب کو رفع کرنے کے لئے جسمانی قابلیت بھی ایک مضمون قرار دینا چاہیئے جس کے نمبر مقرر ہوں۔ غرض کہ نصاب کے تجویز کرنے سے قبل اُن کے نقائص کو پیش نظر رکھنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ بعض وہ مضامین جو اس وقت پس پشت ڈالدئے گئے ہیں وہ صف اول میں جگہ لیں گے اور جو مضمون آج کل مقدم سمجھے جا رہے ہیں اُن میں کے بعض موخر ہو جائیں گے۔

اسی طرح اگر لڑکیوں کا نصاب مقرر کرنا ہو تو پہلے ایک مکمل ہندوستانی لڑکی کا تصوّر اپنے دل میں قایم کریں۔ اور پھر نصاب کو اس طرح مرتب کریں کہ وہ اس نمونے کے لئے موزوں ہو۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ ضروریات کے اعتبار سے ایک ہندوستانی لڑکی کے لئے "علم مثلث" "جبر و مقابلہ" اور "تاریخ یورپ" سے واقف ہونا ضروری ہے تو ان مضامین کو بھی مقرر کیجئے لیکن آپ کی رائے اگر اس کے خلاف ہو تب اس میں ضروری رد و بدل کر دیجئے۔

اب تک ہم اس بات کے عادی رہے ہیں کہ غیر ممالک کے نصاب تعلیم کی نقل کر لیا کرتے ہیں اور اپنی اصلی ضروریات کو کافی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمارے طالب علموں کے خاص امراض کے لئے ہم کو خاص ادویہ کی ضرورت ہے۔ پیٹنٹ ادویہ سے اب کام نہیں چل سکتا۔ میرے خیال کا یہی وہ پہلو ہے جس نے مجھے "اخلاق" "نشو نمائے جسمانی" اور "تعلیم نسواں" وغیرہ کے متعلق متذکرہ بالا خیالات کے اظہار پر مائل کیا ہے۔ آج کل اٹلی کیا کر رہا ہے۔ وہاں کے وزیر تعلیمات نے ایک بہترین اطالوی نمونہ اپنے ذہن میں قایم کیا ہے۔ اس کے بعد تمام تعلیم اس طرح دی جا رہی ہے کہ اس نمونے کی تکمیل کرے۔ آپ کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاں کے مدرسین کا نصاب بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں قدیم نصاب سے اب قطع نظر کرنا نہایت ضروری ہے۔ پُرانا سانچہ پُرانی قسم کے ہی طلبہ تیار کرے گا۔ جن پر ملک کو اطمینان نہیں ہے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ نصاب تجویز کرنے اور تعلیم کے جدید طریقے اختیار کرنے میں جرأت و دلیری سے کام لیا جائے۔

انجمن اساتذہ کی اہمیت ایک مستقل عاملانہ کمیٹی کا انعقاد

میرے مدرس دوستو۔ میں تقریباً اپنے مضمون کے ہر پہلو پر بحث کر چکا۔ میں آپ کے سامنے بحیثیت ایک دوست کے آیا ہوں نہ کہ ناصح کی حیثیت میں۔ آپ کا بہی خواہ ہونے کی حیثیت سے میری نظر میں جو بات کھٹکی وہ میں نے آپ سے کہہ دی۔ جس چیز کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر ہوا وہ تمام

ہندوستان کے اساتذہ کی اپنے تئیں متحد و منظم بنانے کی کوشش ہے۔ جس چیز سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے وہ اُن کی روشن خیالی ہے کہ یہ لوگ اپنی تنظیم کے لئے ذات پات اور ملت و مذہب کی تمام قیود کو بالائے طاق رکھ کر اور قومی و ملکی ہر قسم کے تعصبات سے قطع نظر کر کے "اتحاد جمیع اساتذہ ہند" کو "اتحاد جمیع ایشیا" کی صورت میں تبدیل کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اور کس کو معلوم ہے کہ آیندہ چل کر یہ اتحاد ایشیا کی حدود سے گزر کر عالمگیر اتحادِ اساتذہ کی صورت اختیار کر لے۔ اگر موجودہ نسل کے اساتذہ کی یہی ذہنیت رہی تو دنیا اس قسم کے بہت سے ہولناک مناظر سے محفوظ ہو جائے گی جو ہماری بدقسمتی سے گزشتہ ایک صدی میں تاریخ عالم ہمارے سامنے پیش کر چکی ہے۔ آپ کی موجودہ کانفرنس آخر میں اس عظیم الشان انجمن کی ایک شاخ بن جائے گی جو آیندہ کسی زمانے میں بنی نوع انسان پر حکمرانی کرے گی۔ آپ کی آواز کے سامنے جنگ جویوں کا شور و غل پست پڑ جائے گا۔ آپ کے شاگرد بھی انسانیت کی حمایت میں آپ کے ہمنوا ہوں گے اور اس طرح آپ لوگ بالواسطہ دنیا میں انسانیت کے قیام و بقا کا باعث اور امن و امان کے ضامن ہو جائیں گے۔ آج کل انسانیت کی فضا مجھے بہت ہی تاریک و مکدر نظر آرہی ہے۔ قومی و معاشی جدوجہد کا شور و غل کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ لیکن جس طریقے سے دنیا کے اساتذہ اپنی تنظیم کر رہے ہیں اس میں مجھے روشنی کی ایک جھلک دکھائی دے رہی ہے اور اُسے میں اچھے آثار سمجھتا ہوں۔ اگر دنیا کے اساتذہ تمام طلبہ کو اس طرح تربیت کرنے کے لئے متحد ہو جائیں کہ وہ زندگی کی قدر ہر چیز سے زائد کرنے لگیں اور وہ رنگ و قوم و ملت کے قیود سے آزاد ہو جائیں تو اُس سے بنی نوع انسان کے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اے تنظیم کرنے والو۔ خدا کرے کہ تم اپنی ارادے میں کامیاب ہو۔

آپ کی کانفرنس کے متعلق اب ایک بات مجھے اور کہنی ہے وہ یہ کہ رزولیوشن جو آپ سال بہ سال پاس کرتے رہتے ہیں وہ کچھ مفید نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ کی مجلس عاملہ مستعدی کے ساتھ اس پر نظر نہ رکھے کہ مدرسین کے مطالبات مناسب طور پر گورنمنٹ کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں یا نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کے جب تک سر اکبر حیدری صدر المہام فینانس ہیں ہندوستان کی کوئی گورنمنٹ خواہ وہ حکومت انگریزی ہو یا کوئی دیسی ریاست۔ تعلیمی امور میں آپ کی ریاست سے زیادہ ہمدردی اور امداد کرنے والی نہ نکلے گی۔ آپ کو گورنمنٹ کے روبرو صرف اپنا معاملہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر کامیابی یقینی ہے۔ مگر یہ سب کچھ آپ کے

مطالبے اور ان طریقوں پر منحصر ہے جو آپ تحریک کرنے میں اختیار کریں۔ آپ اپنی کانفرنس کی کامیابی کا توازن حقیقی و علمی نتائج سے کیجیے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ آپ کی مجلس عاملہ ہمیشہ مستعدی سے کام کرتی رہے اور کبھی غافل نہ ہو۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے حق میں دعا۔ اگر کوئی مورخ حیدرآباد کی تاریخ لکھے اور وہ حیدرآباد کے موجودہ زمانے کو زمانہ دینے سائنس (نشاۃ ثانیہ) سے تعبیر کرے تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ جب وہ انتظام مملکت کے مختلف شعبوں کی ترقی کا ذکر کرتے کرتے سررشتہ تعلیمات کا تذکرہ کرے گا تو اس کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ اس وقت حیدرآباد میں سلطان العلوم کا خطاب رکھنے والی مقدس ہستی اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے فی الحقیقت اس نام سے مخاطب ہونے کی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان ایک کروڑ بیس لاکھ نفوس کی تقدیروں کو تا دیر اُس بادشاہ سے وابستہ رکھے جس نے ان کی تعلیم کی خاطر اپنے خزانوں کے مُنہ کھول دئیے ہیں۔

رُوداد مجلس تربیت اخلاق طلبہ[1]

مرتبہ مولوی سید غلام محمود صاحب

اظہار تشکر جناب صدر و معزز حاضرین!

مجلس تربیت اخلاق طلبہ کی رُوداد گوش گزار کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کا دلی شکریہ خاص طور پر ادا کیا جائے جو نہ صرف انجمن کے بانی بلکہ اپنے زمانہ قیام بلدہ تک بے بدل روح رواں بھی تھے۔ چنانچہ مجلس ہذا کی تشکیل عہدہ داران و ارکان کا انتخاب مضامین کی مناسب حال تقسیم اور طریقہ کار وغیرہ سب کچھ ان ہی کی مساعی جمیلہ۔ حسن تدبیر۔ دیرینہ تجربہ۔ علمی شغف اور فراست و مشورت کا فی الحقیقت رہین منت ہے۔

تشکیل مجلس ہذا۔ (۱) جناب مولوی سید ظہور علی صاحب میر مجلس۔ (۲) اور جناب مولوی سید غلام محمود صاحب معتمد کے سوا (۳) جناب مولوی سید مجتبیٰ الحسن صاحب نقوی (۴) جناب مولوی سید مسعود الحسن صاحب (۵) مسٹر جی سندرم (۶) مسٹر وی ہارڈیکر (۷)

---

[1] یہ رپورٹ تربیت اخلاق طلبہ کی کمیٹی کے لائق معتمد مولوی سید غلام محمود صاحب نے انجمن اساتذہ ستر بلدہ کے پانچویں سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔

مسٹر جی۔ اے۔ چندرو ارکر (۸) جناب مولوی سید فخر الحسن صاحب (۹) جناب مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل نے بہ حیثیت رکن اپنے فرائض گہری دلچسپی اور قابل قدر محنت و قابلیت سے بہ حسن و خوبی انجام دئے۔ چنانچہ طاعون کی عام پریشانی۔ مسدودی مدارس اور نقل مقام کی دشواری کے باوجود مجلس ہذا کے متعدد جلسے کامیابی کے ساتھ وقتاً فوقتاً منعقد ہوئے۔ جن میں معزز ارکان نے مقررہ عنوان پر اپنا قابل قدر مضمون پیش کر کے دوسروں کو اظہار رائے کا آزادانہ موقع دیا جس کے سبب مجلس ہذا تربیت اخلاق طلبہ کے متعلق اپنی ناچیز مرتبہ روئداد سال حال کی کانفرنس میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتی ہے۔

اخلاقی تربیت کی ضرورت و اہمیت

اگر انسانی زندگی کے ماحول و ضروریات پر نظر بھی ڈالی جائے تو یہ حقیقت خود بہ خود ظاہر و ثابت ہوگی کہ انسان کامل حصول علم کے ساتھ تربیت اخلاق کا بھی ناگزیر طریقہ پر حاجت مند ہے۔ اور جب تک یہ احتیاج پوری نہ ہو اُس کو اپنے مبلغ علم سے کوئی حقیقی فائدہ پہونچ نہیں سکتا۔ چنانچہ اخلاقی تربیت سے عاری افراد کے لئے تعلیم طغرائے امتیاز ہونے کی بجائے کلنک کا ٹیکا ہو جاتی ہے۔ اور جب ایک نرا تربیت یافتہ شخص کسی ناتربیت یافتہ خواندہ فرد کی غیر مہذب حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اُس کے لئے یہ فیصلہ یقیناً دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ بھی کوئی انسان ہے۔ اس ضمن میں یہ خیال بجائے خود لغو ہے کہ جب طلبہ کی عقل پختہ اور تعلیم موثر ہوگی تو اخلاق خود بہ خود سنور جائیں گے کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو زمانہ تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص و مفید ہے۔ اسے ناموزوں اور قبل از وقت قرار دیا جاتا ہے کیا اس بیّن مشاہدے سے کبھی اغماض کیا جا سکتا ہے کہ بدقسمتی سے جو افراد اس ناعاقبت اندیشانہ خیال کے تحت ناتربیت یافتہ رہے ہیں وہ فارغ التعلیم ہونے کے بعد بھی اخلاقی تربیت کا کوئی عمدہ نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ تربیت سے عاری تعلیم ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جس کا تیل اور بتی تو نصاب تعلیم ہیں اور اس کا روشن کرنا تدریس و تعلیم کا مترادف ہے۔ مگر جب تک حُباب کثافت اور گرد و غبار سے پاک و صاف نہ ہو تاریکی مبدل بہ روشنی نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ جو چراغ تاریکی کو دور نہ کر سکے۔ اس کا وجود و عدم وجود یکساں ہے اور جس کا وجود اس کے عدم سے بہتر نہیں ہوتا اس کی حقیقی قدر و قیمت بھی کچھ نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ جس طرح زندگی کے لئے جسم اور جان کی احتیاج ناگزیر ہے اسی طرح کامل انسانیت کے لئے تعلیم و تربیت لازم و ملزوم ہیں۔ اور ایک کے بغیر دوسرے کا وجود اس قدر موہوم و بے حس ہوتا ہے

کہ اس پرستی کا صحیح اطلاق کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ باوجود اس لزوم کے اخلاقی تربیت کو تعلیم سے جدا کرنا جسم وجان کے باہمی رشتہ حیات کو منقطع کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ بجز موت کے اور کچھ نہیں۔ گویا تربیت سے عاری تعلیم کی زندگی فی الحقیقت انسانیت کاملہ کی حیات نہیں بلکہ موت ہے۔ کیا اس بے شبہ موت کو حیات سمجھنا پرلے درجے کی غلطی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت اور شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم و تربیت ایک ہی نظر سے دیکھی جائے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوگا نتائج تعلیم عملاً ناقص رہیں گے۔ چنانچہ ہر سال خواندہ افراد کی تعداد میں دل خوش کن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان کے سرمایہ زندگی میں چند ادھوری معلومات اور ناپختہ قابلیت کے بے بھروسہ ضامن یعنے دو چار کاغذی اسناد کے سوا اخلاق حسنہ اور انسانیت کاملہ کا کوئی قابل قدر ولایق اعتماد جوہر موجود ہی نہیں ہوتا۔

مذہبی تعلیم مذہبی تعلیم کی ضرورت و عدم ضرورت کے متعلق کتنا ہی شدید اختلاف آرا کیوں نہ ہو۔ جب تک مذاہب قایم ہیں مذہبی تعلیم کی ضرورت بھی مسلم ہے۔ نیز مذہب کی حقیقی تعلیم سے بے بہرہ ہو کر خود ساختہ اصول کے تحت یہ قیاس کرنا کہ مذہبی تعلیم تعصب و نفاق کی اصل اور منافرت کی موجب ہے۔ درست نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف مذہبی تعلیم سے دیدہ و دانستہ اغماض کرنا ملک و قوم کے لئے مضرت رساں ثابت ہوا ہے۔ جس کے ثبوت میں تاریخی شہادتیں دلیل قاطع ہیں۔ جس طرح انسانی زندگی دولت علم کے بغیر بے قیمت ہے۔ اسی طرح علم، اخلاق کے بغیر بے سود ہے۔ اور اخلاق کی درستی مذہبی تعلیم پر منحصر ہے۔ کیونکہ مذہب و اخلاق لازم و ملزوم ہیں۔ فن اخلاق میں جو امور اہم قرار دئے گئے ہیں مذہب ان سب کا حامل ہے۔ اور ماہران تعلیم کے مقاصد اخلاق سے جو مراد ہے وہ مذہبی تعلیم کے بغیر کما حقہ پوری نہیں ہوسکتی۔ اور یہی ایک شعبہ ایسا ہے جو حصول مقصد میں دیگر ذرائع سے نسبتاً آسان۔ موافق طبع۔ زود اثر اور قابل نفع ہے۔ مگر مدارس کے عدم التفات کے سبب بدقسمتی سے طلبہ بھی اس غلط فہمی میں بری طرح مبتلا ہیں کہ مذہبی تعلیم نسبتاً کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ اور اس میں ناکامی مانع ترقی نہیں ہوسکتی۔ ان ہی خیالات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مذہبی معلومات سے بے بہرہ اور اس کے عملی فوائد سے محروم ہیں۔ ایسی حالت میں مدارس کا فرض ہے کہ مذہبی نصاب اور دیگر مضامین درس کی اہمیت میں جو غلط امتیاز طلبہ کے ذہن نشین ہوا ہے۔ اس کو دور کر کے مذہبی تعلیم کی عظمت اور قدر

وقیمت پیدا کریں۔ جس کی آسان اور واحد تدبیر یہی ہے کہ اہمیت و التفات میں نسبتاً اور عملاً ہرگز کمی نہ کی جائے۔ نیز عہدہ دار معائنہ تشویق و تہدید اور باز پرس کا کوئی پہلو نظر انداز نہ کرے تاکہ طلبہ اور خود مدرسین حسب ضرورت توجہ کرنے میں تھوڑی سی غفلت کے بھی مرتکب نہ ہوں۔

مذہبی تعلیم کی اہمیت و منفعت کے مدنظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ٹریننگ کالج کی ہر ایک جماعت کے نصاب میں مذہبی تعلیم شریک اور شروط الامتحان قرار دی جائے۔ تاکہ ٹرینڈ مدرس مذہبی معلومات کے ساتھ یا اصول مذہبی تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف ہو جائیں اور یہ موجودہ دل خراش منظر کہ ٹرینڈ اساتذہ کے لئے دیگر فنون کے ساتھ مذہبی تعلیم غیر ضروری ہے۔ نیز مذہبی تعلیم کے واسطے ٹرینڈ مدرسین کی ضرورت نہیں۔ جلد از جلد محو ہو جائے۔

علم و عمل کے نقطہ نظر سے مذہبی تعلیم اسی حالت میں موثر و مفید ہو سکتی ہے جب کہ طلبہ عمل کرنے کے عادی بنائے جائیں اور اُن کے عمل پر نگرانی کی جائے۔ مذہبی تعلیم صرف ایسے اساتذہ کے تفویض کی جائے جو عالم باعمل ہوں اور جن کو فرائض ادا کرنے میں تکلف نہ ہو ورنہ "من نہ کردم شما حذر بکنید" کا طریقہ بے سود ہو گا۔ تقریباً ہر ایک مدرسہ مسلمان طلبہ کے لئے کم از کم نماز ظہر کا انتظام کر سکتا ہے۔ اگر ضروریات نماز موجود اور جگہ کافی نہ ہو تو قریب کی مسجد میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اس خصوص میں سررشتہ نہ صرف نماز کے دیرینہ و سابقہ احکام پر اکتفا کرے بلکہ دیگر تعلیمی ضروریات کی فراہمی کی طرح مصلّے اور لوٹے مہیا کر کے عملی پابندی کے لئے وقتاً فوقتاً توجہ مبذول کیا کرے۔

دینیات کی مروجہ تعلیم کے فقہ اسلام کے ساتھ مصلحان قوم اور برگزیدہ بزرگوں کے سوانح اور مناسب حال قرآنی قصص بھی ضرور شریک کئے جائیں۔ اسی طرح اخلاقیات نصاب میں چند خشک ذہنی مضامین کے عنوانات میں خاص کر کے بلا تفریق مذہب و ملت قابل فخر و تقلید ہستیوں کی زندگی کے سچے حالات و واقعات اور اخلاقی سبق آموز قصے پڑھائے جائیں کیونکہ سیرت و اخلاق کو سنوارنے کا یہ بھی ایک بہترین طریقہ ہے۔ چنانچہ گزشتہ زمانے میں جب کہ علم کی روشنی اس قدر جلوہ گر نہیں تھی بے علموں میں بھی محاسن اخلاق کے ایسے جواہر ریزے پائے جاتے تھے جو آج کل ذی علموں میں بھی نظر نہیں آتے۔ جہاں اس سیرت سازی کے بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک ناقابل تردید بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اُن لوگوں کو اپنے زمانہ طفولیت میں پر از نتائج اخلاقی قصص

سننے کے موقع بکثرت ملا کرتے تھے۔ اگر رستم کی دلاوری اور سکندر کے استقلال کے حقیقی اسباب دریافت کئے جائیں تو یقیناً بچپن میں سنے ہوئے قصّوں سے اُن کو نہایت ہی قریب کا تعلق ضرور ہوگا۔ اس اہمیت کے مدنظر اگر ابتدائی جماعتوں میں قصہ گوئی کی تعلیم صرف اخلاقی سبق آموز حکایات سے مخصوص کردی جائے تو یہ ایک کرشمہ دوکار کا مصداق ہوگا کہ قصہ گوئی کا مقصد بھی پورا اور بالواسطہ درستی اخلاق کی صورت بھی خود بہ خود پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح حفظ کرنے کے اشعار کے ساتھ بھی اخلاق کی قید لگا دی جائے تو غالباً خلاف ضرورت نہ ہوگا کیونکہ حافظے میں ضوابط اخلاق کا محفوظ و تازہ رہنا طلبہ کے لئے بالضرور فائدہ مند ثابت ہوگا۔

طلبہ سے زیادہ طالبات کو اخلاقی تربیت کی شدید ضرورت ہے کیونکہ کسی لڑکے کی تربیت محض ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے لیکن کسی لڑکی کا تربیت کرنا اس کے تمام خاندان کی تربیت کا مُرادف ہوتا ہے۔ جب تک طالبات حسن خلق کے زیور سے حقیقی طور پر آراستہ نہ ہوں گی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے بچے خوش خلق و نکوکار نہیں ہو سکتے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ذی شعور و زمانہ شناس والدین کو اس بات کی فکر کم ہوا کرتی ہے کہ اُن کی لڑکیاں ریاضی یا ادب وغیرہ کی ماہر ہو جائیں بلکہ اُن کی آرزو اور کوشش زیادہ تر یہی ہوتی ہے کہ محاسن اخلاق کا نمونہ اکمل ہوں تاکہ زندگی میں لازماً پیش آنے والے دورِ انقلاب میں خدا ترسی نیک نفسی۔ فرماں برداری۔ راحت رسانی شرم و حیا۔ خُلق و مروت۔ غرض حسن معاشرت و اخلاق کی تمام صفات کاملہ سے متصف ہو کر مقصد حیات کو بہ درجہ اتم پورا کریں۔ اس شریفانہ مقصد کے حصول کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ مذہبی تعلیم پر بیش از بیش توجہ کی جائے۔ اور فقہ و عقائد کے ساتھ مناسب حال نسوانی قصص سے پورا استفادہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ مذہبی تعلیم کا شعبہ اصل مقصد کی تکمیل میں ادھورا اور ناقص نہ رہ جائے۔

درس کا کمرہ یہ دوران درس جماعت میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا مسئلہ نسبتاً زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ مشکل اس وجہ سے کہ جماعت میں عموماً ایسے طلبہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے جن کی طبائع مختلف ہوا کرتی ہیں۔ اور اہم اس سبب سے کہ طلبہ میں اخلاق کا احساس بہ طریق راست پیدا کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے مگر اس موقع کو بدیں وجہ ضائع کر دیا جاتا ہے کہ نصاب تعلیم کا حجم بہ لحاظ مدت تعلیم اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ باوجود ان تھک کوششوں کے مدت مقررہ میں اختتام کی نوبت نہیں آتی اور تکمیل نصاب کی دھن کچھ ایسی لگی رہتی ہے کہ وہ دوران تفہیم میں تربیت اخلاق کی شدید ترین ضرورت کی طرف بھی متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دیتی۔ اس میں شک نہیں

کہ اس اعتراض میں تھوڑی سی معقولیت پائی جاتی ہے مگر مغز کو استخواں پر ترجیح دینی کونسی عقلمندی ہے۔ کیا حضرات اساتذہ کی تمام قوتیں اور ساری کوششیں صرف اسی ایک ادنیٰ مقصد کے لئے وقف ہیں کہ اُن کے شاگرد امتحان میں کامیاب ہو جائیں اور بس۔ اگرچہ کہ وہ اخلاقی تربیت سے قطعاً عاری ہی کیوں نہ ہوں اس موقع پر ایک عذر بے جا یہ کیا جاتا ہے کہ افسران معائنہ کنندہ بہ وقت معاینہ اپنی توجہ زیادہ تر نصاب تعلیم کی طرف منعطف کرتے ہیں اور اخلاقی تربیت پر کما ینبغی زور نہیں دیتے۔ ایسی صورت میں اساتذ کو تربیت اخلاق کی جانب متوجہ ہونے کی ترغیب یا تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی بھی ہے تو حسب ضرورت نہ ہونے کے سبب نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ اس طرز عمل کی تمثیل یہ ہے کہ اگر کوئی طبیب کسی تیمار دار سے بیمار کو دوا پلانے اور پرہیز کرانے کی نسبت بہ وقت معائنہ استفسار نہ کیا کرے تو تیمار دار اپنے اٹل فریضے کو غیر ضروری تصور کرکے ٹال سکتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو فرایض شناس بھی کہتا ہے اور فریضہ اہم کو محض کسی پرساں و نگراں نہ ہونے کے سبب فراموش بھی کر جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طلبہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے بیرون مدرسہ گزارنے کے بعد ایسے مقامات سے صرف چھ گھنٹوں کے لئے مدرسے میں جمع ہوتے ہیں جہاں اخلاقی ماحول نسبتاً اچھا نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے مگر جس طرح تازہ اور صاف لطیف ہوا میں گھنٹے بھر کی تفریح تمام دن کی کثافت کو دور کر کے ازسرنو تازگی پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اُسی طرح مدرسے کے تھوڑے سے وقت کا اخلاقی اثر بیرونی ماحول کے مُخرّبُ الاخلاق اثرات پر غالب آسکتا ہے بشرطیکہ ایک مصلح کی طرح جس کو حصول مقصد میں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے، اُستاد بھی طلبہ کی تربیت میں پیش آنے والی دقتوں کو مردانہ وار برداشت کرے۔ مگر یاد رہے کہ محض پند و نصائح کا دفتر بالکل بے معنی ہوگا کہ بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ چونکہ طلبہ میں تقلید کا مادہ فطرتاً ودیعت ہوتا ہے اس لئے تربیت اخلاق میں سب سے زیادہ موثر چیز اساتذہ کی شخصیت اور محاسن اخلاق کا عملی نمونہ ہے۔

جماعت میں ضبط قایم رکھنا تربیت اخلاق کے لئے ممد و مفید ہے لیکن بعض وقت ایک تند خو سزا دہندہ اُستاد کی جماعت میں طلبہ کی مہذب نشست و برخاست اور شائستہ حرکات و سکنات کا بہترین اخلاقی نمونہ دکھلائی دیتا ہے۔ جو دراصل دھوکے کی ٹٹی ہے جس کی آڑ میں جبر و تشدد نے اخلاق کے حقیقی خط و خال کو مسخ کر دیا ہے۔ اخلاقی ضبط کے لئے اُستاد

مشفقانہ سلوک۔ شائستہ طرزِ تخاطب، خامیوں پر منصفانہ چشم نمائی، نیک افعال کی قدردانی، فرائض میں انہماک، جماعت میں صفائی چیزوں میں قرینہ وغیرہ بہت ضروری ہے۔ تعلیم خواہ کسی مضمون و فن کی ہو اگر ہر ایک اُستاد اپنا مضمون اخلاقی رنگ آمیزی کے ساتھ پڑھانے کی کوشش کیا کرے تو یہ طریقہ تعلیم و تربیت دونوں کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگا اور اس کے سبب مدرسے میں ایک ایسی اخلاقی فضا خود بہ خود پیدا ہو جائے گی جو آسمان تربیت کو چار چاند لگائے گی۔ چنانچہ ایک ماہر تعلیم رسکن کا قول ہے کہ دماغی تعلیم کا مقصد اعظم اخلاقی تربیت ہونا چاہیئے ورنہ ایسی تعلیم تعلیم نہیں کہی جا سکتی۔

دارالاقامہ مدرسے کے بعد اگر کوئی جگہ طلبہ کے لئے تہذیب و شائستگی کا مسکن، امن و اطمینان کا مأمن، تعلیمی دلچسپیوں کا مرکز، مسرت و انبساط کا منبع، شرافت و انسانیت کا سرچشمہ اور علم و اخلاق کا گہوارہ ہو سکتی ہے تو وہ صرف دارالاقامہ ہے جہاں بلالحاظ عمر و استعداد ہر ایک ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا اور ایک ہی دُھن میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ طلبہ جن کو دارالاقامہ کی زندگی نصیب ہے۔ چونکہ اُن کی کوئی مصروفیت طالب علمانہ مشاغل کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی اس لئے ایک طرف حصول علم میں دلچسپی و اطمینان میسر اور دوسری جانب درستی اخلاق کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ چنانچہ بیرونی ماحول کی کوئی غیر علمی کشش اور ذمائم اخلاق کا کوئی بُرا اثر اُن کی مصروفیت اور وقت پر مترتب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہر ایک فرض کو نہایت دلچسپی، انہماک اور احساس کے ساتھ بروقت انجام دیتے ہیں۔ ان کی ہر ایک ضرورت وقت پر پوری ہوتی ہے اور وہ خود بھی اپنا ہر ایک کام وقت پر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ گھر میں یہ ممکن ہے کہ ایک بچہ پڑھنے اور دوسرا کھیل میں مصروف ہو مگر دارالاقامے میں ایسا ہو نہیں سکتا بلکہ ایک وقت میں سب کا ایک ہی شغلہ ہوتا ہے۔ دارالاقامے کی زندگی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بُری خصلت کا لڑکا وہاں داخل ہوتا ہے تو دوسروں کے عملی نمونے اور فیض صحبت سے بہت جلد نیک رویہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا۔ اخلاقی تربیت خود بہ خود حاصل کرنے کی تحریک کسی دوسری جگہ اس آسانی سے پیدا اور کارگر نہیں ہو سکتی۔ طالب علموں کے اخلاق و عادات پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب گھر اور دارالاقامے کے طلبہ مدرسے میں جمع ہوتے ہیں تو اخلاقی نقطۂ نظر سے اُن میں نمایاں تفاوت پایا جاتا ہے اور تعلیمی امور میں بھی وہ ممتاز ہوتے ہیں۔ چونکہ طلبہ کا وقت مدرسے کی نسبت دارالاقامے میں زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کو اخلاقی تربیت کا زیادہ موقع نہیں ملتا ہے۔ دارالاقامے کی کامیابی و نیک نامی ضبط، انتظام اور باقاعدگی، نگرانی پر منحصر ہے اور نگرانی کا فریضہ سب سے

زیادہ اہم اور نازک ہے۔ اگر کسی دار الاقامے میں کوئی اخلاقی بُرائی پائی جائے تو اُس کی پوری ذمہ داری نگرانی پر عاید ہوگی۔ نگران کار کے انتخاب میں اخلاقی پہلو سے غور و خوض کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ نگران کار کی حیثیت اور فرایض صدر مدرس سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ مدرسے میں تو ایک سے زیادہ کئی اُستاد طلبہ کے لئے اخلاقی نمونہ ہوتے ہیں مگر دار الاقامے میں صرف نگران کار کا اخلاقی نمونہ طالب علموں کے پیش نظر رہتا ہے۔ اس لحاظ سے نگران کار کا مجسمہ اخلاق ہونا لازمی ہے۔ ورنہ طلبہ کی اخلاقی تربیت کی توقع عبث ہوگی۔

جس طرح تحصیل علم کے لئے مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ اسی طرح تربیت اخلاق کے واسطے دار الاقامے کی احتیاج ناگزیر ہے اور جب کہ تعلیم سے تربیت کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے۔ تو پھر شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس کے ساتھ دار الاقامہ جات کی تعداد میں بھی مناسب اضافہ کیا جائے مگر کوئی دار الاقامہ محض اس واسطے قایم نہ کیا جائے کہ طالب علموں کو کھانے پینے اور رہنے سہنے میں سہولت ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو پھر مکان اور دار الاقامہ میں اخلاقی پہلو سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔

چونکہ دار الاقامے کو تربیت اخلاق سے گہرا تعلق ہے اس لئے مجلس ہذا کی رائے میں موجودہ دار الاقامہ جات کی حسب ضرورت اصلاح ضروری ہے۔ تاکہ تربیت اخلاق کا اہم ترین مقصد بدرجہ اتم حاصل ہو۔

کشافہ یعنی اسکوٹنگ اخلاقی تربیت کی اہمیت و ضرورت کے مدنظر جتنی تحریکات عمل میں آئی ہیں ان سب میں کشافہ یعنے اسکوٹنگ کی تحریک بلحاظ فوائد گوناگوں نہایت ارفع و اعلیٰ اور مبارک و مسعود ہے۔ کیونکہ اس کے تمام قوانین و ضوابط دراصل اصول اخلاق کے جواہر ریزے ہیں۔ مثلاً خدا کی بندگی، مخلوق کی خدمت، وطن کی محبت، مذہب کی پابندی، راست بازی، حق گوئی، ایفائے وعدہ، بزرگوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، عزت کا پاس، اپنی مدد آپ کرنا، صحت کی حفاظت، صفائی کی عادت، فرائض سے دلچسپی و انہماک، مروت و ملنساری، ایثار و ہمدردی، غرض ہر ایک صفت محاسن اخلاق کا جزو لاینفک ہے۔ جس کی جس قدر بھی قدر کی جائے کم اور بہت کم ہے۔

اسکوٹنگ نے کچھ ایسا اصول اور طرز اختیار کیا ہے کہ بلالحاظ مذہب و ملت ہر شخص اس کا گرویدہ ہو سکتا ہے اور ہے۔ خصوصاً طلبہ کے قوائے جسمانی و دماغی اور ان کا سن و سال

زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی اخلاق آموز شغلہ ان کی اصلاح پذیر طبیعت کے موافق ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسکوٹنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس میں اس کا رواج دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اور اس کو عام مقبولیت بلا دقت حاصل ہو رہی ہے۔ اگر اسکوٹنگ کو چند ظاہری لوازمات کی اشد احتیاج نہ ہوتی تو ہر ایک طالب علم کشاف بننا اپنا فرض اولین سمجھتا۔

جس طرح شیر خوار بچے کے لئے ماں کا دودھ نعمت عظمٰی ہے اور قدرت نے اس کو اپنی حکمت بالغہ سے مناسب حال پیدا کر کے فطری نشوونما کا کفیل بنایا ہے؛ بالکل اسی طرح طلبہ کی اخلاقی تربیت کے واسطے اسکوٹنگ کا ایک خداداد وسیلہ ظہور میں آیا ہے جو سراسر کھیل اور سراپا معلم اخلاق ہے۔ چنانچہ اسکوٹنگ کے قوانین اور عہد و پیمان کو دیکھنے کے بعد اس صداقت پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ بادی النظر میں جو مشغلہ محض تفریح دکھائی دیتا ہے وہ حقیقت میں درستی اخلاق کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

جب ایک کشاف اپنی اخلاقی تربیت کے مدارج طے کر دیتا ہے تو اس میں انسان کامل کی اکثر صفات از خود پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کو آنے والے دور زندگی کی مشکلات کا آسانی سے مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ اگر حقیقی معنوں میں اسکوٹنگ ہمارے ملک میں رائج اور کامیاب ہو جائے تو یقین ہے کہ تربیت اخلاق کے لئے جداگانہ انتظام کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ ان خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجلس ہذا اس امر کی پرزور سفارش کرتی ہے کہ بلا امتیاز درجہ ہر ایک مدرسے میں اسکوٹنگ جلد از جلد قائم کی جائے اور کشاف کی تعداد میں ممکن اضافہ بھی کیا جائے تاکہ طلبہ بالواسطہ تربیت سے مستفید ہوں۔

میدانی کھیل نہایت وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ واٹرلو کی لڑائی ایٹن کی بازی گاہ پر فتح ہوئی۔ یہ درست ہے اور اس کی صداقت سے انکار ناممکن ہے۔ اسی طرح مدرسے کی چار دیواری کی تمام علمی و اخلاقی مہمات میدانی کھیل کو دکی مستقل مشق و عادت کے بغیر انجام نہیں پا سکتیں دماغ کتنا ہی قابل اور مزاج کیسا ہی خلیق کیوں نہ ہو جب تک قوائے جسمانی صحت ور نہ ہوں گی علم و اخلاق کی عملی خوبی ظاہر نہیں ہو سکتی۔

کچھ عرصہ قبل کے طرز تعلیم کے لحاظ سے جماعت کے کمرہ کو قید خانے کا حجرہ کہا جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ مدرسے کے اوقات تعلیم ختم ہو جانے کے بعد بھی غریب طالب علموں کو مصیبت سے رہائی نہیں ہوتی۔ ہوم ورک کی کثرت ایسے بیچارے کا دم ناک

میں آجاتا ہے۔ فی زمانہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کوتاہ نظری کی نظرثانی کی جائے۔ اور ہونہار طلبہ کے علمی و عملی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصلاح کی جانب توجہ کی جائے تاکہ مدرسے کی اس ننھی منی سوسائٹی کو اپنی موجودہ اور آیندہ زندگی میں تعلیم و تربیت کی برکات سے حقیقی طور پر مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔

نچلا نہ بیٹھنا بچے کی طبیعت میں فطرتاً داخل ہے۔ جو بجائے خود بہت مفید ہے۔ اور جس کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا بھی ضروری ہے۔ مگر جب بچے کو اظہار کے لئے کوئی مناسب موقع حاصل نہیں ہوتا ہے تو فطرت کی یہ ودیعت اپنے ظہور کی مخرب الاخلاق صورتیں خود بہ خود مجبوراً پیدا کر لیتی ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ بچہ ایک ایسی راہ پر لگایا جائے جس سے اُس کی قوائے دماغی و جسمانی کی ترقی اور اخلاق کی تربیت ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کی بھی ایک یہی تدبیر ہے کہ اس کے لئے کھیل کود کا کافی انتظام کیا جائے۔

تعلیم و تربیت میں کھیل کود کا شمول موجودہ ماہرانِ تعلیم کے نزدیک ناگزیر ہے لیکن اکثر والدین اور خود اساتذہ بھی کھیل کود کو مفاد کے منافی تصور کرتے ہیں یہ خیال خواہ درست ہو یا غلط لیکن بچہ فطرت کی دی ہوئی امانت کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت کے خلاف بچے کو کھیل کود سے باز رکھنا ایک ایسے نقصان کا موجب ہے جس کی تلافی عمر بھر نہیں ہو سکتی۔ بچے کی فطرت پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس پر کھیل کود کا نہایت ہی خوش گوار و خوش آیندہ اثر ہوتا ہے۔ جو جماعت کی چار دیواری کے اندر با وجود کوشش تمام کے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جب تک جماعت میں بیٹھا رہتا ہے مدرس کی قہر آلود نگاہوں کا شکار ہو کر اپنی اندرونی کیفیات کو حتی الامکان پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بچے کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنا مقصود ہو تو وہ صرف بازی گاہ پر دیکھا جا سکتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بچے کے عیوب اور کمزوریاں ہم عمروں کے ساتھ میل ملاپ کرنے کے سبب خود بہ خود درست ہو جاتی ہیں۔ گویا جز کل کے ساتھ مل کر خود بھی کل ہو جاتا ہے۔ کھیل کود کے باعث بچوں میں ایثار، ہمدردی، فرض شناسی، باقاعدگی، محنت، پھرتی، بھائی چارہ، اتحاد جیسے محاسن اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اثر صرف مدرسے کی حد تک باقی نہیں رہتا بلکہ ختم تعلیم کے بعد بھی معاشرت کے نہایت قابل قدر رنگوں میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ جس کے سبب وہ اپنی آیندہ زندگی میں ملک و قوم کے لئے ایک نہایت کارآمد فرد بن سکتا ہے جو اس کے لئے دین و دنیا

کی بہترین نعمت ہے۔ جس مدرسے میں تعلیم کے بعد کھیل کا کوئی معقول انتظام نہ ہو وہاں طلبہ اکثر بیہودہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور خراب خصلتیں اور ذلیل عادتیں اُن کے اخلاق وصحت پر اپنا بُرا اثر ڈالتی ہیں جن کے سبب وہ اپنی آیندہ زندگی میں طرح طرح کی مصیبتوں میں یقیناً مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلوغت کے میلانات اچھی جوانی کا خاصہ ہوا کرتے ہیں لیکن پسندیدہ کھیلوں کے عدم انتظام کے باعث اس فطری نمو میں تباہ کُن خرابی پیدا ہو جاتی ہے جس سے بچوں کی دماغی صرفیت اور تربیت پر پانی پھر جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک مدرسے میں کھیل کا کافی اور باقاعدہ انتظام ہونا چاہیئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مدارس میں کھیل کود کے ضروری اور مفید مشغلے کا باقاعدہ انتظام کس حد تک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مشکلات کس طرح رفع ہو سکتی ہیں۔ کثیر التعداد طلبہ کی معاشی حالت اور گھر کی زندگی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کا خاص طور پر لحاظ نہیں کیا جائے گا تو کھیل کود کا کوئی انتظام اپنے حقیقی مقاصد کو ہرگز پورا نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ عسرت و تنگ دستی کے سبب خراب اور ضرورت سے کم غذا پر قناعت کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ کافی پوشش تک اُن سے ممکن نہیں۔ اُصول صحت کے موافق زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا مشکل سوال ہے جس کو بلا امداد حل کرنا اُن کے امکان سے باہر ہے۔ صرف دو وقت غذا کھانے والے وگرسنہ طلبہ کو برخاست مدرسہ کے بعد کھیل کود کے لئے مجبور کرنا سراسر ظلم ہے۔ ہمارے مدارس کی مالی حالت بھی اس قابل نہیں ہے کہ بچوں کو کچھ کھلا پلا کر بازی گاہ میں کھیل سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیں۔ خود والدین بھی اس کا بار برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کی بھی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ مدرسے کے اوقات دس تا چار کی بجائے نو تا تین کر دئے جائیں۔ تا کہ بھوکے پیاسے بچے گھر جا کر کچھ ناشتہ کر لیں اور پھر چار یا ساڑھے چار بجے بازی گاہ پہونچ کر کھیل کی برکتوں سے مستفید ہوں۔ اوقات میں مناسب تبدیلی کے بعد کھیل کود میں حصہ لینا ہر طالب علم کے واسطے بہ آسانی لازمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالآخر مجلس ہذا کو اُمید ہے کہ کھیل کود کے اخلاقی پہلو اور اس کی اٹل ضرورت پر نظر فرما کر ارباب مقتدر مناسب حال انتظام جلد از جلد فرمائیں گے۔

تعلیمی اُمور میں طلبہ کی خود مختاری ہربرٹ اسپنسر کا قول ہے کہ اگر تعلیم و تربیت سے یہ مقصود ہو کہ طلبہ اپنی آیندہ زندگی میں آزادی د

خودداری کے خوگر ہوں تو اُستاد کو اُن پر حکومت کرنے کی بجائے خود اُن کو اپنے اوپر حکومت کرنے کا پورا موقع دینا چاہیئے۔ اس عقیدے پر معاشرتی اور اخلاقی پہلو سے نظر کرنے کے بعد اس کی صداقت و ضرورت مسلم ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جدید تعلیم کے مقصد کا ماحصل یہ ہے کہ مدرسہ اور ماحول میں ایسا ربط قایم کیا جائے کہ آگے چل کر طالب علم کشمکش حیات کا بخوبی مقابلہ کر سکے اور زندگی کے ہر شعبے میں استعداد کے ساتھ حصہ لے سکے۔ اس نیک مقصد کے لحاظ سے مدرسے کو دنیا کے کاروبار کا مختصر نمونہ یا بہ الفاظ دیگر چھوٹی دنیا ہونا چاہیئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ طلبہ کو مدرسے کے انتظامی امور میں حصہ لینے کا موقع دے کر اُن کی نقش پذیر تربیت میں اس کے مستحکم اثرات پیدا کئے جائیں مثلاً اگر مدرسے میں سزا و جزا کا مسئلہ طلبہ کے سپرد کر دیا جائے تو اُس کی بدولت خود اعتمادی، انصاف تدبر، نیک روئیگی جیسے محاسن اخلاق ان میں ضرور پیدا ہوں گے۔ نیز خوف و دہشت کے سبب تعلیمی نقصان اور اخلاقی سقم کے اثر انداز ہونے کا احتمال باقی نہیں رہے گا۔ جو بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ مغرب کے ماہرین تعلیم نے نہایت غور و خوض کے بعد اس طریقے کو اپنے ہاں جاری کیا ہے۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے خود بلدہ میں مولوی سید فخر الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ اس کا تجربہ کرنے کے بعد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ "میں ان جذبات کے اظہار سے قاصر ہوں، جو آزادی کے حصول سے بچوں کے چہروں پر نمایاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی روح پھونک دی گئی ہے بمسرت سے آنکھوں میں رونق۔ گالوں میں سرخی اور ہونٹوں پر احسان مندی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کام تیزی سے ہونے لگا۔ حاضری درست ہو گئی، ہوم ورک وقت پر پورا ہونے لگا۔ جماعت میں خواہ اُستاد ہو یا نہ ہو ضبط قایم رہنے لگا۔ صفائی کا اہتمام ہو گیا۔ بلکہ تمام وہ باتیں جو تربیت و تخویف سے ممکن نہ ہو سکیں وہ ان قیدیوں کو آزادی دے کر حاصل ہو گئیں"۔ مُلّا صاحب نے جن واقعات کا اظہار کیا ہے وہ محض اس بناء پر کہ صاحب موصوف کے آزمودہ ہیں۔ باقاعدگی کے ساتھ جلد اور بہ آسانی حاصل کرنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ اور قابل عمل تدبیر ہے۔ مجلس ہذا سفارش کرتی ہے کہ اس جدید طریقے کو امتحاناً طبقہ فوقانیہ میں جہاں ممکن ہو عملاً نافذ کر کے طلبہ کو متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔

اخلاقی تربیت میں والدین کا حصہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ والدین نے تعلیم

کے ساتھ تربیت کی تمام تر ذمہ داری بھی اساتذہ پر رکھ چھوڑی ہے اور اُن کا اپنا فریضہ صرف اسی قدر ہے کہ بچے کو مدرسے میں داخل کر کے وقتاً فوقتاً تعلیمی مطالبات پورے کر دئے جائیں۔ اور بس۔

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

تربیت اخلاق کے اٹل فریضے سے والدین کا دیدہ و دانستہ گریز کرنا نہ صرف تعجب خیز بلکہ افسوس ناک بھی ہے۔ چنانچہ یگانگی میں بے گانگی کا برتاؤ بالکل بے جوڑ اور مضرت رساں ہے۔ یہ ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس سے جائز طور پر دست کش ہونے میں سخت سے سخت مجبوری اور معقول سے معقول عذر بھی کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خانہ داری کی معمولی ضروریات بھی جن کا سرانجام بالکلیہ نوکر چاکر سے متعلق ہوتا ہے! جب والدین کی ذاتی اور موقتی نگرانی کے بغیر انجام نہیں پا سکتی ہیں تو پھر اپنی عزیز از جان اولاد کی اخلاقی تربیت کا اہم فریضہ اُن کی ذاتی توجہ کے بغیر صرف استاد کی کوشش سے کیوں کر پورا ہو سکتا ہے۔ اگر تربیت اخلاق کے مسئلے میں اُستاد کی حیثیت مثل طبیب کے تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مریض کو پرہیز کرانے کی ذمہ داری تیمارداروں کی بجائے طبیب پر عائد نہیں ہو سکتی۔ مگر جو تیماردار بدقسمتی سے مریض کے پرہیز کو بھی طبیب کے فرائض میں داخل کرتا ہے اور اپنا فرض صرف اسی قدر سمجھتا ہے کہ دوا کی قیمت اور طبیب کی فیس بروقت ادا کر دی جائے تو ایسے مریض کے جانبر ہونے کی کیا توقع ہو سکتی ہے بادی النظر میں قصور تو علاج کا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں پرہیز کی غلطی مہلک ہوتی ہے۔ جو موثر اور مانع علاج کو بھی بے اثر کر دیتی ہے۔ کیوں کہ علاج کے ساتھ پرہیز کو جو اہمیت حاصل ہے وہ بجائے خود علاج ہے۔ یہی حال اخلاقی تربیت کا ہے۔ چنانچہ جب تک والدین کے ساتھ اساتذہ اور اساتذہ کے ساتھ والدین اشتراک عمل نہیں کریں گے طلبہ کی اخلاقی تربیت کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

والدین اور مدرسین میں بالمشافہ یا تحریراً تبادلہ خیالات ضروری ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ والدین ہی کی طرف سے پیش قدمی ہوا کرے۔ خود اساتذہ کو بھی کوئی موقع ضائع نہ کرنا چاہئے۔ اگر ضرورت ہو تو اُن کو مدرسے کے اوقات فرصت میں بیرون مدرسہ جانے اور والدین سے ملنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ اور اشارات تعلیم کی کاپی میں آخر کے چند صفحات صدر مدرس کی

اطلاع کی غرض سے اس کے اجمالی ذکر کے لئے مختص کر دے جائیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا اس سے ایک لازمی فائدہ یہ ہوگا کہ مدرسین میں تبادلہ خیالات کا احساس عام اور اہم ہو جائے گا۔ اور خود والدین کی توجہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ مشہور تہوار اور عیدین کے موقع پر جب کہ والدین کو بھی اطمینان اور فرصت ہوتی ہے۔ مدرسہ کی جانب سے ملاقات کے لئے اجتماع ہوا کرے۔ انجمن طلبہ کے ماہواری جلسوں کی صدارت وغیرہ کے لئے والدین کو بھی مدعو اور آمادہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر ان کے لئے مدرسے کے اوقات ناموزوں ہوں تو یہ آسانی موزونیت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے تین تک دو گھنٹے کا وقفہ دے کر تعلیمی کام کے بعد پانچ بجے سے جلسے کا آغاز کیا جائے۔ اس خصوص میں عام طور پر ایک قابل افسوس حق تلفی یہ دیکھی جاتی ہے کہ مدارس کے سالانہ اور غیر معمولی جلسوں کی صدارت والدین کی بجائے افسران سررشتہ کے سپرد کی جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ جلسے کے نظام العمل میں والدین کا کہیں نام بھی نہیں ہوتا۔ یوں تو ہر مہینہ مدرسے کی جانب سے والدین کو طلبہ کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کی اطلاع دی جاتی ہے تاکہ جو خامی والدین کی توجہ سے رفع ہو سکتی ہے اس کے ارتفاع میں بے جا تاخیر کے سبب مایوسی اور دشواری نہ ہو۔ مگر سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحانات کے بعد اکثر مدارس میں نتائج امتحان صرف طلبہ کو سنا دئے جاتے ہیں اور والدین کو کوئی خبر ہونے نہیں پاتی۔ جہاں اطلاع دینے کا طریقہ رائج ہے۔ وہاں اطلاع کے اطمینان کا ذریعہ مفقود ہے۔ یہ واقعہ کس قدر حیرت خیز ہے کہ مدرسے سے طلبہ کا نام خارج ہوئے مہینوں گذر جاتے ہیں۔ مگر والدین کو علم نہیں ہوتا۔ یوں تو مدرسہ اور اس کی ہر چیز سے والدین کو جائز طور پر استفادہ کرنے میں کوئی امور مانع نہ ہونا چاہیئے۔ مگر خاص کر کتب خانے اور دارالمطالعے سے بلا معاوضہ فائدہ اٹھانے کے ذرائع یہ سہولت تمام فراہم کرنے چاہییں۔ اس میں مدرسے کا نقصان ہی کیا ہے۔ برخلاف اس کے بہت ممکن ہے کہ بعض خوش حال والدین نقد معاوضہ دیں یا کوئی اخبار و رسالہ اپنی طرف سے جاری کرا دیں کتب وغیرہ کی داد و ستد طلبہ کے ذریعہ انجام پا سکتی ہے۔ اس طریقہ عمل میں ایک بڑا فائدہ یہ مضمر ہے کہ تعلیم و تربیت کے متعلق بہت سے مفید مضامین والدین کی نظر سے گزر کر "دیدہ اثرے دارد" کا مصداق ہوں گے۔ والدین اور اساتذہ از دیاد تعلق کے معمولی مواقع مثلاً عیادت، تعزیت، اور مبارک باد وغیرہ ہرگز نظر انداز نہ کریں۔ اگر مدرسے میں یہ طریق رائج کر دیا جائے کہ طلبہ ہر ہفتہ ہوم ورک کی کاپیوں پر والدین سے اطلاع یابی کی دستخط بالالتزام لیا کریں اور مدرس متعلقہ اس کا اطمینان کر لیا کرے تو خود ہوم ورک باقاعدہ اور اشتراک عمل کا

سلسلہ مستحکم اور غیر منقطع ہو جائے گا۔ جن مدارس میں صنعتی تعلیم اور باغبانی کا انتظام ہے اگر وہاں سے طلبہ کی دستکاری کی چھوٹی چھوٹی کارآمد اشیاء اور باغ بانی کے ثمرات کہیں کہیں والدین کو تحفتاً بھیجے جائیں تو یقیناً حق بہ حق دار رسید کا مصداق ہوگا۔ جب کوئی طالب علم کسی بات میں امتیاز حاصل کرے تو اُس سے والدین کو مطلع کرنا بھی مفید ثابت ہوگا اگر مدرسے کے چند مقررہ امتحانات کے اختتام پر طلبہ کی اخلاقی حالت کے متعلق جو مکان کی چار دیواری تک محدود ہو، والدین سے نہایت مختصر لیکن برحقیقت رپورٹ طلب کی جائے۔ اور جماعت میں طلبہ کے روبرو فرداً فرداً پڑھ ہی جائے۔ نیز مدرس صاحب ضروری رہنمائی کے بعد طلبہ کی رائے سے بہترین رپورٹ کا انتخاب کرائیں اور مناسب حال انعام انجمن طلبہ کے جلسے میں تقسیم کرنے کا نہ صرف انتظام کریں بلکہ انعام یافتہ طلبہ کے نام ایک مخصوص تختہ پر جلی اور خوش خط لکھ کر مدرسے کے کسی منظر عام پر آویزاں بھی کر دیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس مفید تدبیر کا ایک ادنیٰ جزو بھی خوش آیندہ اخلاقی نتائج مترتب کرنے سے قاصر رہے گا۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے طلبہ کی غذا سیدھی سادی اور زود ہضم ہونی چاہیئے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو نہایت مرغن یا روکھی پھیکی غذا کھلاتے ہیں غالباً وہ اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے کہ غذا نہ صرف جسم بلکہ اخلاق و خصائل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ غذا کے مقابلے میں لباس کا مسئلہ اگرچہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کی فیشن پسندی و بانے اس کو سب سے زیادہ اہم کر دیا ہے کہ آج کل رنگینی، نزاکت، دل فریبی، شان اور نمایش طالب علموں کے لباس میں کوٹ کوٹ کر بھری نظر آتی ہے۔ اور ناموزوں لباس سے طبیعت میں بہت سی اخلاقی برائیاں مثلاً غرور، حقارت، جائز افعال سے بے جا اجتناب حفظ مراتب سے اعراض وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے ہی طلبہ کا تعلیمی نتیجہ ہر مدرسے میں نسبتاً خراب رہا کرتا ہے۔ غالباً اکثر طلبہ کو والدین کی طرف سے ماہانہ کچھ نہ کچھ جیب خرچ ملا کرتا ہے۔ ضرورت کی چیزیں فراہم کر دینے کی بجائے نقدی حوالے کرنا بعض وقت تخریب اخلاق کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس یقین کی بنا پر کہ جیب خرچ ملے گا قرض لینے کی عادت ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب ان کا بے جا ذوق و شوق بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ توفیر آمدنی کی ناجائز صورتیں پیدا کرنے سے احتراز نہیں کرتے۔ کم از کم اتنی تو احتیاط ضرور ہونی چاہیئے کہ جیب خرچ کے مصرف کے واجبی ہونے کا اطمینان کرلیا جائے تاکہ عدم

باز پرس کے سبب طلبہ کی اخلاقی حالت خراب نہ ہونے پائے اگرچہ طلبہ کا تھوڑا سا وقت
گھر کے نوکر چاکر کی صحبت میں گزرتا ہے مگر خود غرض اور خوشامدی نوکروں کی اتنی ہی صحبت
بھی بہت زیادہ مہلک اثرات پیدا کرتی ہے۔ ایک اور خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ طلبہ
گھر کے نوکروں سے ایسی خدمات بھی لیا کرتے ہیں جن کو وہ خود بلا ہرج کار اور بہ آسانی انجام
دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میں نہ صرف کاہلی پیدا ہوتی ہے بلکہ ناروا حکومت کے خوگر
بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح محلّے کے آوارہ دوست نما دشمنوں کو مخرب الاخلاق صحبت سے
بچوں کو بچانا والدین کا فرض اولین ہے۔ ناٹک اور سینما کے اخلاق سوز نظارے بھی طلبہ
کے اخلاق کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہے ہیں۔ تہذیب جدید کی یہ خانماں برباد وبا اس قدر
عام ہو گئی ہے کہ اگر اس کی حسب ضرورت روک تھام نہ کی گئی تو عجب نہیں کہ یہ ناعاقبت
اندیش یود جادۂ علم سے منحرف ہو کر جہالت و بداخلاقی کی دائمی ضلالت میں مبتلا ہو جائے۔
اور پھر اصلاح حال کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔ والدین ذرا غور کریں کہ اگر طلبہ اپنے مطالعے
اور درس و تدریس کی تیاری کا قیمتی وقت اور ان کی گاڑھی کمائی بے دردی سے صرف
کر کے تنگ و تاریک مقامات میں گھنٹوں مخرب الاخلاق نظارے دیکھا کریں تو اُن
کی صحت اور بصارت کا کیا حال ہو گا اور حصول علم کے سکون و اطمینان طلب کٹھن مرحلے
کیوں کر طے ہوں گے مزید برآں طلبہ اپنے دل و دماغ پر جو اثرات و نقوش لیکر اُٹھیں گے
اُن کا زائل و محو کرنا کس قدر مشکل ہو گا۔ کیا اس خطرناک کشاکش اور اس کے مہلک نتائج سے
اپنی عزیز اولاد کو بچانا والدین کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو کیا اغماض و
خاموشی ہی اس کی عملی صورت اور موثر تدبیر ہے۔ اگر والدین طلبہ کے غیر درسی مطالعے
کی نگرانی اور سامان نوشت و خواند کی جانچ پڑتال کیا کریں تو یقین ہے کہ بہت سی
پوشیدہ خرابیوں کا انسداد ہو جائے۔ اگر کسی کو طالب علم کی تصاویر کا البم دیکھنے کا
اتفاق ہوا ہو تو وہ اس مبنی بر حقیقت بیان کو بے کم و کاست تسلیم کرنے میں ہرگز تامل نہیں
کرے گا کہ اس میں فحش اور ناقابل دید تصاویر بھی موجود ہوتی ہیں جن کو طالب علم نے اپنی پسند
سے خرید کر جمع کیا ہے۔ جس طرح کسی شخص کی خواہش کی چیز کو دیکھ کر اس کے مزاج اور ذوق
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح طلبہ کے البم سے ان کی نوخیز طبیعتوں کی نہایت ناموزوں
اُمنگوں کے سخت خطرناک نتائج کا پتہ لگا سکتا ہے۔ طلبہ کا غیر درسی مطالعہ بھی عموماً

اس قبیل کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ مخرب الاخلاق ناول، عشقیہ قصص، گل و بلبل کے ترانے اور غزلیات کے دواوین اُن کے علمی مشغلے کے اجزائے ضروری ہیں جو بظاہر تو بہت دلچسپ بلکہ علم آموز ہوتے ہیں مگر فی الحقیقت ان میں نہ تو طالب علمانہ دلچسپی کا سامان ہوتا ہے اور نہ اُن سے علم و اخلاق کی معلومات میں ترقی ہوتی ہے بلکہ اُن کی حیثیت اس خوفناک جنگل کی مانند ہے جس میں ہر قسم کے درندے منہہ کھولے بیٹھے ہیں۔ مگر دور سے دکھائی دینے والا جاذب نظر اور سراب نما منظر چند نہتے ناعاقبت اندیش نادانوں کو اپنی طرف مقناطیسی قوت سے کھینچ رہا ہے۔ اس غیر موزوں مشغلے کے زہر آلود اثرات سے اخلاق کے ساتھ تعلیم بھی بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ چنانچہ سائنس و ریاضی اور تاریخ جیسے دلچسپ مضامین سے طلبہ کو کچھ نفرت سی ہونے لگی ہے۔ اور بدقسمتی سے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی طبائع کی یہ ناموزونیت جو خود ان ہی کے کرتوت کا لازمی نتیجہ ہے کوئی فطری نقص ہے۔ عموماً گھر کی بوڑھی بڑی عورتیں خصوصاً چھوٹے بچوں کو قصے کہانیاں سنایا کرتی ہیں جو زیادہ تر مبالغہ آمیز بے نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ایسی کہانیاں عمر بھی سنی جائیں تو اُن سے سیرت و اخلاق کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ بچوں کے اخلاق و آداب درست کرنے کا یہ بھی ایک بہترین اور آسان ذریعہ ہے۔ ہمارے گھروں کے موجودہ طریقہ قصہ گوئی کی اصلاح کی ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ پڑھے لکھے مرد اس قسم کے قصے کہنے سے عورتوں کو نہ صرف منع کیا کریں بلکہ مناسب حال اخلاقی قصص پڑھکر سنایا بھی کریں۔ نیز جو عورتیں خود پڑھ سکتی ہوں اُن کے لئے سوانح اخلاق کا ذخیرہ حسب ضرورت فراہم کر دیں۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ کوئی گھر طریقہ تربیت کی غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ بعض غلطیاں ایسی فاش اور مہلک ہوتی ہیں جن کا اثر مدتوں زائل نہیں ہوتا۔ چنانچہ بچوں کو ڈرانے کا مرض ہر گھر میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ کونسا گھر ایسا ہے جہاں کم سن بچے مختلف آوازوں اور متعدد فرضی ناموں سے نہ ڈرائے جاتے ہوں اخلاقی تربیت میں ڈرانے کا عمل اپنے اندر اتنے مہلک اثرات رکھتا ہے کہ جس کے سبب اور تو اور خود بنائے اخلاق اس قدر کھوکھلی ہو جاتی ہے کہ اس پر نہایت ادنیٰ درجہ کے اخلاق کی عمارت بھی قایم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہ کلیہ ہے کہ جس اصول میں ڈر کو دخل ہو وہ اخلاقی تربیت کا جزو نہیں ہو سکتا۔ اور اگر باقاعدہ طور پر تحقیقات کی جائے تو یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچے بغیر نہیں رہ سکتی کہ دنیا میں جتنی برائیاں پائی جاتی ہیں اُن کی نصف

سے زاید تعداد کا اصل سبب محض دُور ہوتا ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے معصوم ہونہار تربیت کنندگان کی غلط تربیت کے سبب ذمائم اخلاق کی دائمی معصیت میں کس بری طرح مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس بیان کی آخری مگر نہایت ضروری کڑی یہ ہے کہ گھر کی چار دیواری کا اخلاقی ماحول اور خود والدین کے عمدہ اخلاق کا عملی نمونہ بچوں کے لئے ازبس مفید و موثر اور قابل تقلید ہونا چاہیئے مگر افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر گھروں میں باہر سے زیادہ تخریب اخلاق کا سامان موجود ہوتا ہے۔ جس طرح کسی حکیم کے مریض ہو جانے سے اُس کے بیماروں کا علاج اُس سے ناممکن ہوتا ہے، اسی طرح گھر کے زشت خو بزرگ بھی اپنے بچوں کے اخلاق کو عملاً درست نہیں کر سکتے جب تک مکان کی تربیت کا طریقہ درست اور والدین کے عمدہ اخلاق کا نمونہ تقلید نہ ہوگا۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت اساتذہ کی کوشش کے باوجود ادھوری اور ناقص رہے گی۔

اگر ہماری علم پرور اور دریا دل سرکار نیز علم دوست ذی ثروت حضرات طالب علمانہ دلچسپی کے مختلف مفید مشغلے مثلاً سیر و تفریح کے پر فضا باغ کھیل کود کے میدان، ورزشی ساز و سامان، پیراکی کے حوض، تالابوں میں کشتیاں، عجائب خانے، تعلیمات کا نمائش گھر، لکچر ہال، اور لکچروں کا انتظام، دلچسپ اور مفید مشغلوں کا بلامعاوضہ نظارہ، ذرائع آمد و رفت کے کرایہ میں بلا تخصیص ایام و تعداد مناسب رعایت، قابل دید اور تاریخی مقامات کے دیکھنے میں عام سہولت وغیرہ۔ رفتہ رفتہ حسب ضرورت مہیا کردیں تو یقین کامل ہے کہ ایک طرف والدین کے فرائض میں نمایاں طور پر کمی ہو جائے گی۔ اور دوسری جانب خود طلبہ بھی کسی مخرب الاخلاق کشش سے بہ آسانی اور جلد متاثر نہ ہوں گے۔ خدا کرے کہ ہم سب کو اپنی مراد زندگی کا یہ مبارک و مسعود دن جلد از جلد دیکھنا نصیب ہو۔

مدارس میں باغ بانی[1]

مولوی سید محمد شریف صاحب مشہدی ناظر مدارس بلدہ

اے متاع درد در بازارِ جاں انداختہ — گوہر ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ
اے بطبع باغ کون از بہرِ برہان حدوث — طرح رنگ آمیزی از فصلِ خزاں انداختہ

صدر محترم و معزز حضرات و خواتین کرام!

پہلا شعر اپنے مضمون کو ابتر بنانے سے بچانے کے لئے پڑھا ہے اور دوسرے شعر کو میرے آج کے مضمون (مدارس میں باغبانی) سے خاص تعلق ہے۔

چار سال کی عادت کی بنا پر انجمن کی سالانہ رپورٹ بیک دم پڑھ سُنانا اور چیز ہے اور مدرسین کے اس عالی قدر مجمع کے سامنے ایک ایسے مضمون کے متعلق جس کے پتے پتے سے بمصداق (ہر گیاہے کہ از زمیں رُوید ، وحدہ لا شریک لہ گوید) صنعت خدا کا پتہ چلتا ہے۔ آپ جیسے ماہرین فن تعلیم حضرات کے سامنے مجھ ناچیز کی لب کشائی اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرنے کی جرأت یا بے ادبی ہے۔ مگر میں اس کا ارتکاب اس خیال سے کرتا ہوں کہ شائد بعض باتیں جو مضامین نصاب کی تعلیم میں انہماک کی وجہ سے ذہن سے نکل گئی ہوں اُن کی یاد از سرِ نو تازہ ہو جائے۔

بہر حال میں اپنے امکان بھر اپنے خیالات پریشاں کو عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُمید ہے کہ اگر کوئی فروگذاشت ہو تو میری کم مائگی آپ حضرات سے اُس کی عذر خواہ ہوگی۔

وَالْعُذْرُ عِنْدَ كِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ

ایک زمانہ وہ تھا کہ طلبہ کے ذہن کو تعلیم کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور پُوری توجہ اس طرف رہتی تھی کہ طالب علم مضامین نصاب میں ماہر ہو جائے۔ مگر زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ طریقہ تعلیم میں بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے سینکڑوں نہیں تو بیسوں اختراعات ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ برخلاف زمانۂ قدیم کے اب اس اصول پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے کہ مدرس ایک طالب علم کے دماغ میں اپنی معلومات کو منتقل کرنے کے بجائے اُن کے مشاہدے سے کام لے کر اُن کی رہنمائی کرے۔ جو چیز ہو بچہ کے فہم و ادراک

---

[1] یہ مضمون کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔

اور صلاحیت کو پیش نظر رکھ کر کھیل کو دیں اس طرح پیش کی جائے کہ وہ دلچسپی اور رغبت سے اُس کے معلومات کو اخذ کر کے اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکے جماعت کی دلچسپی قایم رکھنے کے لئے لازم ہے کہ مدرس تمام بار خود اُٹھائے اور ہر مضمون کو خاص انداز' نت نئے طریقے' مختلف آلات اور توضیح و تمثیل کے ساتھ پیش کرے۔ تاکہ طلبہ کو اس مضمون کا علم حاصل کرنے میں جہاں تک ممکن ہو کم بار اُٹھانا پڑے۔

دوسری چیز قیام دلچسپی کے لئے جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نظام الاوقات میں مختلف مضامین اول بدل کر رکھے جائیں اور اُن کے ہیر پھیر سے اس طرح فائدہ اُٹھایا جائے کہ طلبہ اُکتا نہ جائیں کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ جب بچوں کو فرصت ملتی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے لئے نکال لیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدرس اُن کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھے۔ عام طور پر مدارس میں طلبہ نظام الاوقات کے بموجب مختلف سبق پڑھتے اور کھیل کے وقت کھیلتے ہیں گھر پر تیاری اسباق (ہوم ورک) سے جو وقت بچ رہتا ہے اُس میں بھی اُن کو کسی ایسے مشغلہ میں لگائے رکھنا ضروری ہے جو اُن کے قوائے جسمانی کی نشو و نما اور ذہنی تربیت میں ممد ہو اور وہ اس کو بخوبی دل لگا کر انجام دیں۔ ایسے مشغلے متعدد ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک باغ بانی ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ طلبہ کو مالی کے پیشہ کے لئے تیار کیا جائے بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ بچوں کو روزمرہ کے استعمال کی عام ترکاریوں مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں کے بونے اور اُن کی غور و پرداخت کے ذریعے اُن کی نشو نما اور فوائد سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ اور اس طرح مطالعہ فطرت کے نامحدود عالم کا دروازہ اُن کے لئے کھول دیا جائے۔ بقول سعدی علیہ الرحمتہ۔

"برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار"

باغ بانی فی نفسہ ایسا کام ہے کہ اس میں دلچسپی بدرجہ اتم موجود ہے اس کے علاوہ اس دلچسپ مشغلہ کا اثر دوسرے مضامین پر اس قدر مفید اور بہتر پڑتا ہے کہ طلبہ نہ صرف باغ بانی بلکہ دوسرے مضامین کے کام کو بھی شوق اور دلچسپی سے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس کے ذریعے سے پودوں' ترکاریوں' پھولوں اور پھلوں کے بونے اور اُن کی نشو و نما' کو برای العین مشاہدہ کرنے اور اُن کے متعلقہ امور پر غور کرنے سے اگر ایک طرف طلبہ کی ذہنی تربیت ہو گی تو دوسری طرف اُن کی عام معلومات میں اضافہ ہو گا۔ اس کے علاوہ بیج بونے کے لئے زمین کی تیاری میں اور پودوں کو پانی دینے میں جو محنت وہ شوق سے برداشت کریں گے وہ خود اُن کے قوائے جسمانی کی نشو و نما میں خوب مدد دے گی محنت میں شوق کی اس واسطے ضرورت ہے کہ جو کام شوق اور

دلچسپی سے کیا جائے اور اُس کے کرنے میں یہ خیال نہ ہو کہ یہ محنت بغرض ورزش کی جارہی ہے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ ایک مشہور عربی مقولہ یہ ہے جو الرفیق۔ ثم الطریق۔ یعنی اگر تفریح یا سیر کے لئے جاؤ تو کوئی خاص مدعا پیش نظر ہو یا کوئی دوست ساتھ ہو مطلب یہ ہے کہ باتوں میں راستہ کٹے۔ اور کسی صورت میں سفر کی مشقت پر خیال نہ جانے پائے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ جب کسی خاص حصہ جسم کے اعصاب کسی ایک کام میں مصروف رہیں اور تکان شروع ہو جائے تو طلبہ کو کسی دوسرے کام میں لگا دینا چاہیئے تاکہ پہلے کام میں جن اعصاب پر بار پڑ چکا ہے وہ آرام لے کر اپنی اصلی حالت پر آجائیں مثلاً ٹائم ٹیبل میں اُردو، ریاضی یا انگریزی کے بعد خطاطی ڈرائینگ وغیرہ اسی غرض سے رکھے جاتے ہیں۔

باغ بانی میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ طلبہ کی تکان اور ان کی طبیعت کے اضمحلال کو دور کر کے ان میں مسرت اور شوق کی رُو دوڑا دے۔ اب یہ مدرس کا کام ہے کہ نصاب کے دیگر مضامین کی تعلیم میں بھی طلبہ کے اس شوق سے فائدہ اُٹھائے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تکان کو دور کرنے والے مشاغل جو اب تک ہمارے مدارس میں رائج ہو چکے ہیں اُن میں باغ بانی کا نمبر پہلا ہے۔ مدرس کو باغ بانی کے وقت ضبط قایم رکھنے کے لئے بھی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اس کا وجود صرف اس حد تک کار آمد رہ جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی رہبری کرے۔ جہاں مدارس میں باغ بانی رائج ہے۔ وہاں اس بات کا تجربہ اور اندازہ کر لیا گیا ہوگا کہ بچے کس شوق سے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ کوئی بیلچہ لئے جٹا ہوا ہے تو کوئی سبل یا پھاوڑے سے بنجر آزما ہے کوئی کھُرپی لئے کلچائی کر رہا ہے تو کوئی پانی دے رہا ہے۔ غرض کہ جماعت باغ بانی کے دلچسپ مناظر حد درجہ مسرت بخش ہوتے ہیں اور مدرس کو ضبط قایم رکھنے میں کسی خاص کوشش یا توجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ آلات کم ہونے کی صورت میں آپس کے جھگڑے ہونا ممکن ہے مگر یہ انتہائی دلچسپی اور شوق کی علامت ہے کہ ہر طالب علم اس کا خواہاں رہتا ہے کہ مجھے کام کرنے کا موقع ملے اگر آلات کافی تعداد میں مہیا نہ ہو سکیں تو باری باری سے چند طلبہ کو کام کرنے کا موقع دینا چاہیئے یا اُنھیں ایسے کام میں لگا دیا جائے جس میں آلات کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً چھوٹی چھوٹی بے کار روئیدگی کا اُکھاڑنا اور اُس کو دور لے جا کر پھینکنا یا پانی ڈالنا وغیرہ۔ الغرض اس قسم کے جھگڑوں کا سدباب اسی طرح پر کیا جا سکتا ہے کہ طلبہ بددل نہ ہونے پائیں۔ اور اُن کے بڑھتے ہوئے شوق کی رفتار

میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہ ہو۔ باغ بانی کے ذریعے سے چھوٹے چھوٹے طلبہ کے اعضا اور پٹھے بخوبی نشوونما پاتے ہیں کھُلی ہوا میں اور درختوں کے آس پاس جہاں آکسیجن کافی مقدار میں ہوتی ہے انہیں دم لینے اور اپنے تمام اعصاب کو حرکت دینے کا موقع ملتا ہے۔ جس سے پھیپھڑے اچھی طرح کام کرتے ہیں کھُلی ہوا میں بلا ارادہ گہری سانس لینے سے خون خوب صاف ہوتا اور اُس کے کثیف اور ردّی مادّے اچھی طرح دور ہوتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ تازہ دم ہو کر ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ بہرحال مجھے اس بارہ میں زیادہ عرض کرنے اور تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں مطلب یہ ہے کہ باغ بانی کا کام ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہے۔

بچے روزآنہ درختوں کی نشوونما کا مشاہدہ تخم ریزی کے بعد سے کرنا شروع کرتے ہیں۔ ننھے ننھے بچوں کے لئے کیا یہ کم مسرّت بخش ہوگا کہ جہاں ایک روز پیشتر صاف زمین تھی۔ دوسرے دن وہاں چھوٹی چھوٹی کونپلیں نظر آنے لگیں۔ اب بتدریج پودے کی نمو اور پھلنے پھُولنے تک جملہ واقعات کا مشاہدہ کیا اثر کرے گا محتاج بیاں نہیں کیوں کہ ہر ایک تبدیلی جو پودوں میں وقتاً فوقتاً ہوگی طلبہ اُس کو دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے۔ طلبہ حسب ضرورت اپنی کیاری کا نقشہ بدلتے رہتے ہیں۔ اگر پودے ایک دُوسرے سے قریب ہوں تو انہیں اُکھاڑ کر مناسب فاصلے پر نصب کرتے ہیں اور اس طرح باغ بانی کے جملہ لوازمات و آلات اُن کے علم میں آجاتے ہیں۔ ہر روز ایک نئی بات کے دیکھنے سے جو ایک جوش طلبہ کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کا اندازہ وہی حضرات کرسکتے ہیں جو اس کام کو خود کرچکے ہوں یا اُنہوں نے طلبہ کو کام کرتے دیکھا ہو۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے جدید نصاب تعلیم میں باغ بانی کو مدرسے کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا گیا ہے۔ نہ صرف جماعت اوّل بلکہ جماعت ہفتم تک سب جماعتوں میں ترکاریوں اور پودوں وغیرہ کے متعلق معلومات کا حاصل کرنا لازمی کردیا گیا ہے بلکہ جماعت سوم سے اوپر تک زمین کی تیاری وغیرہ اور باغ بانی کے اصول سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اب آپ حضرات خود ہی غور فرما سکتے ہیں کہ جب مدرس طلبہ کے سامنے یہ بیان کرے کہ فالسے کے پتے نوک دار اور گول کنگرہ دار ہوتے ہیں، یا کروٹن کی ڈالی کاٹ کر گاڑ دی جائے تو چند روز میں جڑ پکڑ لیتی ہے، ترکاریوں کو کس قسم کی کھاد زیادہ مفید ہے اور پھولوں کو

کونسی ۔ اس طرح کا تجزیہ بیان حقیقت حال کو طلبہ کے ذہن نشین کرے گا یا جب طلبہ بہ ذریعہ باغ بانی خود مشاہدہ کر کے آگاہی حاصل کریں تو یہ امور زیادہ عمدگی سے اُن کے ذہن نشین ہوں گے ۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو مدرسے میں باغ بانی کے متعلق بعض مشکلات دکھائی دیں مگر

"مشکلے نیست کہ آساں نہ شود   مرد باید کہ ہراساں نہ شود"

یا یوں کہئے کہ مشکلات کا حل مشکل نہیں اور ایک اچھا مدرس کسی تعلیمی مشکل کے حل کرنے سے قاصر نہیں رہ سکتا ۔ خیر اب بعض مشکلات بھی غور طلب ہیں ۔

اول زمین کی کمی ۔ اضلاع پر تو اس دقت کا پیش آنا ناممکن سا ہے البتہ بلدہ میں بعض مکانات ایسے ہیں جہاں زمین کی کمی ہے مگر نہ اس قدر کہ دو چار مربع گز زمین بھی میسر نہ آسکے اگر کوئی ایسا مدرسہ ہو جو اوپر کی منزل میں ہو جیسا کہ مدارس تحتانیہ افضل گنج و چوڑی بازار ہیں تو ایسی صورت میں چھت پر دس بیس کونڈے رکھے جا سکتے ہیں اور اس طرح کونڈوں میں موسمی ترکاریوں اور پھولوں کے بیج بو کر بقول (مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ) کام چلایا جا سکتا ہے ۔

دوسری ضرورت باغ بانی کے لئے پانی کی ہے ۔ جب کہ بلدہ کے قریباً سب مدارس میں سقہ مامور اور اکثر مکانات میں نل موجود ہیں اور ایک چھوڑ دو دو خدمتی یعنے چپراسی اور فراش موجود ہیں ۔ تو اس کے متعلق کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی ۔

البتہ تیسری ضرورت سرپرستوں کے اتحاد عمل کی ہے اس کے لئے ہمیں ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ وہ خود بخود ہمارے ہمنوا اور ہم خیال ہو جائیں ۔ چنانچہ ایک مدرسہ میں بہ وقت معاینہ یہ مشکل میرے سامنے ایک مہیب صورت میں پیش کی گئی اس پر میں نے جو کچھ طریقہ بتایا اس پر عمل کرنے سے اس مدرسے میں اب اوپر کی جماعتوں کے قریباً سب طلبہ باغ بانی کا کام بخوشی کرتے ہیں کیوں کہ ان کو باغ بانی کے ثمرہ وغیرہ سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا جاتا ہے یعنے ان کا ایک معقول حصہ وہ اپنے گھر کے استعمال کے لئے لے جاتے ہیں اور سرپرستوں نے کوئی شکایت نہیں کی ۔

طلبہ کا صرف بیج بونا اور تیار ہونے پر ترکاری وغیرہ سے مستفید ہونا کافی نہیں بلکہ مدرس کو چاہئے کہ زمین کی تیاری سے لے کر کھاد دینے، بیج بونے، اس کے اُگنے اور نشو و نما پانے اور تیار ہونے تک جملہ مشاہدات کو وقتاً فوقتاً نوٹ کراتا رہے اور دیکھے کہ طلبہ نے صحیح نوٹ کیا ہے یا نہیں اور اس سے نہ صرف سبق الاشیاء میں بلکہ ہر مضمون کی تعلیم میں مدد لے کیوں کہ

مدارس میں باغ بانی کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ طلبہ کی قوت مشاہدہ میں ترقی ہوتی ہے بلکہ ضمناً اور بھی بہت سی باتیں معلوم کرائی جائیں۔ پھلوں اور پتوں کی شناخت اور رگ و ریشے کے علم سے ڈرائینگ اور دستی مشاغل میں مدد ملتی ہے۔ بیجوں کے اُگنے کی مدت یعنے بونے کے دن سے لے کر اُگنے اور تیار ہونے تک دن، تاریخ اور مہینہ کے ناموں کا علم معلومات عامہ میں اضافہ کرے گا۔ زمین کی قسمیں اُن کی نوعیت اور کھاد دینے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح علم طبقات الارض کی ابتدائی معلومات کی بنیاد پڑ جاتی ہے، جو اس مضمون کی اعلیٰ تعلیم کا سنگ بنیاد ہوگی۔

کیا یہ بہتر نہیں کہ طلبہ کی عمر کے اس ابتدائے دور میں جب کہ اُن میں ہر نقش کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ہر چیز کا تھوڑا سا تصور اُن کے دلوں میں پیدا کر کے اُن کو ایک چسکا لگا دیا جائے۔ مثلاً یہ بات کہ بعض درختوں کو کم پانی کی ضرورت ہے اور بعض کو زیادہ، بعض چیزیں گرمی میں پھولتی پھلتی ہیں تو بعض سردی میں ایسی ہیں کہ اس سے طلبہ کے لئے ایک جداگانہ معلومات کا دفتر کھل جائے گا۔ یعنے موسمی تغیرات، ہواؤں کا تیز و تند چلنا، مینہہ کا برسنا، سورج کا سمت بدلنا غرض بہتیرے دلچسپ مظاہر قدرت ایسے ہیں جو باغ بانی کے ضمن میں سمجھائے جا سکتے ہیں اور علم حوادث سماوی وغیرہ کی تعلیم کی ابتدا کی جا سکتی ہے۔

ایک دوسرا پہلو لیجئے۔ کیا دینیات کی تعلیم میں مدرس کو پودوں کی نشو و نما اور پھولنے پھلنے کے ذریعے سے اُس قادر علی الاطلاق کی قدرت کاملہ کا تصور کما حقہٗ دلانے میں مدد نہیں مل سکتی ہے۔ بے شک مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ مدرس مختلف مضامین میں ارتباط کا خیال رکھے اسی طرح اس قسم کی بیسیوں آیتیں ایسی ہیں کہ اعلیٰ جماعتوں کو ان کی تفسیر اور ترجمہ اچھی طرح سمجھانے میں باغ بانی سے مدد لے جا سکتی ہے مثلاً چھبیسویں پارے میں سورۂ قٓ کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے (وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ) کے ترجمہ میں باغ بانی کا مشاہدہ ممد ہوگا۔ کیوں کہ باغ بانی میں عملی طور پر ایک بے جان بیج سے ایک تناور درخت کے پیدا ہونے اور اُس کے پھولنے پھلنے کے مشاہدہ کے بعد یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ جو قادر مطلق ایک ننھے سے بیج سے درخت پیدا کر کے اُس کے پھلوں

کو اپنے بندوں کا رزق اور اُن کی زندگی کا سبب بنا سکتا ہے اس کے لئے مردہ کو پھر دوبارہ زندہ کرنا مشکل نہیں۔ چنانچہ عرفی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"اے بطبع باغ کون از بہر برہان حدوث — طرح رنگ آمیزی از فصل خزاں انداختہ"

اسی طرح ہر جماعت کی استعداد کے مطابق باغ بانی کے ذریعے وجود اور صفات باری عزاسمہ کا یقین دلایا جاسکتا ہے۔ گویا صرف لفظی تفہیم سے جو علم الیقین حاصل ہوسکتا ہے۔ باغ بانی کے ذریعہ اُس کا عین الیقین حاصل ہوجائے گا۔

دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جدید معلومات کو کسی مانوس اور مرغوب شئے سے منسوب کرکے طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ لطف یہ ہے کہ باغ بانی میں اتنی صلاحیت موجود ہے چنانچہ اس کے ذریعے موسمی تغیرات بہ آسانی سمجھائے جاسکتے ہیں ہاں اتنا ضروری ہے کہ بفحوائے (تکلم الناس علی قدرِ عقولِھم) ہر وقت جماعت کی استعداد فہم کا خیال رکھنا چاہئیے جو باتیں اعلیٰ جماعت کے طالب علم کی سمجھ کی ہیں وہ طبقہ تحتانیہ کے طلبہ کے سامنے بیان کرنا ناموزوں اور تضیع اوقات ہے۔

باغ بانی کے ذریعے سے علم نباتات کی تعلیم باسانی دی جاسکتی ہے۔ پتوں کے رگ و ریشہ جڑوں کی قسمیں سہولت سے سمجھائی جاسکتی ہیں آپ حضرات واقف ہیں کہ علم نباتات کی تعلیم کو موجودہ نصاب تعلیم میں خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے اس لئے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ حضرات کمرہ جماعت میں جملہ مضامین کی تعلیم رُوکھے پھیکے طرز پر دینے کے بجائے باغ بانی کے ساتھ ساتھ اور امور بھی سمجھاتے جائیں مثلاً بھینڈی یا کپاس کا پھول لے لیں اور کھڑے کھڑے اس کا تجزیہ کرکے پتیاں پنکھڑیاں پولن اودری اور نرمادہ حصوں کی شناخت بتلا دیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کمرہ جماعت کی تعلیم کے مقابلے میں کھلی ہوا میں تعلیم دینا زیادہ مفید، دلچسپ اور اطمینان بخش ہوگا۔ اشیا کے خواص کو لیجئے کیا ہی وسیع علم ہے ہم اس کی ابتدا بھی باغ بانی سے کرسکتے ہیں مثلاً بیگن، ترئی، انباڑہ، سیم اور کدو وغیرہ کے فوائد اور مضر اثرات بہ آسانی ذہن نشین کرائے جاسکتے ہیں اور اس کے بعد مختلف ترکاریوں اور جڑی بوٹیوں کے خواص کے جانب بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔

الغرض ماہر تعلیم مدرس جس کی طبیعت میں جدت طرازی کا مادہ ہو اور وہ ہر ایک چیز کو خواہ وہ کسی عنوان سے اس کے سامنے آئے ذریعہ تعلیم بنانا جانتا ہو باغ بانی کے ذریعے

سے بہت سی باتیں طلبہ کے ذہن نشین کر سکتا ہے۔

اقتباس رپورٹ کمیٹی برائے سائنس

یہ سب کمیٹی جو "سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے" کے عنوان پر بحث کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اپنی سفارشات مدارس کے نصاب میں مطالعہ فطرت کے شریک کرنے کی نسبت پیش کرتی ہے۔

مطالعہ فطرت کے مقاصد و اغراض

(۱) قوت مشاہدہ اور استدلال کی تربیت۔

(۲) طلبہ کو فطرت پرست بنانا۔ (خدا کی مخلوق سے اُن کی عظمت کو سمجھکر محبت کرنا زندگی کے شریف ترین مقاصد میں سے ہے)

(۳) طلبہ کے جبلت اُن کی خو اور استفسار کے قوت کا نشو و نما پانا۔

مطالعہ فطرت کی وسعت چھوٹے لڑکے غیر ذی روح چیزوں میں دلچسپی نہیں لیتے اس لئے ابتدائی جماعتوں میں علم ہیئت، علم حوادث سماوی اور ارضیات کا مطالعہ ترک کر دینا چاہیئے۔ مطالعہ فطرت کے باقی دو شعبے نباتیات اور حیوانات نصاب میں داخل ہوں گے۔ اُن میں سے بھی خورد بینی خلوی اجسام ترک کر دیئے ہوں گے۔

مطالعہ فطرت کا معلم معلم سائنٹیفک ٹریننگ حاصل کر چکا ہو۔ علم حیوانات اور نباتات کے اصول سے اچھی طرح واقف ہو۔ معلم کو کتابی معلومات پر اکتفا نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ مشاہدہ کا شوق پیدا کرے اور اپنی کتابی علم کا اطلاق اطراف و اکناف کے زندہ مثالوں پر کر کے اس کو ترقی دے اور لطف اندوز ہو۔

لے۔ یہ رپورٹ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھی جس کا اقتباس شائع کیا جاتا ہے۔ اصل رپورٹ بھی آئندہ کسی اشاعت میں پیش کی جائیگی۔

(۲) مدارس فوقانیہ میں ابتدائی سائنس کے نصاب کی ترمیم کی سفارش اور وجوہ :۔

مدارس فوقانیہ اور وسطانیہ کے سائنس کے نصاب میں صرف طبیعات اور کیمیا داخل ہے۔علوم فطرت کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ ان علوم سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور یونیورسٹی میں جاکر ان مضامین کے لینے سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے طبیعات اور کیمیا کے ساتھ علوم فطرت کا بھی نصاب میں داخل ہونا ضروری ہے۔ ان علوم کی تعلیم طبیعات اور کیمیا سے قبل ہونی چاہئے۔ ان کی مدد سے نہ صرف سائنٹیفک تخیل کی تربیت ہوگی بلکہ طلبہ کو اعلیٰ جماعتوں میں اپنے مذاق کے لحاظ سے مضامین کے انتخاب کرنے کا صحیح موقع ملے گا۔ انہیں امور نے مدارس ایچ ۔ ایس ۔ ایل سی ۔ بورڈ کو سنہ ۱۹۲۷ء و سنہ ۲۸ء میں متوجہ کیا اور قابل اساتذہ کی کمیٹی نے اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرکے علوم فطرت کو ابتدائی سائنس کا ایک جزو بنانے کی تائید کی۔ چنانچہ ایک نصاب تیار کیا گیا جس میں طبیعات اور کیمیا کو گھٹا کر ان مضامین کو داخل کرنے کی گنجائش پیدا کی ہے۔ اس مرممہ نصاب کے تحت پہلا سرکاری امتحان مارچ سنہ ۳۱ء میں لیا گیا ہے۔ اس لئے ہم طبقہ فوقانیہ کے نصاب میں علم حیوانات، نباتات، عضویات، حفظان صحت اور فوری امداد کے شریک کرنے کی سفارش کرتے ہیں اس مطلب کو پورا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مدارس ایچ ۔ ایس ۔ ایل ۔ سی کے نصاب کو اختیار کیا جائے۔

طریقہ تعلیم سائنس سب سے پہلے طلبہ کے دلوں میں سائنس کے متعلق دلچسپی اور رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اس مطلب کے لئے وہ پرانا طریقہ جس میں سائنس کی ابتداء، مادہ کی تین مختلف حالتوں اوزان پیمانے اور ضوابط سے کی جاتی ہے ترک کردینا چاہئے۔ سائنس کی ابتدا کسی دلچسپ اور حیرت انگیز تجربے سے کی جائے تاکہ طلبہ کے خوابیدہ شوق کو تحریک ہو۔ کسی اصول کے تفہیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس اصول کے متعلق کوئی کل یا کوئی چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں پائی جاتی ہو بتائی جائے اور پھر اس کی مدد سے اصول دریافت کیا جائے تو یہ روکھا پھیکا اصول اپنے اندر ایک قسم کی دل آویزی اور کشش پیدا کرلے گا اور طالب علم اس کو نہایت شوق سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔

عملی کام عملی کام کا اصل مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں سائنس کے آلات کو مہارت اور صحت کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت پیدا ہوجائے اور کم سے کم وقت میں تجربہ کرکے قابل اعتماد نتائج حاصل کرسکیں۔

تقریباً چھ مضامین کے ساتھ آسانی سے تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے۔

ارتباط (۱) ڈرائینگ۔ دوسرے اور اشیا کی طرح سائینس کے آلات کی شکلیں صحیح تناسب اور تشکیل کے ساتھ ڈرائینگ کی جماعت میں اتارنا بتایا جائے۔

(۲) جغرافیہ۔ ارضیات، علم حوادث سماوی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ نہایت آسانی سے لایا جاسکتا ہے۔

(۳) انگریزی۔ کسی اصول کی تفہیم یا سیر و سیاحت کیمیائی کارخانوں یا گرنیوں کے معاینہ کے بعد ان پر مضامین لکھنے کے لئے دئے جاسکتے ہیں پھر انگریزی کا مدرس زبان کے لحاظ سے اور سائنس کا مدرس مضمون کے لحاظ سے ان کی جانچ کرے تو انگریزی اور سائنس دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(۴) ریاضی۔ درسی کتب کے امثلہ طلبہ کو حل کرنے کے لئے دینے کے بجائے دارالتجربہ کے نتائج اور مقادیر پر سوالات دئے جاسکتے ہیں کیوں کہ اس صورت میں دلچسپی کا عنصر رہتا ہے۔

(۵) تاریخ۔ تاریخ کا مدرس وقتاً فوقتاً مشاہیر سیاست اور مذہب کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصر علمائے سائنس کا ذکر کردیا کرے تو طلبہ کو دنیاوی ترقی کے مکمل حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔

(۶) مذہب۔ مظاہر قدرت جہلا کی سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے توہم پرستی کا باعث ہوجاتے ہیں۔ سائنس کی مدد سے مذہب کو توہم پرستی سے پاک کیا جاسکتا ہے۔

عمدہ ارتباط کا اثر مدرس متعلقہ پر ہر مدرس کو چاہئے کہ سائنس کے ہر شعبہ سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلے اس کے بعد وہ محسوس کرے گا کہ اپنے مضمون کے درس میں کتنی آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور کس سہولت سے وہ طلبہ کی غلط فہمیاں اور شبہات کو دور کرسکتا ہے۔

رپورٹ نمائش تعلیمی بابتہ سنہ ۱۳۴۰ف
متعلقہ اجلاس پنجم کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

مولوی نظیر حسین شریف صاحب معتمد نمائش کمیٹی

جناب صدر خواتین کرام و حاضرین عظام!

میں آپ حضرات کے روبرو جس فریضہ کے ادا کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں اُسے آپ نے پروگرام میں ملاحظہ فرمالیا ہے۔ الحمد للہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن کے ساتھ حسب سابق نمائش تعلیمی بھی منعقد کی گئی۔ اگرچہ سامان کے داخلہ کے لئے تواریخ ۲۱/۲۲/۲۳/ مقرر تھیں۔ لیکن اکثر مدارس سے اشیائے نمائش تاخیر سے وصول ہوئیں، جس کی وجہ سے اُن کی ترتیب اور دیگر انتظامات میں بے حد دشواریاں پیش آئیں۔ اُمید ہے کہ صدر مدرس صاحبان آیندہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ فرمائیں گے۔

اس سال جملہ (۴۷) مدارس ذکور و اناث بلدہ و سکندرآباد سے سامان تیار کردہ مدرسین و طلبہ وصول ہوا۔ بہ مقابلہ سال گذشتہ تین مدارس کی زیادتی رہی جملہ (۱۵۱۰) اشیاء داخل نمائش ہوئیں۔ اس میں بہ مقابلہ سال گزشتہ (۵۳۵) کی بیشی ہوئی۔ جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مدارس میں دستی مشاغل کی تعلیم کی جانب خاص خیال پیدا ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اسی طرح آئندہ بھی خیال رکھا جا کر نمائش کو اس سے زیادہ کامیاب بنانے کی سعی فرمائی جائے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سال گزشتہ اشیاء نمائش پر فی شئے (ار) فیس داخلہ لگائی گئی تھی لیکن سال حال حسب تصفیہ صدر کمیٹی انجمن یہ عمل موقوف کر دیا گیا۔ حسب قرارداد مجلس انتظامی انجمن اساتذہ مس ویسٹر صدر معلمہ سینٹ جارجز گرامر اسکول پرائمری ڈپارٹمنٹ نمائش تعلیمی کی میر مجلس مقرر کی گئیں۔ مس موصوفہ ہر ممکن طریق سے وقت بے وقت تکلیف فرما کر اس کام میں دلچسپی لیتی رہیں۔ جس کے لئے میں منجانب کمیٹی نہایت جوش کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تصفیہ انعامات کے لئے حسب قرارداد مجلس انتظامی مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل سٹی کالج مولوی عزیز علی صاحب گورنمنٹ آرکیٹکٹ، ریورنڈ مسٹر کلارک اور مسز جبار رضا صاحبہ صدر معلمہ

زنانہ ٹریننگ اسکول بلدہ وسس پارکر صدر معلمہ متیھوڈسٹ ہائی اسکول کو تکلیف دی گئی۔ اصحاب ممدوح نے ازراہ نوازش اشیاء کی تنقید بہ لحاظ عمر و طبقہ و جدت طبع فرمائی چنانچہ (۴۰) انعامات درجہ اول مدارس ذیل کے لئے مشخص کئے گئے:۔

	مدارس	تعداد انعام		مدارس	تعداد انعام
۱	زنانہ کالج نام پلی	۵	۱۲	مدرسہ فوقانیہ دار العلوم	۱
۲	ٹریننگ اسکول بلدہ	۴	۱۳	محبوب کالج سکندر آباد	۱
۳	سینٹ جارجس گرامر اسکول	۳	۱۴	اے۔وی۔ اسکول بلارم	۱
۴	ویسلین مشن ہائی اسکول سکندر آباد	۲	۱۵	مدرسہ نسوان وسطانیہ مچھلی کمان	۱
۵	آل سنٹس ہائی اسکول	۲	۱۶	،، تحتانیہ سلطان شاہی	۳
۶	مدرسہ فوقانیہ نام پلی	۲	۱۷	عثمانیہ ٹکنیکل اسکول سکندر آباد	۱
۷	،، وسطانیہ کاچیگوڑہ	۲	۱۸	سرولیم بارٹن ٹکنیکل اسکول ،،	۱
۸	،، فوقانیہ دار الشفاء	۱	۱۹	مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ	۱
۹	اسٹانلی گرلز ہائی اسکول	۱	۲۰	خادم المسلمین	۱
۱۰	نظام کالج	۱	۲۱	سرکل ڈرائنگ ماسٹر مدارس امدادی	۱
۱۱	اکسلسیر اسکول	۱			

مظاہرۂ اسکوٹس

(۲۲) سینٹ جارجس گرامر اسکول ۳ (۲۳) افضل شاہی روورز ٹروپ ۱

جملہ ۴۰

بتاریخ ۲۶ امرداد ۱۳۴۰ف بفضلہ تعالیٰ اجلاس کانفرنس سے قبل عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر نے حسب پروگرام نمایش کا افتتاح فرمایا۔ صاحب ممدوح نے ہر ایک شئے کو نہایت غور کے ساتھ ملاحظہ فرما کر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور ایک تصویر حضرت بندگان عالی بھی خرید فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی۔ دوسرے روز بتاریخ ۲۷ صدر محترم نے اپنے دست مبارک سے انعامات تقسیم فرمائے۔

عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات نے ۲۸ امرداد کو کمال مہربانی سے ایک دن کی تعطیل

منظور فرمائی تاکہ مدارس کے طلبہ نمایش سے مستفید ہوسکیں۔ چنانچہ اُس روز مدارس بلدہ وسکندرآباد کے طلبہ صبح سے شام تک جوق جوق آتے اور نمایش دیکھتے رہے۔ جن کی جملہ تعداد تخمیناً ۵۰۰۰ ا رہی۔ حسب فرمایش جناب پرنسپل صاحب سٹی کالج بروز یکشنبہ خاص طور پر کالج مذکور کے طلبہ کو نمایش کے دیکھنے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ ۸ تا ۱۰ صبح اور ۴ تا ۶ شام جملہ (۱۴۰۰) طلبائے کالج نے معائنہ کیا۔
بروز دوشنبہ حسب قرارداد مستورات کے لئے پردہ کا اہتمام کیا گیا تھا مس ڈی۔ ولسٹر پریسیڈنٹ نمایش نے باامداد دیگر یوروپین و پارسی معلمات خاص انتظام رکھا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے شام کے لیڈی امین جنگ بہادر دامت اقبالہا نے کمال نوازش سے نمایش کا افتتاح فرمایا۔ معلمات وطالبات مدارس بلدہ وسکندرآباد کے علاوہ معزز بیگمات نے نہایت مسرت کے ساتھ نمایش ملاحظہ فرمائی۔ ماشاءاللہ اس روز کا منظر ایک خاص کیفیت رکھتا تھا۔ سٹی کالج کا سارا کمپونڈ موٹر۔ بگی۔ ٹمکرام اور ہر قسم کی سواریوں سے محض تماشا بنا ہوا تھا۔ جملہ ناظرات کی تعداد تخمیناً (۳۰۰۰) تھی۔ پردہ کا اہتمام نہایت اطمینان بخش رہا۔ اندرونی انتظام جو مسز ولسٹر اور دیگر یوروپین خواتین کے تفویض تھا قابل ستایش رہا۔ اگرچہ ۷ بجے شب کے نمایش کا معاینہ بند کیا گیا لیکن سواریوں کی واپسی ۸½ بجے شب کے ختم ہوئی۔

بیرونی انتظام کا بیڑا مولوی سید خیرات علی صاحب مددگار صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے اُٹھایا تھا جنھوں نے باامداد مقامی پولس سواریوں کی آمد و رفت کے انتظام میں سرگرم رہ کر اس کام کو کامیاب بنایا۔

میرا یہ فریضہ ہے کہ سب سے پہلے جناب مولوی سید محمدؐ اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج کا شکریہ ادا کروں صاحب موصوف نے حسب سابق بکمال مہربانی سال حال بھی نمایش کے لئے نہ صرف عمارت کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ ہر ایک موقتی کام میں اپنی قیمتی رائے سے مدد فرما کر نمایش کو کامیاب بنانے میں حصّہ لیا۔

آخر میں ان مدرسین صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نمایش کو کامیاب بنانے میں ہر طرح سے میری مدد فرمائی۔

رپورٹ کارگزاری

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ بابتہ سال مختتمہ امرداد ۱۳۴۰ف

مولوی سید محمد شریف شہدی صاحب معتمد عمومی انجمن

صدر محترم۔ معزز حضرات و خواتین کرام!

الحمد للہ کہ یہ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ ساڑھے چھ سال سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پوری کوشش کر رہی ہے۔ اب اس کی عمر کے ساتویں سال کے آغاز میں ہم یہ پانچویں سالانہ کانفرنس منعقد کر رہے ہیں، اور بعض اہم تعلیمی امور پر بحث کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

گذشتہ دو سال میں کانفرنس کا کام حسن مفید طریقے پر انجام دیا گیا تھا' اس کو اور زیادہ موثر بنانے کے لئے گذشتہ کانفرنس میں ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔ کہ آیندہ یعنی (اس کانفرنس میں) ان مضامین پر رپورٹیں پیش ہونگی (۱) سائنس' (۲) مدارس میں اخلاقی تعلیم' (۳) ڈرائینگ' چنانچہ سال تمام کے پروگرام ماہانہ جلسوں کے لئے وہی مضامین رکھے گئے جو ان تینوں مضامین سے تعلق رکھتے تھے' تاکہ دوران سال میں اراکین انجمن کو ان مضامین پر ہر مرکز میں بخوبی تبادلہ خیالات کا موقع ملے۔ اس کے علاوہ ہر سہ مضامین پر ایک رپورٹ تیار کر کے اس کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے اس فن سے خاص دلچسپی رکھنے والے ماہر مدرسین کی ایک جداگانہ کمیٹی مقرر کی گئی' ہر مرکز کے جلسوں کی روئیداد یں کمیٹی متعلقہ کے حوالے کی گئیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اوائل ۱۳۴۰ف میں طاعون کی وجہ سے مختلف مدارس بند رہے' جس کی مدت بہت سی صورتوں میں چار ماہ تک پہنچ گئی' جہاں تعلیم کا بے حد ہرج ہوا' وہاں اس انجمن اساتذہ کی کارگزاری میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ چنانچہ صرف دو رپورٹیں یعنی سائنس' اور مدارس میں اخلاقی تعلیم کے متعلق اراکین انجمن غور کر سکے اور ڈرائنگ کے متعلق رپورٹ مرتب نہ ہو سکی۔ اول الذکر ہر دو مضامین کے متعلق کمیٹیوں کی مرتب کردہ رپورٹیں جن پر ان مضامین کی تعلیم دینے والے حضرات بھی ایک ایک جداگانہ جلسہ میں اظہار خیال فرما چکے ہیں' حسب پروگرام اس کانفرنس میں بہ غرض منظوری

پیش ہوں گی۔

گذشتہ کانفرنس میں آپ نے "تعلیم جغرافیہ" "تعلیم تاریخ" اور "تعلیم علمی ریاضی" کی جو رپورٹیں منظور فرمائی تھیں، وہ بغرض کارروائی مناسب بتوسط عالی جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات مستقر بلدہ صدر دفتر نظامت پر پیش کردی گئیں۔ اُمید ہے کہ ان پر حسب خواہش کارروائی ہوکر رہے گی۔

شاخ ہائے انجمن سال زیر رپورٹ میں انجمن کی شاخوں کی تعداد میں جو (۱۴) ہے کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

اراکین انجمن انجمن ہذا کی رکنیت مدارس شاہی لوکلفنڈ و امدادی کے مدرسین پر حسب قواعد انجمن لازمی ہے۔ اس لئے ۱۳۴۹ف کے ختم پر چونکہ نو مدارس کو جدید امداد جاری ہوئی اور دو مدارس امدادی بند ہوئے اور اب ایک مدرسہ تحتانیہ وسطانیہ ہوگیا ہے۔ اس لئے کل تعداد اراکین میں تقریباً (۲۵) کا اضافہ ہوا ہے، اس طرح اب کل اراکین کی تعداد (۱۱۲۵) ہے، مگر ساتھ ہی جو حضرات حسب دفعہ (۴) ضمن (ب) قواعد انجمن رکن انجمن ہیں، اُن کی تعداد (۳۰) سے بڑھ کر (۳۶) ہوگئی ہے۔

مرکزانتظامی کمیٹی کے جلسے سال زیر رپورٹ میں حسب ضرورت مرکزی انتظامی کمیٹی کے (۴) جلسے ہوئے، جن میں قبل از وقت ماہانہ جلسوں کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اور ترتیب موازنہ و انتخاب عہدہ داران ۱۳۴۰ف و تقرر تنقیح کنندگان حساب انجمن اور منتخب مضامین کانفرنس کی ذیلی کمیٹیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیز حسب معمول نمائش کمیٹی، استقبالیہ کمیٹی اور پروگرام کمیٹی کے تقرر سے کانفرنس کے کام میں سہولت پیدا کی گئی۔

معمولی ماہانہ جلسے سال زیر رپورٹ میں انجمن کے مرکزوں میں حسب ذیل آٹھ مضامین پر بحث ہونا مقرر کیا گیا تھا، جو سب کے سب اُن تینوں مضامین سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا اعلان گذشتہ کانفرنس میں کیا گیا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ اراکین انجمن سال تمام کانفرنس کا کام کرتے رہیں۔

(۱) جماعت ہائے تحتانیہ میں تعلیم مطالعہ قدرت مع سبق نمونہ۔

(۲) سائنس بلحاظ تعلق کاروبار زندگی۔

(۳) نصاب تعلیم میں عضویات اور حفظ صحت کا درجہ۔

ان تینوں مضامین کے مباحث کا خلاصہ سائنس کمیٹی کے حوالہ کیا گیا۔

(۴) اخلاقی تربیت جماعت میں، گھر میں اور دار الاقامہ جات میں۔

(۵) میدانی کھیل بلحاظ ذریعہ تربیت اخلاق۔

(۶) بائی اسکوٹنگ بلحاظ ذریعہ تربیت اخلاق۔
ان تینوں مضامین کے مباحث کا خلاصہ تربیت اخلاق کی کمیٹی کے حوالے کیا گیا۔
(۷) ڈرائنگ طلبہ کو قدرتی اشیا کی قدر کرنا سکھانے کا ذریعہ۔
(۸) ڈرائنگ اور دوسرے مضامین کا باہمی تعلق۔
یہ دونوں مضمون ڈرائنگ کے متعلق تھے مگر افسوس کہ بوجہ طاعون بعض مدارس کے چار چار ماہ ماہ تک بند رہنے کی وجہ سے ان دونوں مضامین پر سب ارکین پوری طرح تبادلہ خیالات نہ فرما سکے۔ اس طرح بعض مرکزوں میں بجائے (۸) کے چھ یا سات ماہانہ جلسے ہی ہو سکے۔ بہر حال کانفرنس کا کام جہاں تک مقامی حالات نے موقع دیا سال بھر ہوتا رہا۔

عام جلسے سال زیر رپورٹ میں انجمن کا کوئی عام جلسہ نہیں ہوا' اور نہ اس کے لئے مرکزی انتظامی کمیٹی نے کوئی تجویز کی تھی۔

انجمن امداد باہمی انجمن امداد باہمی جو اس انجمن کی تحریک پر دفتر صدر مہتممی تعلیمات مستقر بلدہ میں گذشتہ سال قائم ہوئی تھی۔ اس کے اراکین کی تعداد سال زیر رپورٹ میں (۹۴) سے بڑھ کر (۶۶) ہو گئی ہے' اور اکثر اراکین انجمن اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

دیگر (۱) سال زیر رپورٹ میں آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز (کانپور) نے اپنی سالانہ کانفرنس کو آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس میں جو زمانہ کرسمس بمقام بنارس منعقد ہوئی ضم کر دیا۔ اس میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و میر مجلس انجمن ہذا' مولوی سید فخر الحسن صاحب (ملا) بی۔ اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ و مولوی عبد النور صاحب صدیقی بی۔ اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء اور مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی پرنسپل دار العلوم کے شریک کانفرنس ہونے کی تجویز ہوئی تھی مگر مولوی سید ظہور علی صاحب بعض سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ باقی تینوں حضرات شریک ہوئے۔
(۲) انجمن کی لائبریری کے لئے سال زیر رپورٹ میں مبلغ (ما) کی مزید کتب سرمایہ انجمن سے خریدی گئیں' اور اس کے علاوہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی سے کتب خریدنے کے لئے الـ ـہ ہزار یکمشت اور ما ماہانہ کی منظوری فرمائی گئی ہے۔ انجمن کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ اب امید ہے کہ وہ دقت جو سب کمیٹیوں کو مضامین مفوضہ پر رپورٹ مرتب کرنے میں پیش آتی تھیں ایک حد تک کم ہو جائیں گی۔

(۳) ممالک محروسہ سرکار عالی کی ایک صدر انجمن کے قیام کا مسئلہ ابھی زیر غور ہے۔ امید ہے کہ جب جملہ اسمات سے اُس کے متعلق آرا صدر دفتر میں وصول ہو جائیں گی تو صرف بلدہ کے مدرسین کے بجائے جملہ مدرسین ممالک محروسہ کا تعلق آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز کے واسطے سے ورلڈ فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز سے ہو جائے گا۔

(۴) انجمن ہذا کی امداد کے لئے جو درخواست سرکار سے کی گئی تھی، وہ سال زیر رپورٹ میں بھی بارآور نہیں ہوئی۔

(۵) انجمن ہذا کی گذشتہ کانفرنسوں میں جو تحریکات منظور ہوئی تھیں اُس کے متعلق جو کچھ کارروائی ہوئی، اُس کی تفصیل تجدید تحریکات کے ضمن میں بیان کی جائے گی۔

انجمن کی مالی حالت

گذشتہ رپورٹ میں عرض کیا گیا تھا کہ ۱۳۳۸ف کے آخر خزانہ انجمن میں (الما‌ســہ ہزار) روپے باقی تھے ۱۳۳۹ف میں چندہ آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز و مصارف سفر نمایندگان کانفرنس کے علاوہ امداد رسالہ پر مبلغ (سما) روپے الونس و صادر پر (ما‌الحہ) اور مصارف کانفرنس و نمایش پر (ما‌لولـہ) روپے صرف کرنے کے بعد ختم ۱۳۳۹ف پر خزانہ انجمن میں مبلغ (ہما‌ہولــہ) روپے موجود تھے۔ رسالہ انجمن (حیدرآباد ٹیچر) نے اپنی عمر کے پانچ سال پورے کر لئے ہیں، اور وہ برابر آن بان سے نکل رہا ہے۔ اس کے حلقہ ادارت میں اہم تغیر نہیں ہوا ہے، البتہ جناب سباسٹین صاحب جو ولایت تشریف لے گئے ہیں اُن کا کام باقی حضرات یعنے ریورنڈ فلپ، مولوی عبدالنور صاحب صدیقی اور مولوی سید فخرالحسن صاحب، حسب سابق نہایت ایثار سے اس رسالہ کی خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

اس رسالہ کے متعلق ہر سال مجھے یہ عرض کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے یا یُوں کہئے کہ واقعات کی بنا پر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ رسالہ ابھی تک انجمن کی امداد سے مستغنی نہیں ہوا، اور محض مدرسین کے فائدہ کے لئے نقصان سے چلایا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کی طرف سے مدارس ثانویہ و عہدہ داران کے لئے جو (۱۰۶) نسخے خریدے جاتے ہیں اُن کے علاوہ ممالک محروسہ کے قریباً دو ہزار مدارس تحتانیہ شاہی و لوکلفنڈ میں سے بلدہ و اطراف بلدہ کے مدارس شاہی و امدادی کے علاوہ صرف ضلع پربھنی کے (۲۰) گلبرگہ شریف کے (۶۷) عثمان آباد کے (۲۴۲) نلگنڈہ کے (۶۴) میدک کے (۵۴) کریم نگر کے (۴۵) ناندیڑ کے (۳۶) رائچور کے (۲۲) بیدر کے (۱۶) ورنگل کے (۴۶) آصف آباد کے (۳۱) اور

نظام آباد کے (۴۹) مدارس یعنے جملہ (۴۷۵) مدارس کے لئے رسالہ مذکور خریدا جارہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ حضرات عہدہ داران سقتدر مابقی مدارس تحتانیہ شاہی و لوکلفنڈ کے لئے بھی خریدنے کے طرف توجہ فرمائیں اور مدارس امدادی تحتانیہ وثانویہ کو بھی اس رسالہ کی خریداری کے لئے توجہ دلانے کی زحمت فرمائیں۔ چونکہ اضلاع اورنگ آباد، بیڑ، محبوب نگر کے مدارس تحتانیہ میں سے کسی کے لئے ابھی تک یہ رسالہ نہیں خریدا گیا۔ اس لئے ان اضلاع کے معزز عہدہ داروں کی خاص توجہ فرمانے کی ضرورت ہے، نیز اراکین انجمن اور دوسرے حضرات صرف اپنے مدرسہ میں وصول ہونے والے نسخے پر اکتفا نہ کرکے اپنے لئے ذاتی طور پر ایک ایک رسالہ خرید فرماکر اپنے خانگی کتب خانہ میں اس علمی ذخیرہ کو محفوظ فرمائیں۔ اس کے بعد ممکن ہے کہ رسالہ انجمن کی امداد سے مستغنی ہوجائے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ ع۔

ہر آنکہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید   زجام دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے قیام انجمن سے اب تک کانفرنس میں کسی نہ کسی تعلیم سے شوق رکھنے والے معزز صاحب یا کسی سرگرم رکن انجمن کے انتقال پر اظہار افسوس کرنا پڑتا ہے، چنانچہ سال زیر رپورٹ میں اگر بلدہ و اطراف بلدہ کے متعدد اراکین انجمن نے گذشتہ طاعون میں انتقال کیا ہے تو دوسری طرف ہماری انجمن کے پرجوش رکن، جن کی اپنے طرز خاص کی تقریریں آپ حضرات کو یاد ہوں گی یعنی مولوی عبدالسلام صاحب ناظر مدارس بیدر چھ گھنٹے ہیضہ میں مبتلا رہکر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ مرحوم کو عام طور پر اصلاح ملک کا جو خیال رہتا تھا، اس کی مثال اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے انتقال سے قریباً دو ہفتہ پہلے جو خانگی کارڈ مجھے لکھا تھا اس میں پوچھا تھا کہ یاقوت پورہ اور دبیرپورہ کے پاس سے سیندھی کی دوکانیں اٹھی یا نہیں، الحمدللہ مرحوم کی یہ خواہش ان کے انتقال کے بعد پوری ہوگئی۔

اب میں آخر میں عالی جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب والا نے باوجود اپنے اہم فرائض کی ذمہ داریوں کی کثرت کے صدارت کانفرنس کو قبول فرماکر مدرسین بلدہ کی عزت افزائی فرمائی۔ میں قلب صمیم سے دعا کرتا ہوں کہ یہ انجمن اساتذہ اسی طرح ملک کی تعلیمی خدمات مدت مدید تک انجام دیتی رہے، اور اس کے اراکین کا خلوص اور جوش عمل اہل ملک کو زیور علم و ہنر سے آراستہ کرکے ان کو ملک و مالک کا وفادار اور خیرخواہ بنانے میں

کامیاب ہو اور ہمارے آقائے ولی نعمت قدر قدرت تاجدار دکن سلطان العلوم حضور پرنور بندگان عالی متعالی مدظلہٗ العالی کا سایہ عاطفت ہمارے سر پر تا دیر قایم رہے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

صدر مدرس

جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ٹی منصرم صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف بلدہ

ذیل میں وہ معرکۃ الآرا مضمون درج کیا جاتا ہے، جو ممدوح نے سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ میں پڑھا تھا غریب صدر مدرس کا حقیقی مرقع پیش کر کے موصوف نے کہیں چٹکیاں لیں تو کہیں گدگدا دیا۔ اسلوب بیان دلکش اور مذاحیہ فقروں سے مملو ہے پند و موعظت کی تلخی اور ظرافت کی چاشنی کو ایسا امتزاج دیا گیا ہے کہ حاضرین جلسہ اب بھی جب کبھی ذکر آیا چٹخارے ہی لیتے نظر آئے۔ (ذکریک)

عام غلط فہمی اور اسکی تردید غیر تعلیمی حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جوں ہی مدرس صدارت مدرسہ کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہوتا ہے۔ اُس کے مصیبت کے دن ختم ہوتے اور اچھے دن پلٹتے ہیں۔ جی میں آیا تو غیر رسمی تعطیل منالی ورنہ کام کبھی کیا تو کیا۔ کہ جماعتوں کا ایک چکر لگا کے اطمینان کر لیا کہ مدرسین برابر اپنا کام انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ آرام کرسی پر بیٹھے مراسلوں پر دستخطیں کر دیں۔ یا طلبہ کے والدین اور مدرسین سے باتیں کیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ مدرسہ کے چپراسی فراش حلقہ بہ گوش غلام ہیں۔ اس سے بڑھ کر مبالغہ آمیز کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے صدر مدرس جو کام کو یوں ہی چلا لیں تو نہ اُن کی وقعت ہوتی ہے اور نہ وہ ہر دلعزیز بنتے ہیں۔ اگر مدرس کی حیثیت سے اُس نے ہر تعلیمی ساعت میں جان ڈال دی تو صدر مدرس کی حیثیت سے ہر لمحہ نعمت ہے۔ بُستان اطفال کے نوشگفتہ غنچوں کی نگہداشت، اُن کی تعلیم اور مدرسہ کا نظم و نسق ایسے جھمیلے ہیں جس سے صدر مدرس کو مطلقاً فرصت نہیں ہوتی۔ اگر مدرسہ میں اس کی تنخواہ سب سے زیادہ ہے تو اُسی مناسبت سے اُس کو سب سے زیادہ محنتی ہونا چاہئے۔ مدرس جماعت کی حیثیت سے بیس تیس اطفال کی دیکھ بھال اُس کے ذمہ ہوتی ہے تو مدرسین کے مدرس ہونے کی حیثیت سے اُس کی ذمہ داری

دس بیس گنا زیادہ ہے۔ کیا تعداد کی زیادتی سے ذمہ داریوں میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس پر مدرسین سے سابقہ الگ پڑتا ہے۔ ہر ایک کی اُفتادِ طبیعت جدا جدا ہوتی ہے۔ صدر مدرس کو بہروپئے یا ایکٹر کی طرح سو سو سوانگ بھرنے پڑتے ہیں کبھی مدرس ہے تو کبھی منتظم۔ ادھر اپنے مضمون کی تعلیم دی، اُدھر مسائل تعلیمی کے جدید ترین نظریوں اور اصولوں سے واقفیت حاصل کی۔ وہ اپنے ساتھ ترقی پذیر دنیا کو خاموش نہیں رکھ سکتا۔ فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ وہ تغیر پذیر ہو۔ اُصول تعلیمی کی فضا ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ تبدیلی اکثر بہتری لئے ہوئے ہوتی ہے۔ جب تعلیم کے ہر روز نئے نئے مسائل معلوم ہوتے رہتے ہیں اور صدر مدرس اُن سے ناواقف ہو تو کیونکر کام چلے؟ صدر مدرس کو مطالعہ میں، تجربوں اور جدید اصول (خواہ وہ استقرائی ہوں یا استخراجی) معلوم کرنے میں مصروف رہنا چاہئیے۔ صدر مدرس کو کام کرنے کے کئی مواقع ہیں۔ مدرسہ کی اہمیت کے اضافہ میں اور معیار کو بلند کرنے کے لئے صدر مدرس اپنے کام میں کافی اضافہ کر سکتا ہے مثلاً اگر جماعتوں کی نگرانی محض نمائشی نہ ہو تو مدرسین کے اسباق کی نگرانی سے خاصہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ناتجربہ کار اور اَن ٹرینڈ مدرسین کی خوبی سے رہنمائی اور قیادت کی جا سکتی ہے تاکہ وہ اپنے کام سے حقیقی دلچسپی لینے لگیں اور اس کی تنقید سے ناراض نہ ہوں۔ صدر مدرس کے لئے یہ بنیاد ان عمل ہے۔ ضبط مدرسہ کے قیام کے لئے صدر مدرس کو بیسوں احکام نافذ کرنے پڑتے ہیں۔ ہزاروں انتظامی امور کی نگرانی اُس پر عاید ہوتی ہے۔ یہ سب کام نہیں تو کیا ہے؟ باوجود ان تمام باتوں کے کلنک کا ٹیکا صدر مدرس کے ماتھے ہے تو اس سے زیادہ جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔

صدر مدرس پیدائشی ہے یا اکتسابی

اس سوال کے متعلق میرا یہ جواب ہے کہ اس کی دونوں حیثیتیں ہیں۔ جس حد تک فطری اور باطنی خوبیوں کا تعلق ہے صدر مدرس کے لئے پیدائشی کا لفظ موزوں ہے۔ اور جس حد تک وہ ٹرینڈ ہو کر اُن فطری خوبیوں سے مستفید ہوتا ہے وہ اکتسابی ہے۔ بہر حال اس میں چند خوبیاں اور محاسن تو ہونے ہی چاہئے۔ مثلاً فرض شناسی، انصاف پرستی، موقعہ شناسی اور حکمت عملی۔ وجاہت اور شخصیت تو خدا کی عطا کی ہوئی نعمت ہے۔ اگر اس میں جادو بیانی ہے تو طلبہ خود اس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ صدر مدرس صحت اور تندرستی کی مجسّم تصویر ہو۔ اس میں چستی ہو، پھرتی ہو، دم ہو، تازگی ہو، چہرہ زرد نہ ہو، داغ دھبّے نہ ہوں۔ چھپکلی کی طرح رینگتا نہ چلے

پھرتی اور توانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ ایسا معلوم ہو کہ دوسرے تمام مدرس اس کے دو ہاتھ پیچھے ہیں۔ اس کو چاہیئے کہ ورزش اور سادہ زندگی سے اپنے کو برقرار رکھ سکے۔ ان خدائی عطیوں کے ساتھ تجربہ بھی ایک چیز ہے۔ جس سے خاص صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تجربہ ٹریننگ کالجوں میں حاصل ہوتا ہے۔ ٹریننگ کالج کی چار دیواری میں قدم رکھنے سے قبل مجھے وہاں کی تعلیم کے افادہ کے متعلق شکوک تھے۔ لیکن جہاں کالج کی ایک مرتبہ صورت دیکھی۔ تو میرے اس نظریہ کی دھجیاں اڑ گئیں۔ ایک طرف کالج کا اثر پذیر ماحول اور نگرانکاروں کی نگرانی میں عملی اسباق اور اُس پر اُن کی تنقید ایسے سنسنی خیز تجارب ہیں جس کو مُدرس تا حیات نہیں بھول سکتا۔ بہر صورت ٹریننگ کالج کا ہر طالب علم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ٹریننگ کالج کا متعلم ہونے کی وجہ سے اُس کی معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ اور وہ زیادہ با اُصول طریقہ سے تعلیم دینے لگا۔ پس پیدائشی خصوصیات کا تعلق توارث سے اور اکتسابی کا تعلق ماحول سے ہے۔ توارث اور ماحول دونوں کے اشتراک سے کیا مُدرس کیا کسی اور انسان کی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ غرض یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ صدر مدرسین کی چند ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں فطری خوبیاں زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن بعض صدر مدرس نے ذاتی سعی سے ان فطری خوبیوں کی اس اثر پذیر طریقہ سے نشو و نما کی ہے کہ وہ "پیدائشی" صدر مدرس سے گوئی سبقت لے گئے۔ تاہم میری رائے میں وہی بہترین صدر مدرس ہے۔ جس کی فطری خوبیاں اکتسابی خوبیوں کے ساتھ متحد ہو گئی ہوں۔

صدر مدرس کے صفات اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ صدر مدرس کے کیا خصائص اور خوبیاں ہوں جواب یہ ہے کہ صدر مدرس کو کامل انسان ہونا چاہیے۔ جس طرح حُسن کار یا مُصوّر نمونہ کے مجسمہ تیار کرتا ہے اُسی طرح صدر مدرس کی ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچنی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن ایسے صدر مدرس کا وجود جوان تمام خوبیوں سے متصّف ہو عنقا ہے۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کی وجاہت اور شخصیت میں اثر آفرینی ہو۔ ایسا صدر مدرس جو وجیہہ نہ ہو حامل ہے ایسی "برات" کے جس میں نوشہ نہ ہو یا ہیملٹ کی ناٹک ہے جس میں ڈنمارک کا شہزادہ نہ ہو۔ صدر مدرس تمام نقائص جسمانی سے پاک ہو۔ ایسا صدر مدرس جو کانا' بہرا' یا لنگڑا ہو۔ جس کی بصارت ضعیف ہو یا ہکلاتا ہو کوئی وجاہت کا حامل نہیں ہوتا۔ اگر ایسے صدر مدرس کا تقرر ہو جائے تو ناخوش گوار صورت یہ پیش آتی ہے کہ طلبہ اُس کی نقل اُتارتے ہیں اور مذاق اُڑاتے ہیں۔ صدر مدرس کو کب یہ بات گوارا ہوتی ہے کہ مکان مدرسہ یا بازی گاہ میں نیچے

اُس کی نقل اُتاریں۔ اسی طرح صدر مدرس بونا یا پست قد نہ ہو ۵ یا ۴ فٹ کے قد و قامت کا صدر مدرس
طلبہ کے مجمع میں نمایاں نہیں رہ سکتا۔ وہ جلد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور کبھی منظر عام کے موزوں
نہیں۔ صدر مدرس دیو قامت اونچا پورا ہو۔ طبقۂ تحتانیہ و وسطانیہ کی پہاڑی ناچوٹیوں کا ذکر ہی کیا
ہے۔ طبقۂ فوقانیہ کے اساتذہ سے (کیا بلحاظ قد اور کیا بہ لحاظ علمیت) خواہ وہ ہمالیہ کی سر بہ فلک
چوٹیوں گڈون، آسٹن، کنچن جنگا، دھول گیری کی طرح بلند کیوں نہ ہوں اُن کے مقابلہ میں
صدر مدرس کو ایورسٹ کی چوٹی کے مانند بلند تر رہنا چاہیئے۔ وجاہت ایک جامع اصطلاح ہے جس
کی تحلیل دُشوار ہے۔ جس میں آداب و اخلاق کی متعدد خوبیاں شامل ہیں۔ وجاہت کے بعد دوسرا
نمبر فرض شناسی کا ہے۔ خود اس قدر فرض شناس ہو کہ لوگ اُس کو فرض مجسّم یا اوتار تسلیم کریں۔
لیکن اگر وہ فرض شناسی کے لاسلکی پیام سے مدرسہ کی فضا کو اس قدر معمور کر دے کہ نا اہل کرنے
والا نو وارد مدرس بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بلا ارادہ سرگرمی سے کام کرنے لگے۔
تو ایسا صدر مدرس نہایت کامیاب صدر مدرس تصور کیا جا سکتا ہے۔ صدر مدرس کی تیسری خصوصیت
یہ ہے کہ وہ اسٹاف کے دوسرے اراکین سے زیادہ قابل اور تجربہ کار ہو۔ بہ الفاظ دیگر اس کو
چلتی پھرتی لغت یا سیکلو پیڈیا کہیں۔ مدرسہ کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کے لئے صدر مدرس
میں جدّت، ذکاوت، فراست اور حکمت عملی ہونی چاہیئے۔ مدرسہ میں ضبط قایم رکھنے کے لئے
اس میں اچھی انتظامی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ اس کا طرز عمل غیر
جانب دارانہ ہو۔ اس کی رائے پختہ اور ارادہ مستقل ہو۔ کبھی وہ اپنے غیر مستقل طرز عمل سے طلبہ
اور اسٹاف پر اپنی کمزوری ظاہر نہ کرے۔ اگر صدر مدرس کسی کام کو ہاتھ لگائے تو مدرسین سے اُس کی
تکمیل کرائے بغیر خاموش نہ رہے۔ اگر اس میں استقلال نہ ہو تو مدرسین اس کو تگنی کا ناچ نچائیں گے
اور ضبط مدرسہ قایم نہ رہ سکے گا۔ اگر صدر مدرس بچوں کے نمایشی جذبات پر موم کی طرح پگھل جائے
یا مدرسہ کے کسی مددگار کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ صدر مدرس اپنی
مشکلات میں خاصہ اضافہ کر رہا ہے۔ اور اگر تزلزل کی یہی صورت رہی تو یہ دشواریاں کچھ نہ کچھ
رنگ لائیں گی۔ صدر مدرس کو ملنسار ہونا چاہیئے۔ طلبۂ مدرسین اور اولیا کو اس سے ملنے کا بسہولت
موقعہ حاصل ہو۔
لیکن اُس کو اُن سے اس قدر مانوس نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس سے بے جا فائدہ اٹھائیں۔

کیوں کہ ضرورت سے زیادہ میل ملاپ سے ہی نفرت پیدا ہوتی ہے۔ بہرصورت صدر مدرس طلبہ کے ساتھ شفقت و محبت کرے لیکن یہ بھی ملحوظ رکھے کہ طلبہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ اور اُن کے دلوں میں محبت کے ساتھ عزت نے بھی جگہ پائی ہے۔ ضبط کے لئے خوف بھی ضروری ہے۔ صدر مدرس میں شرافت اور احساس لازمی ہے۔ وہ دوسروں کی دقتوں کو محسوس کرے، مددگاروں کے ساتھ ہمدردی کرے اور اُن کی شکایات اور مطالبات جائز کے جانب التفات کرے۔ وہ خود خاموش اور صلح پسند ہو۔ نہ خود تماشا ہو نہ تماشائی۔ کیونکہ جب اخلاقی قوت سے نہایت سرکش مدرس یا خود سر طالب علم سر تسلیم خم کر سکتا ہے، تو ناخوش گوار تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ صدر مدرس کو اخلاق کا پتلا ہونا چاہیئے۔ اُسے ثابت کر دکھانا چاہیئے کہ وہ نہ صرف اُستاد الاساتذہ ہے۔ بلکہ ان کے اخلاق کا بھی نگران۔ اس کے اخلاق اس قدر وسیع ہوں کہ کسی کو گرفت کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔ اس کے وسعت اخلاق کی یہ نوعیت ہو کہ مدرسین کے قلوب کو مسخر کرکے طلبہ کے طبقہ میں اس کی اس طرح نشر و اشاعت ہو کہ ہر تشنہ طالب علم اس چشمۂ اخلاق سے فیض یاب ہو سکے۔ صدر مدرس کو بچوں کی نفسیات اور اُن کے رجحانات سے کافی واقفیت ہونی چاہیئے۔ اس سے نہ صرف تعلیم و تدریس میں بلکہ قیام ضبط میں بے حد مدد ملتی ہے۔ صدر مدرس کی خصوصیات لیمپ نے بیان کئے ہیں۔ وہ بطور اعادہ منقول ہیں۔ "صدر مدرس کے لئے خواہ وہ طبقۂ ذکور سے ہو یا اُناث سے۔ چند خصوصی صفات یعنی طریقۂ تعلیم، تجربہ، جدت اور انتظامی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ان تمام صفات کے اجتماع سے ممکن ہے کہ ایک مدرس اچھا معلم کہلائے لیکن مدرسہ کے صدر کامل کے لئے ان تمام صفات کے علاوہ ایک اور ناقابل تشریح خوبی ہونی چاہیئے۔ جس کو شخصیت کہتے ہیں۔ اس لفظ کی تشریح اور تجزی کرنی ایسے ہی بے سود ہے جیسے کسی شخص پر عمل جراحی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ روح کہاں ہے۔ جس طرح روح کے وجود سے انکار خارج از بحث ہے، اُسی طرح شخصیت کے لفظ کی تشریح بے سود ہے۔"

فرائض صدر مدرس صدر مدرس کے متعدد فرائض ہیں، چند حسب ذیل ہیں۔ صدر مدرس کو مدرسہ کا ٹائیم ٹیبل (وقت نامہ) تیار کرنا ہوتا ہے۔ جس پر مدرسہ کی کل چلتی ہے۔ بعض بڑے مدارس میں جہاں تقریباً روز آنہ دو ایک مدرس رخصت اتفاقی حاصل کرتے ہیں ایک عارضی نظام الاوقات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کئی مدرسین وقت واحد میں غیر حاضر ہوتے

ہیں تو ایک نئے صدر مدرس کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے۔ لیکن ایک قدیم اور تجربہ کار مدرس نہایت دلجمعی سے ان مشکلات کا حل معلوم کر لیتا ہے۔ اور کسی نہ کسی طرح طلبہ کو مصروف بکار رکھتا ہے۔ بعض اوقات ختم سال کے زمانہ میں اکثر مدرسین رخصت اتفاقی کو ختم کرنے کی خاطر رخصت حاصل کرتے ہیں۔ صدر مدرس کے لئے یہ موقع بھی سخت آزمائش کا ہے۔ لیکن ایک ہوشیار صدر مدرس ایسی دقتوں پر بہ آسانی غالب آتا ہے۔ صدر مدرس کا دوسرا فریضہ قیام ضبط ہے۔ کتاب اعلان میں مختلف اعلان جاری ہوتے ہیں۔ مثلاً تعطیلات، اساتذہ کے لئے متعدد تجاویز اور تحریکات۔ مدرسہ کی کل کی صحیح نبض کتاب الاعلان ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی اجنبی مدرسہ کی دس بارہ نوٹسوں پر نظر دوڑائے تو مدرسہ کی حالت کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ اس سے مدرسہ کی سرگرمیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سرکاری ضابطہ تو یہ ہے کہ ایک رجسٹر سزا بھی ہو لیکن ایک مہذب مدرسہ میں اس کے صفحات تقریباً معرا رہتے ہیں۔ صدر مدرس کا ایک اور اہم فرض نگرانی ہے۔ جماعت واری معاینہ کی رپورٹ، اسباق کی نگرانی اور ہدایات متعلق مدرسین ایک علیحدہ رجسٹر میں محفوظ رہتے ہیں جس کو لاگ بک یا وقائع مدرسہ کہتے ہیں۔ اس میں صدر مدرس کو تعلیمی تجربوں، نتائج اور مدرسہ کے دیگر غیر معمولی قابل ذکر واقعات درج کرنا ہوتا ہے۔ صدر مدرس کو کسی خاص وقت یا اوقات مقررہ پر نگرانی کے لئے دورہ نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اوقات مختلف ہوں تاکہ مدرسین کو یہ خیال رہے کہ وہ کسی وقت بھی معائنہ کے لئے چلا آئے گا جب کبھی اس کو کسی مدرس کے تساہل کے متعلق شبہ ہو تو فوراً اس کے جماعت کا معاینہ ضروری ہے۔ تاکہ اگر مدرس طلبہ کو کسی تحریری کام میں مصروف رکھ کر خود اونگھ رہا ہو تو اس کو معلوم کر لے اگر صدر مدرس مستعد ہے تو مدرسین کبھی تساہل کر ہی نہیں سکتے۔ صدر مدرس کو وقت کا پابند ہونا چاہئے وہ مدرسہ جلد آئے اور دیر سے جائے۔ ایک دیر رس صدر مدرس دیر رس مدرسین سے استفسار کرنے کا اخلاقی حق نہیں رکھتا۔ اسی طرح اس کو دیر رس طالب علم کو سزا دینی بھی سزاوار نہیں پابندی وقت کے معاملہ میں صدر مدرس کو رہنمائی کرنی چاہئے تاکہ مدرسین اور طلبہ اس کے نقش قدم پر چلیں۔ صدر مدرس کا ایک اور اہم فریضہ دفتری کاروبار ہے۔ فیس کا حساب چالان کے ذریعہ خزانہ میں رقم کی منتقلی، رجسٹرات کے اندراجات کی نگرانی اور سند ترک مدرسہ اور ترقی تعلیم کی رپورٹ کی نگرانی یہ سب اس کے فرائض میں شامل ہیں۔ دفتری کام میں صدر مدرس سستی نہیں برت سکتا۔ کیوں کہ جہاں اس سے غفلت ہوئی تو اس کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے کے

لئے صدر دفتر سے یاد دہانی کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ بعض صدر مدرسین کو دفتری کام سے اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ وہ صرف اسی کو ضروری کام تصور کرتے ہیں۔ درآں حالیکہ اُس کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ ضبط مدرسہ اور نگرانی کہیں زیادہ اہم فرائض ہیں۔ سابق میں تدریس صدر مدرس کا ایک اہم فریضہ تصور کیا جاتا تھا۔ اور صدر مدرس جس قدر زیادہ اوقات تعلیم دے اُسی قدر زیادہ کامیاب تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب زاویۂ نگاہ تبدیل ہو گیا ہے۔ تعلیم دے کر نظم و نسق کو پس پشت ڈالنا ایک قسم کی جھوٹی کفایت ہے۔ جس سے کوئی فائدہ نہیں۔ مدرسۂ فوقانیہ کے صدر مدرس کا روزانہ ایک گھنٹہ سے زیادہ تعلیم دینا گویا دوسرے ضروری کام سے غفلت برتنا ہے۔ اس رائے کو زیادہ تقویت دی جا رہی ہے کہ صدر مدرس تدریس کے کام سے بالکلیہ مستثنٰی رہے۔ تاکہ نظم و نسق میں وہ زیادہ توجہ دے سکے۔ مدرسہ کی صفائی کا بھی وہ ذمہ دار ہے۔ صفائی اور پاکیزگی ہمیشہ اُس کے پیش نظر رہے۔ جماعت کے کمرے، برآمدے اور بازی گاہ کی صفائی ہوئی یا نہیں فرنیچر صاف کیا گیا یا نہیں کچرا کنڈی میں ڈال دیا گیا یا نہیں ان سب امور کی نگرانی اس کا فریضہ ہے۔ اگر نہ ہو تو ادنٰی ملازمین کے کاہل اور لاپرواہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اور ایسے فرائض میں غفلت پر اُسی وقت توجہ دی جانی چاہئیے۔ ورنہ کوڑا کرکٹ جمع ہونے کا یقین ہے۔ وقتاً فوقتاً صدر مدرس کو پائخانوں کی طرف بھی جھانک لینا چاہیئے کہ خاکروب اپنا کام انجام دے رہا ہے یا نہیں اور شریر لڑکے بدنما تصاویر تو نہیں کھینچ رہے ہیں۔ صدر مدرس کو ادنٰی ملازمین پر سختی سے نگرانی کرنی چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہر شخص باقاعدگی سے اپنا کام کر رہا ہے یا نہیں۔ امتحانات کے متعلق انتظام، طلبہ کو اعلیٰ جماعتوں میں ترقی دینا، نصاب کے بروقت تکمیل کی تنقیح، مدرسہ کی عمارت، سامان اور آلات تعلیمی کی نگہداشت، بازی گاہ کا معاینہ، طلبہ کے مشق کی درستی کی تنقیح، اولیا اور دیگر ملاقاتیوں سے ملنا اور اُن کو اپنے عذرات پیش کرنے کا موقعہ دینا، دارالمطالعہ اور مجلس مباحثہ کی نگرانی، کتب خانہ اور عبادت خانہ مدرسہ کی دیکھ بھال یہ سب صدر مدرسین کے فرائض میں شامل ہے۔ ہفتہ واری جلسۂ اساتذہ منعقد کر کے طریقۂ تعلیم اور ضبط مدرسہ کے متعلق اہم عملی مشکلات پر ردّ و قدح اور غور و فکر صدر مدرس ہی کا فریضہ ہے۔ اساتذہ کے لئے ایک علیحدہ دارالمطالعہ ہونا چاہیئے۔ جس میں روزناموں کے علاوہ تعلیمی رسائل اور دیگر منتخب رسائل کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ بالآخر صدر مدرس کا یہ عین فریضہ ہے کہ وہ مدرسہ کے وقار اور روایات کے برقرار رکھنے اور اس کو زیادہ مستحکم بنانے کی انتہائی کوشش کرے۔

ان تفصیل کے باوجود مجھے شک ہے کہ میں نے صدر مدرس کے جملہ فرائض جامع طور پر بیان کر دئیے۔

صدر مدرس کا روزمرہ کا کام بے محل نہ ہوگا اگر میں جونیر صدر مدرس کی رہنمائی کے لئے صدر مدرس کا روزانہ نظام العمل بیان کر دوں **صبح کی نشست** وقت مقررہ سے نصف گھنٹہ پہلے آئے۔ مدرسہ میں گشت لگائے اور دیکھے کہ صفائی ٹھیک ہوئی ہے یا نہیں۔ اس میں چپراسی سقہ وغیرہ کی نگرانی ہو جاتی ہے ورنہ وہ اپنے کام سے غفلت برتینگے کوئی ملاقاتی ہو تو مل لیجئے۔ پہلی گھنٹی ۹-۴۵ پر بجائی جائے۔ مدرسہ کے کمپونڈ میں طلبہ جمع ہوں۔ دس منٹ تک قومی ترانہ ہو۔ اس کے بعد مدرسین (۵) منٹ تک اپنی اپنی جماعتوں کی حاضری درج کر لیں۔ اس کے بعد طلبہ صف آرا ہو کر جماعت جائیں تعلیم کا آغاز ٹھیک دس بجے ہو۔ باہر کے دروازہ پر (۱۰) منٹ تک کھڑے رہیئے۔ پھر ہر جماعت میں گشت کی جائے تاکہ اُس کو معلوم ہو جائے کہ مدرس نے کام کا آغاز کیا ہے یا نہیں۔ پھر دفتر جا کر مراسلت کے کام کو ختم کیجئے۔ ملاقاتیوں سے ملئے۔ بہ مقتضا حالات جماعت واری دورہ پر پانچ اور کہیں دس منٹ ٹھیرئے۔ ضبط مدرسہ کے متعلق کوئی تصفیہ طلب امر ہو تو اس کو ختم کرنے کے بعد یادداشت کی کتاب میں ہفتہ واری جلسہ کے متعلق کوئی مسایل حل طلب معلوم ہوں تو اُن کو نوٹ کیجئے نشست اول کا آخری گھنٹہ تعلیمی ہو اور اُس کے بعد وقفہ دوپہر کے کھانے کے بعد اگر آپ حنفی المذہب ہوں تو نماز پڑھے ورنہ دفتری کام کیجئے یا کھیل کے انتظام میں مصروف رہیئے۔

نشست سہ پہر۔ طلبہ کو (۱۰) منٹ پہلے حاضری کے لئے جمع رکھئے۔ اس وقت نغمہ خوانی کی ضرورت نہیں۔ طلبہ کے جماعتوں میں چلے جانے پر مدرسہ کے کام کا آغاز (۱½) یا (۲) بجے ہو، جیسا کہ مدرسہ کا عمل درآمد ہے۔ دروازہ پر دیر رسوں کی نگرانی کیجئے۔ پھر جماعت واری گشت لگائیے۔ اگر کوئی ملاقاتی منتظر ہوں تو اُن سے مل لیجئے۔ دفتری کام کے بعد تصحیح شدہ مشقی کاپیوں کی تنقیح کیجئے۔ اکثر صدر مدرسین اسکی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر مدرس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کام کی نگرانی نہ ہوگی تو وہ اس سے غفلت برتیں گے۔ تصحیح کرنا تو کجا بعض اوقات تاریخ درج کئے بغیر محض چھوٹی دستخط پر اکتفا کیا جائے گا۔ صبح کی طرح جماعت واری گشت کیجئے۔ لیکن اسی سلسلہ سے نہیں۔ اگر صبح آپ نے مدرسہ کا چکر نہیں لگایا تو اس وقت یہ کام کیجئے۔ بازی گاہ کا سامان دیکھئے۔ اور کھیل کے متعلق ماسٹروں سے گفتگو کیجئے۔ (اس کام

کو کسی کمیس سکریٹری کے بھی تفویض کیا جا سکتا ہے) وقتاً فوقتاً ڈرل و جمناسٹک کا بھی معاینہ فرمائیے۔ اجلاس پر واپس آکر دفتری کام کے بعد چار سے پانچ بجے تک کھیلئے یا کھیل کا معاینہ کیجئے اور طلبہ کے مدرسہ سے چلے جانے کے بعد آپ تشریف لیجائیے۔ (نوٹ۔ حالات کے اعتبار سے جماعت واری دورہ کے اوقات میں وقفہ سے تبدیلی کر دی جائے۔ اگر کسی جماعت کے ضبط کے متعلق صدر مدرس کو شبہ ہو تو وہاں زیادہ دورہ کیجئے کہ مدرس یہ محسوس کرنے لگے کہ صدر مدرس اُس سے غافل نہیں ہے)۔

بعض امتناعی اُمور صدر مدرس کے فرائض اور خصوصیات کی سُرخی کے تحت چند ایسے نکات بتلائے گئے جو اثباتی شکل رکھتے ہیں۔ اب چند امتناعی امور کے متعلق بھی ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ اظہار اثباتی اسلوب بیان کی طرح موثر نہیں تاہم بعض اوقات امتناعی جملے بھی اثباتی الفاظ کی طرح موثر ہو سکتے ہیں۔ (۱) جماعت میں طلبہ کے روبرو کبھی مدرس پر تنقید نہ کیجئے۔ اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ آپ مدرس کے احساسات کو تکلیف پہونچاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ زنجیر ضبط کی کڑیوں کو آپ کمزور کرتے جاتے ہیں۔ کیوں کہ مدرس صدر مدرس اور طلبہ کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ اگر آپنے کسی ذی حس مدرس کی طلبہ کے روبرو خبر لی تو وہ آپ سے خواہ مخواہ بحث کریں گے۔ اور بطور مفروضہ آپ غلطی پر ہوں اور مدرس صحیح ہو تو طلبہ کی نظر میں آپ کی کیا وقعت باقی رہیگی۔ جو اس کو علم کی دیوی یا سرسوتی سمجھتے ہیں۔ اور آپ کے اور مدرس کے درمیان اس نا واجبی طرز عمل سے اخلاقی بنیادوں میں کیسا زبردست شگاف پیدا ہو جائے گا۔ بعض مددگار صدر مدرس کی طرح بلکہ زیادہ صاحب علم ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے علم کسی کی میراث یا جاگیر نہیں ہے۔ پس صدر مدرسوں کو، اور بالخصوص اُن کو جن کا تقرر نا مناسب طور پر اس عہدہ پر ہو گیا ہے۔ احتیاط برتنی چاہیئے۔

(۲) ایسے ناممکن العمل احکام نافذ نہ کیجئے۔ جن کی تکمیل انسانی دست رس سے باہر ہو۔ بعض نئے اور ناتجربہ کار صدر مدرس اشتیاق کار سے اس نوعیت کے احکام جاری کر دیتے ہیں۔ اس لئے صدر مدرس میں عقل سلیم ہونی چاہیئے۔ کہ وہ غور و فکر اور احتساب نفس سے کام لے اور اطمینان کر لے کہ آیا مجوزہ حکم کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ایسے احکام محض ردی بن جائیں گے۔ اگر کسی حکم کے نفاذ میں مخالفت کا اندیشہ ہو یا کوئی پیچیدہ مسئلہ حل طلب ہو

تو ہفتہ واری جلسہ میں اس کو پیش کر کے تصفیہ کر لیا جائے۔ خصوصاً ایسی تجاویز جس میں مدرسین کے کام میں اضافہ ہو اور اُن کے اوقات فرصت میں تخفیف مقصود ہو۔ ہفتہ واری جلسہ کی وساطت کے بغیر احکام کا نفاذ اس کی ناکامی کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح اگر آپ کی تجویز کو اساتذہ کی اکثریت تائید کرے تو کامیابی لازمی ہے۔ پس اس سے مدرسین کے ساتھ اتحاد عمل کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

(۳) اساتذہ میں سے کسی کے ساتھ خاص رعائتیں نہ برتئے اور نہ متمول اور غریب اولیا کے درمیان کسی قسم کا امتیاز کیجئے۔ ایسی صورت میں بدنظمی پیدا ہوگی۔ اگر سختی یا نرمی سب کے ساتھ یکساں ہو۔ تو کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ اگر عدم مساوات ہو تو مدرسہ میں سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ایسے کمزور صدر مدرس سے خدا بچائے۔

(۴) کاہل نہ بنیئے اور اپنے تمام اختیارات کو کسی ایک مددگار کے تفویض کر کے اس کے پیش کردہ مسودہ پر دستخط کرنے کے عادی نہ بنئے۔ ایسی صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپ پر پورا اقتدار حاصل کر لے گا اور آپ اُس کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن کر ناچینگے۔ وہ مغرور ہوگا۔ اور آپ کو دقتیں پیش آئیں گی۔ تمام عملہ آپ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سفاکی یہ غضب ڈھاتی ہے کہ وہ ہر وقت مدرسین کے درپئے آزار رہتا ہے۔ ایسے نازک وقت صدر مدرس کو زک اُٹھانی پڑتی ہے۔

(۵) نہایت شریر النفس اور بدکردار لڑکوں کو مدرسہ میں جگہ نہ دیجئے۔ اگر ہوں تو اول اُن کے اخلاق کے سدھارنے کی مخلصانہ کوشش کیجئے۔ مدرسہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح بھی کر سکتا ہے۔ یہ نوبت کیوں آئے کہ بُرے لڑکے فوجداری جرم کے مرتکب ہو کر پولیس کی تحویل میں درست ہو جائیں۔ کیا مدرسہ خود ان کے لئے اصلاحی سزائیں تجویز نہیں کر سکتا۔ اگر مدرس جماعت، صدر مدرس اور اولیا کے درمیان اتحادِ ثلاثہ قائم ہو جائے اور تن وہی سے سب متحد ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوں، تو کیا معنی کہ ۹۹ فی صد صورتوں میں کامیابی نہ ہو۔ اگر اس پر بھی وہ اپنے کئے سے باز نہ آئیں تو اُن کو خیرباد کہہ دیجئے۔ اور اُن کا نام مدرسہ سے سے خارج کر کے سند ترک مدرسہ نہ دیجئے۔ گندہ مچھلی کی طرح اگر وہ مدرسہ میں رہیگا تو تمام مدرسہ کو گندہ کر دے گا۔

(۶) اپنے افسر بالا کے احکام کی خلاف ورزی نہ کیجئے۔ ہر صدر مدرس کو اس کا مذاق اور رجحان معلوم کر لینا چاہئے۔ مراسلت میں آداب ملحوظ رہیں اور کوئی امر اس کے خلاف

طبیعت نہ ہو اگر کسی معاملہ میں آپ کو اُس سے اختلاف رائے ہو تو بہ پاس ادب اپنے دلائل کو پیش کیجئے۔ بریں ہمہ اگر آپ اس کو یقین نہ دلا سکیں تو جائے غم نہیں، معاملات اُسی حد تک رہیں۔ سر افسر یہ چاہتا ہے کہ اس کا ماتحت کام کرے اور اطاعت گزار ہو۔ آخرالذکر چیز زیادہ اہم ہے۔ ورنہ خطرناک صورتیں پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ مشکلات کو دعوت نہ دیجئے کیوں کہ وہ از خود ایک حد تک ناخواندہ مہمان کی طرح وارد ہو جاتی ہیں۔

اس مرقع کا روشن اور تاریک پہلو اگر صدر مدرس خلوص اور ایثار سے اپنے فرائض انجام دے۔ تو اُس کو یہ دیکھ کر مسرت ہوگی کہ اُس کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ باغ باں کی طرح اُسے اپنے لگائے ہوئے درخت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر خوشی ہوگی۔ صدر مدرس پر ان نوشگفتہ غنچوں کی برداشت ضروری ہے۔ کہ کہیں مخالف ہوائیں انہیں تباہ نہ کر دیں۔ صدر مدرس کے لئے اس سے بڑھ کر کونسی سچی مسرت حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کے طلبہ خوشی خوشی مدارج ترقی طے کریں۔ اس ریاست ابد مدت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں۔ ان ہونہاروں کی ترقی میں وہ اُن کے والدین کی خوشی میں شریک ہے لیکن اس مسرت میں بغض و حسد کو جگہ نہیں ہے۔ جس طرح باپ اپنے بچے پر فخر کرتا ہے۔ اسی طرح صدر مدرس کو بھی اُسے دیکھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کیا کسی کروڑپتی کو ایسی خالص مسرت نصیب ہو سکتی ہے۔ صدر مدرس دنیا میں سب سے زیادہ مسرور انسان ہو سکتا ہے۔ اگر ڈی کا آٹا پیسنے والا اپنی ہیلی ٹولی میں مگن ہے، تو صدر مدرس اپنے کھریا سے رنگے ہوئے لباس میں کیا اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اپنی چکی یعنی مدرسہ کو اچھی حالت میں رکھے۔ اگر عثمانیہ میٹرک یا اسکول لیونگ کے امتحان میں اس کے مدرسہ کے نتائج درخشاں یعنی (۸۰) یا (۷۰) فی صد ہوں، اور اُس کے مدرسہ کا طالب علم امتحان میں اول آیا ہو۔ تو وہ پھولوں نہیں سماتا۔ یہ دن مدرسہ کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اگر اساتذہ نے صدر مدرس کے ساتھ اتحاد عمل کے ساتھ نہایت مستعدی سے اوقات مدرسہ کے علاوہ تعطیلات میں یا ایسے وقت جب کہ طاعون اور دیگر امراض وبائی کا دور دورہ ہو امتحانی جماعتوں کو تعلیم دیں تو نتائج یقیناً شاندار ہوں گے۔ بعض اوقات بعض مدارس میں اچھے نتائج کا سلسلہ قایم ہو جاتا ہے۔ تو صدر مدرس کو چاہیئے اس معیار کو قایم رکھے۔ جب طلبہ دوسرے میدان عمل میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یعنی فٹ بال یا ہاکی میں شیلڈ جیت لاتے ہیں یا مقابلۂ تقریری میں تمغہ پاتے ہیں، تو اُس کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس کو مدرسہ اور طلبہ کی کامیابی پر فخر ہوتا ہے اور طلبہ کو صدر مدرس پر

نازہوتا ہے۔ یہ سب اس مرقع کا روشن پہلو ہے۔

صدر مدرس کی زندگی میں محض خوشی کی چاشنی ہی نہیں بلکہ تلخی کی بھی آمیزش ہے۔ ہر تصویر کا ایک تاریک رخ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی سال سالانہ امتحان کے نتائج غیر تشفی بخش یا سابقہ معیار کے مطابق نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ صدر مہتمم کی سالانہ معاینہ کی رپورٹ اطمینان بخش نہ ہوئی ہو ممکن ہے کہ کوئی ممتاز شخص یا ناظم تعلیمات اچانک مدرسہ کے معاینہ کے لئے تشریف لائیں اور اُس وقت متعدد نقائص پائے جائیں یہ اور اسی قسم کے متعدد افکار صدر مدرس کی خاموش اور ہموار زندگی کو متاثر کریں۔ اس سے قطع نظر صدر مدرس ہمیشہ مسرور اور بشاش رہ سکتا ہے اور یقیناً رہتا ہے۔

مترجمہ گنیش چند صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار فوقانیہ دارالعلوم بلدہ

اختتامی تقریر

عالیجناب نواب عزیز یار جنگ بہادر صدر نشین کانفرنس

حضرات!

اس کانفرنس میں کارروائی کے تین طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ سب کمیٹیوں کی رپورٹیں پڑھی گئیں جو ایسے اصحاب پر مشتمل تھیں، جو ان مضامین کے ماہر تھے۔ دوسرا طریقہ لکچر کا تھا اور تیسرا طریقہ تحریکات کا۔ ان تینوں طریقوں کے اختیار کرنے سے جو نتیجہ پیدا ہوا ہے، وہ ایسا ہے کہ ممکن نہیں کہ بڑی سے بڑی کانفرنس اس سے بہتر نتیجہ نکال سکے۔ کمیٹیوں کا طریقہ میں نے خاص طور پر پسند کیا۔ اس میں وقت کی کفایت ہے۔ غور وخوض کے بعد ماہرین کی وہ آراء حاصل ہوئیں جن کا عام مجمع میں حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اس موقع پر دو کمیٹیوں کی رائے پڑھی گئیں۔ ان میں سے ایک سائنس کے متعلق تھی۔ اس میں دکھلایا گیا ہے کہ بچوں کو سائنس پڑھانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ نظارۂ قدرت کے ذریعہ سے کیا کیا سبق حاصل کرائے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے بے جان چیزوں کو چھوڑ کر جان داروں کے مشاہدہ سے سبق دینے کا طریقہ بہترین ہے۔ آخری بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے یعنے سائنس کا تعلق دیگر مضامین سے کیا ہے اور مذہب سے کیا؟ یہ تعلق خاص کر ٹیچرز کے واسطے بہت

ضروری ہے کہ کس طریقہ پر انگریزی کا اُستاد سائنس کے مضامین سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور اس طرح سائنس کی تعلیم دی جائے تو اساتذہ بہت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مضمون پڑھانا ہے تو طریقہ ایسا ہو کہ اس میں بچے کے سامنے مشاہدات قدرت کا اظہار ہو اور فہم کی قوت پوری طرح ظاہر ہوتی ہو۔ مذہب کے متعلق مجھے وہ خیال بہت ہی پسند آیا کہ سائنس کیا ہے۔ دراصل ایک علم ہے حقایق کا اور حق کا۔ اگر سائنس کے پڑھنے سے چند توہمات اور مذہبی خیالات جن کی بنا غلط خیال اور توہمات پر ہے اور وہ سائنس ہی کے ذریعے سے دفع ہو سکتے ہیں تو سائنس مذہب کا معاون ہے اور اُس کے خلاف نہیں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ عام معلومات کی سچائی اور حقایق، مذہب کے سلسلے میں ضروری جاننا چاہیئے۔ سائنس سے مذہب کو مدد مل سکتی ہے۔

دوسرے رپورٹ تربیت اخلاق کے متعلق ایسی رپورٹ ہے جس کا کم سے کم مجھ پر تو خاص اثر ہوا ہے۔ اخلاق کے ہر پہلو پر اور نقطۂ نظر پر جس کا تعلق اسکول کے بچوں سے ہوتا ہے دکھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح نقائص دور کئے جا سکتے ہیں۔ یہ رپورٹ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ اس میں عملی طریقہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح نقایص دور کئے جا سکتے ہیں۔ بلاغت و سلاست زبان، اردو زبان کی قوت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ رپورٹ بڑی سے بڑے خیال کا اظہار اُردو میں کرنے کا نمونہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی رپورٹیں سرکار عالی یا سررشتہ تعلیمات کے ذریعہ سے طبع کرائی جائیں۔ اور والدین نیز تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں اُن کا تقسیم کرنا مفید ہوگا۔ بالخصوص اُستاد کو اور جہاں تک صیغۂ تعلیمات کا تعلق ہے ہر شخص کو اس کو پڑھنا چاہیئے۔

دوسرا طریقہ اس کانفرنس میں لکچروں کا تھا چنانچہ چار لکچر دئے گئے یہ بھی طریقہ اچھا ہے۔ اگر سب کمیٹی کی رپورٹ سے اجتماعی آرا کا اظہار ہوتا ہے تو لکچر انفرادی خیالات و آرا کا اظہار ہیں۔ جن اصحاب نے اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے اس سے ہم مستفید ہوئے کیونکہ وہ کارآمد اور مفید ہیں۔ مس ویسٹر کا لکچر قابل لحاظ ہے۔ اُن کا قول ہے کہ کس طرح دو قوتیں یعنے تخیل اور تقلید جو بچے میں ودیعت کی گئی ہیں کام میں لائی جا سکتی ہیں اور اُن سے اُستاد کہاں تک کام لے سکتے ہیں۔ ان کو کام میں لانے سے کہاں تک طالب علم کو بلند پایہ اور اعلیٰ تعلیم کو کس حد تک پہنچا سکتے ہیں کنڈرگارٹن کی اشاعت کی ضرورت سے کس کو انکار ہے۔ دوسرا لکچر سید ظہور علی صاحب کا تھا وہ اپنی دلچسپی میں ایک خاص چیز رکھتا تھا۔ شیرینی و تلخی کو ملا کر ایسی چاشنی پیدا کی جو خاص لطف دیتی تھی بعض وقت تلخی اور شیرینی دونوں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ شیرینی بھی

جب حد سے گذر جائے تو ناگوار ہوتی ہے۔ دونوں کے امتزاج سے آپ نے ایک نئے طرز کا مُربا پیش کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ایسا مُربا کبھی کبھی بنا کر پیش کیا کریں۔ مُدرسی کے دیرینہ تجربہ کی مدد سے انہوں نے جہاں تک ہر چیز سے ہیڈ ماسٹر کی تصویر اور مزاج کو تعلق تھا اُس کو پوری طرح سے کھینچ کر دکھایا۔ وہ جس زمانہ میں پڑھتے تھے مینول ٹریننگ کا رواج نہ تھا ورنہ میرا خیال ہے کہ اگر اس وقت مینول ٹریننگ کا رواج ہوتا تو یہ حضرت جن کی اظہار تخیل کی قوت اس قدر قوی ہے، ضرور ایک اچھے مصوّر ہوتے۔ آپ کی قطع ایسی ہے کہ اس سے بعض وقت دھوکا ہو جاتا ہے۔ ظاہرا بغیر تقریر کئے زاہد خشک معلوم ہوتے ہیں لیکن دھوکا جو اُن کی Deceptive appearance کا نتیجہ ہے بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ یعنی اس مضمون کو شروع کرتے ہی معلوم ہوا کہ آپ ظرافت اور بذلہ سنجی کا ایک نمونہ ہیں۔ مضمون کے خیالات قابل قدر ہیں۔ ہر ہیڈ ماسٹر اس کو غور سے پڑھے تو یقین ہے کہ بہت سے ہیڈ ماسٹر ایسے ہوں گے۔ جو اس مضمون کو پڑھ کر بہت سے فقرات کو خاص اپنے سے متعلق سمجھیں گے۔ میں واقعی اس سے بہت محظوظ ہوا۔ عبدالجبار صاحب نے مینول ٹریننگ کے متعلق دلچسپ معلومات کا ذخیرہ پیش کیا۔ پرنسپل عبدالرحمٰن خاں صاحب نے باوجود ناسازی مزاج اپنے بیش بہا خیالات سے ہم کو مستفید فرمایا۔

تیسرا طریقہ تحریکات کا تھا چنانچہ چار تحریکیں پیش ہوئیں۔ ایک تو ریفریشر کورس سے متعلق تھی کہ ٹرینڈ اساتذہ کو دوبارہ موقع دیا جائے کہ اپنی معلومات کو تازہ کریں۔ دوسرے تحریک یہ تھی کہ کم مواجب مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ ہو سکے۔ دونو متفقہ طور پر منظور ہوئیں۔ اُمید ہے کہ گورنمنٹ چونکہ یہ متفقہ طور پر منظور ہوئی ہیں ان پر ضرور خیال فرمائے گی۔ دو تحریکیں اور تھیں ایک اساتذہ کی شرکت برائے معاینہ مدارس کے بارے میں اور دوسری تحریک دربارہ انتظام مدارس ثانویہ امدادی اس میں ریورنڈ سمیس نے ترمیم پیش کی کہ اس کے حصوں میں سے دو کو حذف کر دیا جائے مگر یہ ترمیم منظور نہ ہوئی بلکہ اصلی تحریک بہ غلبۂ آرا پاس ہوئی ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریکوں میں اختلاف آرا رہا ہو اور انتظامی دقتیں بیان کی جائیں تو اُن پر گورنمنٹ غور یا عمل کرے گی۔ اس حیثیت سے کہ ہم کو کم از کم یہ اختلاف معلوم ہو گیا ہے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اختلاف اس فن کے ماہرین کا ہے جو انتظامی امور سے واقف ہیں۔ بہرحال ان تحریکات کے متعلق اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ مختلف فیہ تحریکات میں کم از کم اتنا تو ہے کہ غور کرنے کا کافی

موقع ملے۔ دوسری تحریک میں سمپسن صاحب اس امر سے متفق تھے کہ امدادی مدارس کے انتظام میں ایسا ردوبدل کیا جائے کہ ماسٹر صاحبان مطمئن ہو کر دلچسپی سے کام کریں۔ مگر دوسرے حصہ سے اُن کو اختلاف تھا۔ بہرحال ایسا اصول پیش نظر تھا جس میں بچوں کا اور تعلیم کا فائدہ مضمر ہے۔ مجھ کو اُمید ہے کہ گورنمنٹ ان تحریکات کے اصول پر غور فرما کر کوئی طریقہ نکال سکے گی جو ان مشکلات کو رفع کرے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی امدادی اسکول کے منیجر اندراجات کو توڑ موڑ کر ایسا عمل کرتا ہے جو بالکل نامناسب ہے اور اگر کوئی کارروائی ایسی ہوئی ہے تو گورنمنٹ جلد متوجہ ہو کر کوئی ایسا انتظام کرے گی جس سے ہر قسم کے نقایص دور ہو جائیں گے۔

بالآخر اس کانفرنس کی کارروائی نامکمل ہوتی جب تک کہ ہم ان اشیاء کا معاینہ نہ کرتے جو ہم کو نمایش میں دکھائی گئی ہیں۔ یہ نمایش لب لباب ہے ان تمام کوششوں کا اور محنتوں کا جو اساتذہ اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں نے کی ہے۔ یہ نمایش ہمارے اساتذہ کی محنتوں کا لب لباب ہے اس کانفرنس کی جانب سے مس ولسٹر کا شکریہ ادا کیا جانا چاہیے جس دلچسپی سے اُنہوں نے اس کے ہر شعبے کو دکھلایا اس کا میں خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

بالآخر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جب مجھ کو یہ عزت دی گئی ہے کہ میں اس معزز کانفرنس کا میر مجلس بنایا جاؤں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی کے یہ دو دن خاص خوش وقتی کے تھے۔ اور مجھے قلبی راحت حاصل ہوئی۔ مجھ کو یہ موقعہ بہت کچھ سیکھنے اور معلومات حاصل کرنے کا ملا۔ بچوں کو مدرسہ میں پڑھانے کے علاوہ بچوں کے والدین کو سبق دینے کا یہ طریقہ اچھا ہے جس سے اُن کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کانفرنس کی کارروائی میں بہت سی نامعلوم باتوں کا مجھے علم حاصل ہوا۔ چونکہ دو دن کی کارروائی میں مجھے آپ کی امداد ملی اور جس متانت اور دلچسپی سے آپ نے کارروائی کو سُنا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

تحریکات منظورہ کانفرنس ہائے سابقہ

پہلی کانفرنس ۔ (۱) انجمن اساتذہ مستقر بلدہ مدرسوں کے لئے موزوں منعقدہ ۔ ۱۹ امرداد ۱۳۳۵ف۔ مکانات اور بازی گاہوں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے سرکار عالی سے مستدعی ہے کہ مکانات مدارس کی تعمیر اور بازی گاہوں کی فراہمی میں مزید دلچسپی کا اظہار فرمایا جائے ۔

نتیجہ: حسب گنجائش موازنہ کافی توجہ فرمائی جارہی ہے ۔

(۲) اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مدارس کے طبی معاینہ کا باقاعدہ انتظام کیا جائے ۔

سرکار کے زیر غور ہے ۔

(۳) بلدہ کے مدرسین کی یہ کانفرنس امتحان ہائے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے متعلق حسب ذیل تجاویز پر غور فرمانے کے لئے سرکار سے استدعا کرتی ہے ۔

ارباب مقتدر توجہ فرمارہے ہیں ۔

(ا) مختلف مضامین جو امتحان کے لئے مقرر ہیں ان کے نصاب پر اس طرح نظر ثانی کی جائے کہ کسی مضمون کا معیار اس معیار سے کم نہ ہو جو مدراس یونیورسٹی میں اس مضمون کے لئے مقرر ہے ۔

(ب) ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے متعلق رکارڈ رجسٹرات رکھنے کا موجودہ طریقہ مدرسہ کے صرف ششماہی اور سرکاری سالانہ امتحان کے نمبرات کے اندراج تک محدود و مختص کردیا جائے ۔

(ج) اگر کسی مضمون میں کوئی طالب علم سالانہ امتحان میں گروپ اے اور بی کے کسی مضمون میں (۳۵) نمبرات نہ حاصل کرسکے تو اس کو موجودہ قواعد کی رُو سے گریس مارک حاصل کرنے کے حق سے محروم کئے بغیر رعایات مندرجہ صفحات (۲۸ - ۳۰ - ۳۲ - ۳۳) ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کیلنڈر کی بناء پر موڈریشن وغیرہ کا موقع ملنا چاہئے ۔

(۴) اس کانفرنس کی استدعا ہے کہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ اور عثمانیہ میٹرک کے ممتحنین اور موڈریٹرز میں کافی تعداد اُن حضرات کی مقرر کی جائے جو مدارس میں عملی طور پر تعلیمی تجربہ رکھتے ہوں ۔

زیر غور ہے ۔

(۵) اس کانفرنس کی رائے میں مڈل کے امتحان میں زبان زائد دوم کے لئے عام زبانوں کا معیار مساوی اور یکساں ہونا چاہئے ۔

چونکہ امتحان مڈل ساقط ہوگیا ہے اس لئے سال گذشتہ اس کو چھوڑ دیا گیا ۔

دوسری کانفرنس
منعقدہ شہریور ۱۳۳۷ف

(۱) کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ طبقہ وفوقانیہ کی تعلیم میں عثمانیہ اور ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے نصاب کی تفریق کو دور کیا جائے اور ان دونوں طریقوں کو متحد کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔

نتیجہ: اب یہ تفریق تقریباً اٹھ گئی ہے۔

(۲) کانفرنس ہذا کی رائے میں دکن کے موسمی حالات کے لحاظ سے مدارس کے اوقات امداد (جون) سے فروری (دفبروری) تک صبح کے ۹ بجے سے ۳ بجے سہ پہر تک درمیان میں ایک گھنٹہ کے وقفہ اور سال کے باقی ایام میں صبح ۷ ½ سے ۱۲ بجے تک بیچ میں آدھ گھنٹے کے وقفہ سے رکھے جائیں۔

رائے عامہ دریافت کی جاری ہے۔

(۳) اس کانفرنس کی رائے میں مدارس امدادی کے ملازمین کے فائدہ کے لئے پراویڈنٹ فنڈ کا قیام ایک ایسہ ذریعہ ہے جو ان مدارس کے ملازمت میں استقلال کا باعث ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے یہ کانفرنس سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ اس بارہ میں ایک اسکیم تیار کر کے پیش کرنے کے لئے ایک ایسی کمیٹی کا تقرر فرمائے جس میں ہر فریق کے نمایندے شریک ہوں۔

سکندرآباد رزیڈنسی اور بعض مدارس بلدہ میں جاری ہو گیا ہے اور عام طور سے جاری کرنے پر غور ہو رہا ہے۔

(۴) اس کانفرنس کی رائے میں عثمانیہ میٹرک اور ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان میں ابتدائی سائنس کو لازمی مضمون قرار دیا جانا ضروری ہے۔

موجودہ نصاب کی رو سے اس پر عمل ہو گیا ہے۔

تیسری کانفرنس
منعقدہ امرداد ۱۳۳۸ف

(۱) کانفرنس ہذا سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ وظائف عابتی کے عطا کرنے میں عموماً ملازمین سررشتہ تعلیمات کے بچوں اور خصوصاً ان بچوں کا خاص لحاظ کیا جائے جن کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔

حسبہ لحاظ کیا جا رہا ہے۔

(۲) اس کانفرنس کی رائے میں جماعت ہائے تحتانیہ اور درجہ اول میں تاریخ و جغرافیہ کے موجودہ نصاب میں فوری نظر ثانی کی ضرورت ہے نیز ضروری ہے کہ درجہ اول میں ملک سرکار عالی کے تاریخ و جغرافیہ کے بجائے ہندوستان کا تاریخ و جغرافیہ داخل فرمایا جائے۔

موجودہ نصاب کی رُو سے ضروری اصلاح ہو گی۔

(۳) یہ کانفرنس سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ مدرسین کے لئے علاوہ موسمی تعطیلات سے مستفید ہونے کے مدت ملازمت میں کم از کم ایک دفعہ حج و زیارت مقامات مقدسہ یا تیرتھ یاترا کے لئے زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی رخصت خاص بہ یافت سالم ماہوار بیشگی بطور خاص عطا کی جائے۔

ابھی زیر غور ہے۔

چوتھی کانفرنس
منعقدہ امرداد ۱۳۳۹ف

	نتیجہ
(۱) کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ سائنس کو بشمول حفظان صحت طبقہ وسطانیہ کی تعلیم کے لئے لازمی قرار دیا جائے اور ہر مدرسہ وسطانیہ میں ایک مستند سائنس ٹیچر کے تقرر کے علاوہ ایک مکمل معمل مہیا کرنے کا فوری انتظام فرمایا جائے۔	نصاب کی رُو سے سائنس کو لازمی کردیا گیا ہے مگر معمل اور مدرس کا تقرر ابھی غور طلب ہے
(۲) یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ السنہ مشرقیہ کی تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کے لئے علوم مشرقیہ کے اسناد رکھنے والے اُن مدرسین کی تعلیم کے لئے جو اس وقت سررشتہ میں ملازم ہیں عثمانیہ ٹریننگ کالج میں تعلیم کا انتظام فرمایا جائے	ابھی زیر غور ہے۔
(۳) اس کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ناقص القویٰ اطفال کی تعلیم کے لئے مستقر بلدہ میں ایک مدرسہ مع ایک دارالاقامہ کے قائم کیا جائے۔	سرکار کی اس پر توجہ ہے چنانچہ سال زیر رپورٹ میں مولوی سید علی اکبر صاحب اس قسم کے مدرسے کے معائنہ کے لئے کلکتہ بھیجے گئے تھے۔
(۴) ملک سرکار عالی میں ناخواندہ اشخاص کی کثیر تعداد کے لحاظ سے کانفرنس ہذا تحریک کرتی ہے کہ مستقر بلدہ اور اضلاع میں بھی تعلیم بالغان کی ترویج اور توسیع کے لئے پر زور تدابیر اختیار کی جائیں۔	بلدہ میں تو بتدریج اس قسم کے مدارس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اضلاع کے لئے زیر غور ہے۔
(۵) یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تعلیم تجارت (کامرس) کو امتحان ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کی طرح عثمانیہ میٹرک کے امتحان میں بھی بطور اختیاری مضمون شریک فرمایا جائے۔	ابھی زیر غور ہے۔
(۶) جملہ مدارس میں پیشہ کی تعلیم جاری کرنے کے خیال سے یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تاوقتیکہ پیشوں کی تعلیم دینے والے مدرسین کی تعلیم کا انتظام اندرون ملک نہ ہو اُن مدرسین کے لئے جو اس مضمون سے خاص دلچسپی رکھتے ہوں برٹش انڈیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف کی کافی تعداد مقرر فرمائی جائے۔	ابھی زیر غور ہے۔

شذرات

آل انڈیا کانفرنس فڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنز "میسور سکنڈری ایجوکیشن لیگ" کے معتمد صاحب مسٹر سی کرشنا سوامی راؤ صدر مدرس نارمل اسکول حسن اطلاع دیتے ہیں کہ انجمن مذکور کی سرپرستی میں "اتحاد انجمن ہائے مدرسین ہند کانپور" کا سالانہ اجلاس بمقام بنگلور ۲۸ تا ۲۹ ڈسمبر سنہ ۳۱ء منعقد ہوگا۔

انجمن مذکور کے اراکین اور جو اصحاب تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہوں استقبالیہ کمیٹی کے رکن بن سکتے ہیں۔ میسور سکنڈری ایجوکیشن لیگ کی فیس شرکت ایک روپیہ اور استقبالیہ کمیٹی کی فیس عا ہے۔ رقمی معاملات کے متعلق مسٹر ایس۔ کلپا شریک معتمد اور خازن انجمن مقیم بسوناگڈی بنگلور سے مراسلت ہونی چاہئے۔

اس اطلاع میں ہندوستان کے تمام علمائے فن تعلیم اور تعلیمی درس گاہوں سے استدعا کی گئی ہے کہ تعلیمی مباحث پر مضامین ارسال فرمائیں۔ جس کی آخری تاریخ ۱۵ نومبر ہے۔ مرسلہ مضامین ذیلی کمیٹیوں میں پڑھے جائیں گے اور ان پر تبادلہ خیالات ہوں گے۔ مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل عنوانوں پر بحث و تمحیص کا موقع بھی دیا جائے گا۔

(۱) مدارس میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم۔

(۲) معاینہ مدارس۔

(۳) پیشہ مدرسی کا استحکام اور اس کے حصول کے ذرائع۔

جملہ ماہرین فن تعلیم سے استدعا کی جاتی ہے کہ ان مباحث کو کامیاب بنانے میں حصہ لیں مگر استقبالیہ کمیٹی، جو معزز اصحاب اور خواتین پر مشتمل ہے بن چکی ہے۔ کانفرنس کے انتظامات سرگرمی کے ساتھ ہورہے ہیں۔ آل انڈیا نمائش تعلیمی کے انتظامات بھی عمل میں آرہے ہیں جس کے بارے میں جملہ مراسلت سمپت گیری راؤ ایم۔ اے ہڈماسٹر نیشنل ہائی اسکول موقوعہ بسوناگڈی بنگلور سے ہونی چاہئے۔

مزید تفصیلی اطلاع معتمد صاحب میسور ایجوکیشن لیگ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ معظم شاہی۔ مولوی مرزا احمد علی بیگ صاحب صدر مدرس اطلاع دیتے ہیں کہ

حسب عمل درآمد مدرسہ تحتانیہ معظم شاہی سرکار عالی بلدۂ حیدرآباد کا گیارھواں سالانہ جلسہ بابتہ ۴۸ف زیر صدارت جناب مولوی محمد عبدالقادر صاحب صدیقی ایم۔ اے مددگار پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ بتاریخ ۱۹؍ مہر ۴۸ف روز چہارشنبہ بہ وقت سہ پہر بہ مکان مدرسہ منعقد کیا گیا۔ اولیائے اطفال و دیگر معززین جو شریک جلسہ تھے ان میں قابل ذکر جناب مولوی سید خیرات علی صاحب مددگار صدر مہتمم تعلیمات بلدہ۔ جناب مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ آصفیہ ملک پیٹھ۔ جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب رئیس مدیر روزنامہ منشور۔ جناب مولوی نظیر حسین شریف صاحب ناظر مدارس بلدہ حلقہ شمالی وغیرہم ہیں مدرسہ کاغذی پھولوں اور رنگا رنگ کی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ صحن کے وسط میں مدرسہ کے نام کا ایک نشان بھی نصب تھا جو ہوا کے تموج سے ایک خاص لطف پیدا کر رہا تھا۔ آغاز کارروائی جلسہ سے پہلے ہی طلبہ اور مہمانوں سے مدرسہ کا مکان کافی بھرا ہوا تھا۔ تقریباً (۳ ½) بجے صدر مدرس کی تحریک اور مولوی سید عبدالمھیمن صاحب نقوی اول مددگار مدرسہ و معتمد جلسہ کی تائید کی بنا پر جناب ممدوح الصدر نے کرسی صدارت کو زینت بخشی اور جلسہ کا آغاز عبدالعزیز طالب علم کی قرارت سے ہوا جس نے اپنی خوش الحانی سے مجلس کو محظوظ کیا۔ زاں بعد دیگر طلبہ نے اردو میں اور مسٹر لچھمیا مددگار تلنگی مدرسہ ہذا نے بزبان تلنگی ترانہ حمد پڑھا اور بعدہٗ معتمد صاحب جلسہ نے مدرسہ ہذا کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۴۸ف سامعین کرام کے گوش گزار کی۔ آپ کے بعد مسٹر لی سواتی مددگار مدرسہ تحتانیہ دھول پیٹھ نے موثر تعلیم کے عنوان پر ایک باثر تقریر فرمائی۔ جناب مولوی عمر بن علی صاحب مددگار مدرسہ ہذا نے مولوی محسن اللہ خاں صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ کی نظم جو خاص اس جلسہ کے لئے تیار کی گئی تھی صاحب موصوف کے کسی خاص سبب سے تشریف نہ لانے کی وجہ سے سامعین کو پڑھ کر سنائی۔ جناب مولوی محمد صدیق صاحب مددگار گیمس ٹیچر مدرسہ ہذا اور مولوی شمس الدین محمد عثمان صاحب (علیگ) مددگار مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل نے علی الترتیب کھیل اور مدرسہ اور تربیت اطفال پر بہترین تقریریں فرمائیں۔ زاں بعد جناب ڈاکٹر بدرالدین صاحب بدرؔ ایم بی۔ بی ایس نے طلبہ کے فہم و عقل کے موافق سلیس اردو میں تیار کی ہوئی اخلاقی نظم سنا کر مجلس کو نہایت محظوظ فرمایا۔ آپ کے بعد جناب مولوی سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی۔ اے نے سینما اور ناٹک کا اثر موجودہ تمدن پر کے عنوان پر ایک فاضلانہ تقریر فرمائی۔ ختم تقریر پر جناب صدر نشین صاحب نے منجانب سرکار ابد قرار و مدرسہ اور منجانب جناب مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے سابق صدر نشین جلسہ سالانہ بابتہ ۳۹ف اور منجانب جناب مولوی خواجہ محبوب علی صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ ملے پلی

جملہ (۱۳۱) انعامات سالانہ امتحان بابتہ ۱۳۴۶ف میں اول و دوم کامیاب ہونے والے طلبہ کو نیز نیک اطوار، صفائی اور خوشخطی کے صلہ میں انعام پانے والے منتخب طلبہ اور مدرسۂ ہذا کی فٹ بال ٹیم کے گیارہ کھلاڑیوں کو انعام تقسیم فرمائے۔ جس کے بعد جناب صدر نشین صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی جو طلبہ کے لئے تعلیم میں کوشش کرنے وقت کی پابندی اور اخلاق حسنہ کے حاصل کرنے کے متعلق نہایت موثر اور قابل عمل تھی صاحب ممدوح کے دوران تقریر میں آیندہ سال کے لئے اپنے بھی جانب سے مدرسہ ہذا کے طلبہ کو چار انعام مرحمت فرمانے کا اعلان فرمایا۔

صدارتی تقریر کے ختم پر صدر مدرس نے جناب صدر نشین صاحب معززین و حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور برخاست جلسہ کے بعد طلبہ کو شیرینی تقسیم کی گئی اور معزز مہمانوں کی چاء بسکٹ وغیرہ سے تواضع کی گئی۔

تنقید و تبصرہ

اصول تعلیم یہ کتاب قوم کے ایک قابل تجربہ کار اور عالم فن تعلیم جناب ام سلطان محی الدین صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی، ام۔ ای ڈی نائب ناظم تعلیمات میسور کی تازہ تصنیف ہے۔ جو خاص طور سے مدرسین زیر ٹرینگ امتحان لوور اور اپر سکنڈری کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اصل تصنیف انگریزی زبان میں ہے جس کا ترجمہ مولوی سید ابو یونس صاحب عظیم آبادی بی اس۔ سی۔ بی۔ ٹی نے کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ سب سے پہلی مستند اور جامع تصنیف ہے جو مندرجہ ذیل چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ:۔ عام معلومات۔
دوسرا حصہ:۔ تعلیم حیاتی نقطہ نظر سے۔
تیسرا حصہ:۔ " نفسیاتی " " ۔
چوتھا حصہ:۔ " معاشرتی " " ۔

لایق مصنف نے ان چار حصوں کے تحت اصول تعلیم سے متعلق تمام عصری معلومات اور

جدید نظریوں کو نہایت ہی محنت و عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ مصنف کی باریک بین نظر سے کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی۔ ہر باب میں کچھ عبارت توسین میں رکھی گئی ہے، جس کا معیار بلند اور فطری ہے جسے بورڈ سکنڈری امتحان کے طلبہ چھوڑ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب لوور اور اپر سکنڈری امتحانات کے طلبہ کے لئے مفید ہے۔ ہر باب کے آخر میں مغربی علمائے فن کی مستند تصانیف کے حوالے ہیں تاکہ طلبہ اپنے طور پر مطالعہ کر کے مستفید ہو سکیں۔ زیر تنقید کتاب وسعت مباحث اور اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بلند پایہ اور قابل قدر ہے۔ یقین ہے کہ فاضل مصنف کی مساعی مشکور ہوں گی۔

افسوس ہے کہ ترجمہ میں یہ بات کہ ترجمہ ترجمہ نہ معلوم ہو، پیدا نہ ہو سکی۔ اکثر مقامات مبہم ہیں جنہیں ٹرے اردو داں حضرات بلا تشریح اور تفہیم سمجھ سکیں، مشکل ہے۔ جا بجا نامانوس ترکیبیں اور غلط الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو ممکن ہے کہ شائقین اردو پر شاق گذریں۔ مثلاً پہلے ہی باب سے مندرجہ ذیل خط کشیدہ عبارت بطور نمونہ ملاحظہ طلب ہے۔

(۱) تعلیم کی ضرورت شخصی زندگی کی حفاظت اور جماعت کی برقرارگی کے لئے تھی (برقرار رکھنے یا قیام کے لئے تھی۔)

(۲) شعورانہ و غیر شعورانہ (شعوری اور غیر شعوری بہتر ہے)

(۳) کتاب جو ہم پڑھتے ہیں۔ پیشہ جس میں ہم پڑے ہیں (جسے ہم نے اختیار کیا ہے یا ہمارا جو پیشہ ہے)۔

(۳) انسان جو چیز دیکھتا ہے اس کی غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ جانے کہ وہ کیا چیز ہے اور اُس کا مصرف کیا ہے۔ ؟ اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے ؟ (نری انگریزی ترکیب ہے؛ خصوصاً خط کشیدہ عبارت، جس کا شاید یہ مطلب ہے کہ وہ کیسے اُس سے عہدہ برآ ہو سکے۔

(۴) میں اپنے کو ماحول کے حسب موافق بناتا رہتا ہوں۔ (حسب غیر ضروری)

(۵) حسب قول ولٹن صاحب۔ (بقول ولٹن صاحب)

(۶) متفرق (مختلف) وقتوں اور متفرق (مختلف) جگہوں کے لئے تعلیم کا مقصد مختلف رہا ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ (خط کشیدہ الفاظ کی جگہ توسین کے نقطہ رکھ دئے جائیں یا تھوڑی سی تبدیلی کر کے "بھی" کے بعد "یہی" کا اضافہ کر دیا جائے تو بندش چست ہو جائے گی۔ غرض کہ اسی قسم کے اور فقرے بھی پوری کتاب میں ملیں گے اس سے ہمارا یہ مقصد نہیں

کہ لایق مترجم کے کام کو کم کر کے دکھایا جائے۔ بلاشبہ اُن کی ان تھک محنت، اُن کا عزم واستقلال ایسے بے برگ وگیاہ میدان میں لایق داد اور قابل تحسین ہے۔ ترجمہ کو اپنا لینا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اصطلاحات کی کمی ہو کوئی آسان کام نہیں۔ یقین ہے کہ طبع ثانی کے وقت ضروری ترمیم پیش نظر رہے گی۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۸؍ کلدار۔ (ن)

مبادئ نفسیات نفسیات پر یہ ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے، جو ہمارے سررشتہ کے ایک لایق رکن مولوی شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی۔ اے (آنرز) صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ احمد پور کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس رسالے کو پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ نو بیتہ مدرسین کو نفسیات کے ابتدائی مسائل سمجھنے میں سہولت ہو اور عام طور پر شایقین بھی مستفید ہو سکیں۔ بلاشبہ اس مقصد کے حصول میں قابل مولف کو کامیابی ہوئی۔ شروع سے آخر تک طرز بیان سلیس اور دل کش ہے۔ جا بجا حسب حال اشعار اور اقوال وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے، جس سے دلچسپی قائم رہنے کے علاوہ نفس مضمون کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس فن کے تراجم اور اردو تالیفات میں نامانوس انگریزی ترکیبوں اور ابہام وغیرہ سے سابقہ پڑتا ہے اور اکثر حصے چیستان سے کم نہیں ہوتے۔ مگر شوق صاحب کی تالیف ان اسقام سے بالکل پاک وصاف ہے جس کا مطالعہ یقین ہے کہ عام طور پر شایقین اور خاص کر مدرسین کے لئے بے حد مفید ہوگا۔ اس کامیابی پر ہم اُنہیں دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

لکھائی چھپائی متوسط اور کاغذ اچھا ہے۔ قیمت ۱۲؍ ہے۔ (ن)

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد یا احمد حسین، جعفر علی تاجر کتب چار مینار سے طلب فرمائیں۔

شیون جواب شیون ہمدردانِ قوم میں ایسا کوئی نہیں، جسے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت پر افسوس نہ آتا ہو لیکن اس کے ساتھ تجربہ نے اس امر کو ایک ناقابل انکار حقیقت بنا دیا ہے کہ اس وقت جتنے بھی نسخے قومی امراض کے لئے تجویز کئے گئے، وہ نتیجہ پر نظر کرتے صحت کاملہ کا باعث ثابت نہ ہوئے۔ باوجود اس کے یہ کام ایسا نہیں کہ حقیقی ہمدردی رکھنے والے خاموشی سے ان جانکاہ حالات کا مشاہدہ کریں، اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

بنا بریں ہر ایک دردمند نے حتی المقدور جو کچھ ہو سکا کیا اور کرنے میں منہمک ہے۔ آج

اسی قسم کی نظم جو شیوں کے نام سے موسوم ہے ہمارے سامنے ہے۔ اس کے شروع میں ایک مقدمہ پیرزادہ جناب مولوی فدا حسین صاحب بی۔ اے کا لکھا ہوا ہے۔ مقدمہ میں خاص خاص قابل دید نکات درج ہیں۔ اس کے بعد اصل نظم "شیون اور جواب شیون شروع ہوتی ہے۔ یہ نظم شکوہ اور جواب شکوہ کے انداز میں تحریر ہوئی ہے۔ شیون میں جان بازان اسلام کے شجاعت و جوانمردی کے کارنامے، اُن کی سچی محبت، جان نثاری و ایثار کے واقعات شکوہ کے رنگ میں ادا کئے گئے ہیں۔

ختم نظم پر کچھ مختصر نوٹ الفاظ و واقعات کی تشریح پر مشتمل ہے۔

جواب شیون میں موجودہ اور گذشتہ عہد کا مقابلہ کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ اب نہ وہ قوم میں پہلا سا ایثار، خلوص، و محبت کے آثار باقی ہیں، اور نہ وہ محیر العقول نتائج۔ جہاں شیون میں یاس و ناامیدی کا تذکرہ ہے۔ وہاں جواب شیون میں یاس کو امید سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں ہدایت کی گئی ہے کہ آئینہ انجام کو پیش نظر رکھ کر اور میدان عمل میں استقلال اور ہمت کے ساتھ گامزن ہو کر اب بھی اپنی بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کا وقت ہے۔

دونوں نظمیں زبان، محاورات، اور بندش، کے لحاظ سے قابل قدر و تعریف ہیں۔ اور مصنف کو اپنے جذبات کے ادا کرنے میں اچھی کامیابی ہوئی۔ (محمد عبدالحی)

محمود گاواں کے حالات کسی کا مقولہ ہے اور بہت صحیح ہے کہ نوجوانوں میں اعلیٰ اوصاف پیدا ہونے کے لئے مشاہیر کی سوانح حیات کے مطالعہ سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ شخصی حالات یا بالفاظ دیگر سوانح نویسی کے فن کو اہل مغرب نے درجہ کمال کو پہونچا دیا ہے۔ اہل مشرق اس راہ میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ یہ نہایت اہم اور مفید مطلب ادبی شعبہ اہل قلم کی خاص توجہ کا محتاج تھا۔ چنانچہ بعض اہل کمال کی سعی سے اب اس کا مذاق ہمارے انشاپردازوں اور طالب علموں میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب وہ دن دُور نہیں ہے کہ ہمارے مشاہیر کے کارنامے و حالات زندگی نوجوانوں اور طالب علموں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیں۔

میاں محمد ظہیر الدین صاحب طالب علم نے محمود گاواں کی سوانح عمری لکھنے کی سعی کر کے طلبہ کے لئے ایک عمدہ اور قابل مبارک باد۔ مثال قائم کی ہے۔ اور دکن کی بہمنی سلطنت کے اس مشہور وزیر با تدبیر کے حالات کے متعلق جو کچھ اُنہوں نے جمع کیا ہے وہ ایک ہونہار طالب علم کی معلومات اور سعی کے لحاظ سے بہت قابل اطمینان ہے۔

بعض جغرافی مقامات مثلاً گیلان اور بندرگاہ دیبل کی توضیح قابل تصحیح ہے۔

طلبہ کی لائبریریوں کے لئے (جن کے قیام کا رواج مدارس میں ہو رہا ہے) اس قسم کی کتب کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

کتاب کی قیمت آٹھ آنہ ہے جو ایک طالب علم کی حوصلہ افزائی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی کتاب، لکھائی، چھپائی، کاغذ اور تصاویر کے لحاظ سے اچھی خاصی ہے۔ (ظ)

ذہنی حساب حسابی گروں کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو دو کالا داروں کے بچوں اور خانگی مدارس ابتدائیہ کے طلبہ کے لئے بالخصوص اور تمام مدارس کے لئے بالعموم کارآمد ہے۔ طلبہ سے زیادہ تجربہ کار اور نومشق مدرسین کی رہبری کے لئے ایک اچھا نمونہ ہے۔ اور بہ ظاہر اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر مولوی مخدوم علی صاحب ناظر مدارس ضلع گلبرگہ نے اس رسالہ کی ترتیب میں سعی فرمائی ہے۔ اس طرز کے اکثر و بیشتر رسالے لکھے گئے ہیں اگر ان سے کماحقہ استفادہ حاصل کیا جائے تو بلاشبہ بچوں کے ذہن میں حساب کی بنیاد جڑ پکڑ جائے۔

اس طرز کا نہایت شرح و بسط کے ساتھ ایک مفید اور کارآمد رسالہ مولوی نظام الدین صاحب صیغہ دار تعلقداری ضلع اورنگ آباد نے بہت عرصہ قبل شائع کیا تھا۔ جو ناقدردانی کے سبب رواج نہ پاکر گمنامی کی نظر ہوا۔ خدا کرے کہ یہ مختصر ذہنی حساب معلّمین و متعلّمین کی ذہنیت پر اثر کرلے اور مولوی صاحب موصوف کی سعی کارگر ہو۔ رسالہ کی قیمت ایک آنہ ہے جو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ گھریلو حساب کتاب اور بچوں کی ابتدائی تربیت کے لئے ہر گھر میں اس قسم کے رسالہ کا ایک نسخہ رہنا ضرور کارآمد ہوتا ہے۔ (ظ)

قواعد مضمون نویسی حصہ اول و دوم مولفہ منشی مظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ مانوت ضلع پربھنی دو چھوٹے چھوٹے کوزوں کے مانند ہیں۔ جن میں نہ صرف انشاپردازی کا دریا بند کیا ہے بلکہ اُن کی تہ کو پہونچنے کے لئے مولف موصوف کی جدت طرازی نے صرف و نحو کی سبیلیں بھی تیار کر دی ہیں۔ اور قریب قریب ہر قسم کی دستاویزات کے نمونے اور اُن کی مشق کے طریقے لکھے ہیں۔ طلبہ کے لئے اُن کا مطالعہ خالی از منفعت نہ ہوگا۔ دیہاتی مدارس کے طلبہ کی معلومات بڑھانے کے لئے بالخصوص کارآمد نمونہ ہیں۔

قیمت دونوں رسالوں کی ۵؍ اور ۶؍ بالترتیب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہ درجہ اوسط۔ ملنے کا پتہ درسیہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ (ظ)

جغرافیہ اور اسکی تعلیم کے عنوان سے نئی طرز کا مگر ایک کار آمد اشتہار ہے جو مولوی مخدوم علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف نے اپنی جغرافیٔ تالیفات کے ضمن میں شائع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کی یہ جدّت طرازی نہ صرف قابل داد ہے بلکہ لایق توجہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنے اس مضمون میں جغرافیہ کی درس وتدریس کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ جس میں اُس کی حقیقت، تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ جو نو وارد مدرسین اور خصوصاً اُن معلمین کے لئے جو بلا غور وفکر علم جغرافیہ کو روکھا پھیکا مضمون سمجھ کر اُس سے روکش رہتے ہیں ضرور قابل توجہ ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے جغرافیہ کے اسباق کو دلچسپ بنانے اور تعلیم دینے کے متعلق جو رہنمائی فرمائی ہے وہ اس مضمون سے دلچسپی رکھنے والے مدرسین کے لئے قابل مطالعہ اور اُس سے مفید مطلب نتیجہ اخذ کرنے کے لایق ہے۔

بہ ظاہر عام استفادہ کی غرض سے اس مضمون کی اشاعت کی گئی اس لئے کوئی قیمت بھی نہیں رکھی گئی ہے۔ لیکن اگر اُس کی کچھ قیمت بھی ہو تب بھی اس کو حاصل کر کے ایک مرتبہ پڑھ لینا علم شہ بہ از جہل شہ کا مصداق ہوگا۔

رفیق مدرسین مولفہ مولوی مخدوم علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف میں کتاب الرائے مدارس کے اندراجات (ذ ط) کو ذرا تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ درس تدریس کے جملہ نقائص کو چن چن کر ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کی ہے اور ذاتی شوق اور تجربہ کی بنا پر معلمی کے عیوب اور کمزوریوں کو کھول کھول کر بتایا ہے۔ مولف صاحب کی یہ زحمت فی نفسہ ایک اچھی خدمت ہے لیکن اس مضمون میں مدرسین کی دلکشی اور جذب توجہ کی بہ ظاہر کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اسلوب بیان میں بھی تنگمانہ جھلک ہے، جو صفحات ۱۱، ۲۸، ۳۷، ۴۹، ۵۰، ۵۵ اور ۵۷ میں بطور خاص عیاں ہے۔ تاریخ کی تعلیم اور جغرافیہ کی تعریف کے ضمن میں مضمون کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ رفیق کی نظر میں نہ تو مدرسی کا کوئی ہنر ہے اور نہ مجبوری اس لئے تحسین ہے نہ تسلی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ صدر مدرس کی کہیں بھی رفاقت نہیں کی گئی اور نہ نظارت کی اہمیت پر روشنی ڈالی جو نہایت دلچسپ سبق آموز اور طریقہ کار پر متوجہ کر کے متمع راہ بنتی ہے۔

صفحہ ۱۱ پر صغیر جماعت کے لئے لایق مدرسین کی سفارش کے موقع پر تجربہ کار ناظران مدارس کی خدمات پیش کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوتا۔ من حیثیت المجموع مدرسین کے جو نقائص بیان کئے گئے ہیں وہ قابل اصلاح ضرور ہیں۔ مدرس صاحبان اگر اس مشفقانہ عیب جوئی کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں تو ضرور کچھ نہ کچھ حاصل ہوگا جو شخص کسی کی کمزوریاں کی سچے دل سے اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ قابل قدر اور لایق شکریہ ہے۔ اگر خود نمونہ بنے تو لاجواب ہے۔

حجم ۸۰ صفحات کاغذ لکھائی چھپائی معمولی قیمت ۸/ ملنے کا پتہ مولف صاحب سے دریافت کیا جائے

(ط)

preoccupations and engagements, and guiding its deliberations with such extraordinary patience, tact and ability.

The concluding prayer invoking the blessings of the Almighty on H. E. H. The Nizam and the Royal Family was offered by Moulvi Hisamuddeen Saheb of the Darululoom High School. The President then declared the proceedings closed.

Owing to the lack of space we have been compelled to hold over till our next issue the papers which were read at the Conference.

EDITOR.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year. B. G. Rs.	As.	Six months. B. G. Rs	As	Per issue. B. G. Rs.	As
Full page ...	10	0	5	0	3	0
Half page ...	5	0	2	12	1	8
Quarter page	2	8	1	6	0	12
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including potage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions
Single copy B.G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscripton Re. 1-14 As. a year.

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
Hyderabad Teacher,
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

The resolutions passed at the previous conferences were then reaffirmed. The General Secretary announced that four of them had been accepted and given effect to by the Government, while others were receiving due consideration at the hands of the authorities. Mr. Syed Zahoor Ali, the President of the Central Executive Committee, announced the subjects to be entrusted to sub-committees for preparation of reports for the next conference. The subjects were : (i) Drawing, (ii) Classical Languages and (iii) Manual Training. These were approved by the Conference. Mr. Nazeer Hussain Shareef, Secretary of the Exhibition Committee, then read his report and the President distributed the prizes to the winners as recommended by the judges.

The President, Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, then rose to deliver his concluding speech. He warmly congratulated the organisers on the excellent arrangements made for the Conference and expressed great satisfaction at the progress the Teachers' Association had been making. Reviewing the proceedings of the Conference with reference to the different resolutions and speeches. He made pointed references to the addresses of Miss Webster and Mr. Syed Zahoor Ali as instructive and learned. He said that Science in daily life played an important part and was not antagonistic to religion. He hoped that by persistently continuing in its laudable work, the Teachers' Association would be a power for good in the field of education in these Dominions.

Mr. Syed Zahoor Ali, President of the Association, thanked Mr. S. M. Azam, Principal of the City College, for placing the College premises at the disposal of the organisers of the conference and all others who had given them assistance to make it a success. In the end, he proposed a hearty vote of thanks to the illustrious President Nawab Mirza Yar Jung Bahadur for his kindly accepting the Presidentship of the Conference, in spite of his numerous

Mr. Rajappa.

Mr. S. M. Quareishi. M.A., Headmaster Asafia High School then moved the following resolution :—

"This conference is of opinion that every Aided Secondary School should have a duly constituted Board of Management which should be approved by the Educational Department and of which the Headmaster should be a member, who should have a freehand in the internal administration of the institution to the same extent as the Headmaster of Government Schools and that the existing grant-in-aid rules should be so modified as to make the fulfilment of these conditions necessary for the sanction of a grant-in-aid to a Secondary School." Mr. R. Subbarao, M.A., L.T., Headmaster of the Mufeedulanam High School, seconded the resolution. Both the speakers referred to the defects of the constitution of the Managing Boards of some schools and said that the Headmaster should have a free hand in the internal management of the schools, for which purpose the Headmaster should find a place on the managing committee of each institution. Mr. Simpson. B.A., Principal of the Weslyan Mission High School, proposed an amendment, saying that the words " which should be approved by the Education Department " and " who should have a free hand in the internal administration of the institution to the same extent as the Headmasters of Government Schools" be deleted from the original resolution, as he feared that there was a danger of the curtailment of the liberties of aided institutions. Rao Bahadoor Venkatreddy of Bolarum seconded the amendment. The amendment was put to the vote, but was lost by a majority of 29 votes, (60 voting against and 31 for the amendment). The original resolution was then carried by a large majority. The next item on the programme was a suggestive lecture in English by Mr. Abdur Rahaman Khan, B.Sc., Principal of the Osmania University College, on " Science in Every day Life."

resolution should be replaced by 'should', and while sympathising with the spirit of the resolution as far as such subjects as 'mathematics and science' were concerned, he said that the arrangement would not be practicable here. Mr. Chandavarkar accepted the change of 'might' into 'should' but spoke in favour of the resolution, saying that the 'dislocation of work' referred to would not be serious, in view of the greater benefit accruing to various institutions as a result of the inspection being conducted with the assistance of the subject-teachers. The resolution was put to the vote and carried by a majority. This was followed by a suggestive lecture in Urdu by Mr. S. Shareef Mashadi on "School Gardening." He emphasised the need for laying out gardens in schools, which would be very helpful to the teachers in teaching such subjects as Nature-Study and be beneficial to the pupils in developing their powers of observation. Mr. Syed Gulam Mohamed, the Secretary of the sub-committee on "Moral Training in Schools", read the valuable report prepared by the sub-committee. Mr. M. Abdul Jabbar, Manual Training Teacher, City College, then delivered an interesting lecture on "Sloyd." He remarked that the aims of 'Sloyd' were both formative and utilitarian. He traced the history of Manual Training in Sweden, Norway, France, Germany and America. The benefits of Manual Training from the technical point of view were also clearly shown by the lecturer.

The proceedings of the third sitting were thus concluded at 11-30 A.M.

On the same day punctually at 2-30 P.M., the fourth sitting commenced with a demonstration of the use of a ball-frame specially prepared by Mr. Rajappa, a teacher of the Mahaboobnagar District, for purposes of teaching the alphabets and word-building in the different vernaculars-Marathi, Telugu and Urdu. The arrangement of the frame showed great ingenuity on the part of the inventor,

was unanimously carried. The last item on the programme for the day was an interesting lecture on "The Head-Master" by Mr. S. Zahoor Ali. The lecture was very instructive and full of suggestions. Abounding in humour tempered by rationality as the lecture was, it held the audience spell-bound. The lecturer's experience both as Headmaster for several years in different institutions and as an Inspecting Officer was evidently the source of his inspiration. He dwelt at length upon the qualities of the head and heart which an ideal Headmaster should possess. At 9 P.M., two lantern-lectures of great educational value were delivered, one by Mr. Khaja Mohamed Ahmad, M. A., Curator of the Hyderabad Museum, on "Some Rare Coins" and the other by Mr. Syed Yusuf, B.A., Director of Archaeology on "Antiquities of Raichur." In spite of the inclemency of the weather, the attendance was quite good. The lectures were highly appreciated. The lecturers deserve our sincere and best thanks for the trouble they took in order to enlighten the teachers on the vast unexplored regions of antiquity existing in these Dominions.

The proceedings of the second day began punctually at 9-15 A.M. with the recitation of an Urdu poem by Mr. Zaki of the Urdu Shareef Middle School. Mr. G. A. Chandavarkar then moved the following resolution :—

"This conference is of opinion that all Divisional Inspectors might, wherever possible, be assisted by subject-teachers in their inspection, such assistants being selected from teachers of at least six years' standing and that a suitable remuneration be awarded to them for such work." Mr. Abdul Salam Zaki and Mr. Saleem Bia Sayeed, B.A., B.T., spoke in support of the resolution. Mr. Shaik Abul Hasan, B.A., L.T., opposed the resolution, pointing out that such an arrangement would dislocate the work in schools, particularly in the districts. Mr. S. M. Azam, M. A., (Cantab.) suggested that the word 'might' in the original

that trained teachers are liable to lose touch with the modern methods of teaching after a time, a Refresher course for such teachers be instituted periodically at the Head-Quarters to which selected teachers may be deputed from the various schools in the Dominions." Mr. Prakasha Rao dwelt at considerable length upon the need for establishing a Refresher course. Mr. Tajamul Hussain, B.A., B.T., and Mr. S. M. Nakavi, B. A., seconded the resolution in befitting terms. Mr. S. Abul Hasan, B.A., L.T., moved an amendment to the effect that the words "at all the Training Schools" be added after the word "Head Quarters," which was duly seconded by Mr. S. M. Jawad, B.A., B.T., The amendment being accepted, the resolution in the amended form was unaminously passed.

The proceedings of the second sitting began punctually at 2 P.M., with the recital of an Urdu poem on "Education" by Mr. Habibulla Wafa of the Bidar High School. Mr. Hughesdon B.Sc. of St. George's Grammar School then read the valuable report prepared by the Sub-Committee appointed for the purpose of reporting on "The Teaching of Science." The report was unanimously adopted. After this, Mr. Shaik Abul Hasan, B. A., L.T., proposed the following resolution :—

"This conference is of opinion that three side-grades of 50—$\frac{2}{1}$—70, 70—$\frac{2}{1}$—90, and 80—$\frac{2}{1}$—100 be instituted in all Government Schools for the benefit of at least ten per cent of such teachers as have already reached the maximum in the grades of 30—50, .35—65, or 40—65 and 55—80 respectively and can have no possible chance of promotion to the already existing next higher grades either on account of their age or inability to qualify themselves for the next grade by passing a higher examination." This was seconded by Mr. G. A. Chandavarkar and supported by Mr. S. M. Khairat Ali, the Assistant Divisional Inspector at the Head Quarters. All the three speakers emphasised the need for the resolution from different standpoints and the resolution

cular resolutions passed at the previous conferences had met with the approval of H. E. H. The Nizam's Government. The report revealed that the work of the Association was progressing satisfactorily. A condolence resolution on the sad demise of Mr. Abdus Salam, an enthusiastic member of the Association, was then moved from the chair and passed, the whole audience standing in solemn silence.

Nawab Mirza Yar Jung Bahadur then rose amidst cheers to deliver his presidential address. In the course of his thoughtful, scholarly and able address, the President remarked that though in the last few years there had been a considerable increase in the number of Middle and High Schools, it could not be said that the nature of instruction imparted had undergone any radical change such as the giving of a decided vocational bias to the existing curricula. He also dwelt upon the dignity of the teachers' profession, emphasising at the same time the need for a teacher to keep himself abreast of the times. Among other topics of educational interest, he dealt exhaustively with Physical Education and its value, Medical Inspection of school children and its utility, Co-operation between parents and teachers and its signifiance, formation of character as the central purpose of educatian, female education and its growing need, reorganisation of the school curriculum to suit the requirements of the times and the need for raising the status of a teacher. In fact, the presidential address disclosed full acquaintance with all the educational problems of the day.

The next item on the programme was the reading of an interesting and instructive paper on "*Reducing the danger of being a child*" by Miss D. Webster, Head Mistress of the Preparatory Section of the St. George's Grammar School.

Mr. G. S. Prakasha Rao, M.A., L.T., of the Darululoom High School then moved the following resolution :—

"This conference is of opinion that in view of the fact

bition by the President. The Exhibition hall was tastefully decorated, while the exhibits, such as drawings, models, maps and charts, were all as suitably classified as they were neatly arranged. After performing the opening ceremony of the Exhibition, the President proceeded to the dais in the spacious and imposing auditorium of the City College, which was packed to the full. Among those present were all the important officers of the Education Department, Professors of the Nizam and the Osmania Colleges and many ladies and gentlemen keenly interested in the educational welfare of these Dominions.

Mr. S. Zahoor Ali, Ag. Divisional Inspector of Schools at the Head-Quarters, proposed Nawab Mirza Yar Jung Bahadur to the chair. After the proposal had been seconded by Mr. G. A. Chandavarkar, the Nawab Saheb occupied the chair amidst deafening cheers.

The proceedings then began with Quiraat and Sanskrit hymns. Revd. Simpson, B.A., Principal, Wesleyan Mission High School, as the Chairman of the Reception Committee, next delivered his welcome address, in the course of which he paid a glowing tribute to the work of the Teachers' Association and drew the attention of the public to two aspects of the conference, viz., giving the teachers a wide scope in the organisation of schools on efficient lines and keeping them in close touch with the new ideas and experiments in the field of pedagogics. He concluded his speech by cordially welcoming the teachers and other distinguished visitors to the conference. He was followed by Mr. Abul Hasan, B.A., L.T., Ag. Principal, Darululoom High School, who delivered a supplementary welcome address in Urdu, in the course of which he reviewed the work of the Conference and made some valuable suggestions regarding the work of the teachers. Mr. S. M. Shareef Mashadi, General Secretary of the Association, read the Annual Report which gave the details of the work done by the Teachers' Association for the year and shewed what parti-

In concluding this report, a word may be said on the bearing of this correlation, or the opportunity and need for it, on the teachers of all these various subjects. If it is to be done effectively, so as to be really helpful to the pupils in eliminating some of their misunderstandings and problems, it points to a need for a nodding acquaintance at least with all the branches of Science, and we maintain that no teacher of other non-scientific subjects can consider he has reached the highest pitch of his usefulness, unless he has picked up for himself sufficient scientific knowledge to allow him to effectively assist in the correlation, and to realise the added strength it gives him in dealing with his own subject if he is able to do so.

R. S. HUGHESDON,

Chairman of the Sub-Committee.

Proceedings of the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association—1931.

BY

P. SATYANARAYANA RAO, B. A., L. T.,

Assistant Divisional Inspector of Schools, Administered Areas Hyderabad-Dn.

AND

G. A. CHANDAVARKAR, M A.,

Headmaster, Middle School, Residency Bazaars, Hyderabad-Dn.

The Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was held at the City College on the 2nd and 3rd July 1931, under the distinguished presidency of Nawab Mirza Yar Yung Bahadur, Chief Justice of the Hyderabad High Court. The proceedings of the first day began at 9 A.M. with the opening of the Educational Exhi-

Correlation with *Mathematics* is of course obvious, it being possible to use actual laboratory results and figures as examples to replace those taken from text-bocks, as the element of interest is then found to be present.

History may be correlated with very much profit to the pupil in widening his outlook and general idea of the progress of our world. If the History teacher when dealing with certain periods in History were to give occasional lessons dealing with the outstanding characters among men of Science who were contemporary with the political and religious figures of note of that particular period, not only would there be scope for the recounting of many fascinating stories of discovery in the scientific realm, which would certainly fire the enthusiasm of the pupils to emulate their deeds, but it would also give a more rounded and a fuller idea of the progress of the world.

Religion :—It has been suggested that there is fair scope for correlation here. Many natural phenomena when not understood by ignorant folk are usually the starting point of certain superstitions, which continue to exist, even long after the cause has been forgotten. And since superstitions of various kinds enter into all religions, and grow up side by with the more trust worthy portions of them, Science can help here, in clarifying all religions, if sympathetically correlated to give the obvious scientific explanation of various superstitions. It also has the effect of enhancing the true portions of religion since religion has, or should have, as its aim the discovery of ultimate truth, and since Science also is the study of facts or truth, Science will never undermine anything that is really true in religion, only that which is false. We often find religious teachers coming to Science for illustrations of spiritual truths. Is not this in itself an important correlation ?

The effect of good correlation on the teacher concerned :—

at the conclusion that actual technique and the ability to handle apparatus and instruments dextrously and with precision, so as to obtain reliable results in minimum time, is far more important an aim in giving practical work than simply to use it as an aid in teaching theory, or of impressing it. The aim should be to develop what the world needs so much,—the practical man rather than the theorist or philosopher.

Correlation :—

There seems a great scope for careful correlation with at least six subjects, one of the most essential and easiest to commence with being Drawing. The average student's diagrams of scientific apparatus are admittedly of a very poor quality, mainly on account of his never having been taught to represent the commoner types of apparatus on paper in proportion, and correct perspective and symmetry. This could just as well be taught in the drawing lesson as teaching the pupils to draw any other shape of object which may be handy at the moment and chosen as the object to be drawn.

Geography gives scope for much correlation, especially in the younger classes to supplement their Nature Study, as mentioned earlier.

English could very well be correlated with Science, if after some section of work has been completed, a general short essay on the whole section could be written with the special aim of developing the best possible expression in English, and then handing this on to the English teacher for correction of the English ; it finally returning to the Science teacher for correction from the scientific point of view. This, of course, would have to be done by arrangement with the teacher of English, so as to take the place of the regular essay set by him, and occuring say once a month, or even less frequently. Essays on Nature Study Rambles, or Visits to Factories and Chemical Works may well be utilised for this.

numerous tables of weights and measures, formulae, and the whole series of methods available to the fully trained man of science, and which we usually find crowded together in the first chapter or two in a book on Chemistry, for instance. This method of approach tends to kill whatever slight inherent love of science may be lying dormant in the child, so that afterwards, during the rest of his school days, it is practically impossible to arouse interest in science.

The teaching, then, should begin with some striking experiment, simply with the object of fully awakening the dormant interest, and then proceed along the line of the pupils' own enquiry, under very careful guidance and suggestion from the teacher, whose job it is to see that the syllabus is covered, and the essential principles brought out. It should be the aim to commence the teaching of some principle by working back from an application of that principle in real life, some common machine, device, or phenomenon, (using as many examples of it as can be found), to the principle itself, which is then a living thing, obviously vitally connected with every-day life, and not simply an isolated specimen picked out from a valley of dry bones. All this of course means that the course may never be the same no matter how many times the teacher teaches the same principles, since the initiativeness and enquiry of the youngsters themselves mould the form of the course, but the teacher keeps a keen eye on its direction and scope.

The above ideas are more fully dealt with in the January—March, 1931, number of "The Hyderabad Teacher," Vol. 5 No. 3, under the title "A Method of Approach to Science Teaching in Schools," in which a concrete example of the above idea of a suitable method of commencing science studies, during the first ¾-hour period of a class commencing Elementary Science for the first time in their lives, is given.

Practical Work :—

The same article deals with practical work, and arrives

study of Natural Sciences; that that study actually preceded the study of physical and chemical Sciences; that in the Middle Forms there should have been a continuation of the lessons learned in the Primary Section; that by adding Botany and Zoology to Physics and Chemistry in the High School Forms these subjects are only being restored to the places they have lost by neglect; that such an addition is advantageous in that it gives a comprehensive and comparative knowledge of the elements of all the sciences and that such knowledge, apart from the training it gives in scientific methods of thinking and treatment, paves the way for specialising at a later stage in the branch which suits the faculty and appeals to the mind.

We therefore recommend the inclusion of the study of Animal Life, Plant Life, Physiology, Hygiene and First Aid under the H. S. L. C. Elementary Science.

We venture to suggest that the easiest way of doing this is to adopt, in a modified form, the Madras S. S. L. C. Syllabus.

Methods of Teaching Science :—

We cannot, for reasons of space, give here an exhaustive treatment of all the various methods available for teaching science in schools, so we wish simply to emphasize one point, namely the all-important need of, in the first place, awakening a very strong interest in the subject in pupils just beginning science, and of maintainting that interest all through the course. The first few weeks of science teaching will create an indelible impression for good or for ill in the mind of the young pupil, which will take much time to erase, if for bad. But if, on the other hand, it is for good, experience shows that this burning interest in unravelling the secrets of nature, and of more fully exploiting her storehouse, will carry him through longer or shorter sections of less interesting mathematical work. We hold it is much better to abandon the formal method of approach, which consists in starting with the three states of matter, and

is allied to Physics and Chemistry. Having had no idea of Natural Sciene, matriculates do not often elect to take this group. If we take stock of the number of graduates in Biology, and the number in Physics or Chemistry, we will be surprised to find how small the former number is. The reason is not far to seek. Botany and Zoology are wholly new subjects to the young Intermediate student, while Physics and Chemistry are familiar ones. Having had already the preliminary training in these, he feels no effort is required to follow the more advanced course. But he would not venture to risk his success by choosing subjects even the rudiments of which he does not know. The few that do choose it, do it perhaps as an amusing variation in the monotony of studying again the same subjects, or because there is less competition and therefore more chance of getting through.

Also the lecturers in Biology in the College classes are strongly in favour of High School pupils having some lessons in their sciences along with Physics and Chemistry. It is found to be a great strain on those students who only commence their studies in these subjects in the College classes, as they are required to advance to the requisite standard in the same period as the others, and this deters many from taking the science of Biology.

Biology has as great an affinity for Physics and Chemistry as Mathematics has. It may even be said to have more. It also proves more useful to students who contemplate the study of medicine.

It is possible for a Mathematician, Physicist or a Chemist to be unaware of most that lies outside his proper study, but such exclusiveness could rarely be found in a Biologist. Physics and Chemistry do not develop a taste for Biological study, but the latter does stimulate a study of the former.

We have said that Nature Study, Object Lessons, and Gardening in the Primary classes are really beginning the

as to lead on to the study of such branches of science at a University, where they become full subjects.

Thus the contemplated inclusion of the other sciences in the present curriculum of Elementary Science is not an innovation or a preposterous inflation of the existing course. It is only a continuation of the lessons imparted in the lower classes. If the teaching in the Primary and Middle Forms had been really in consonance with the syllabus laid down by the Madras S. S. L. C. Board, and if the teachers had worked it in the spirit in which it was framed, there could be now no cause for complaint.

Educationists who can speak with authority on the subject have laid great stress upon elementary notions of all branches of science being conveyed in the early stages. They hold that confining the study only to Physics and Chemistry is one-sided education, and that ignorance of natural sciences, which in fact ought to precede the aquisition of a knowledge of Physical and Chemical science, is an imprudent and disastrous neglect of the order and method of conveying knowledge and developing the capacities.

There is a good deal of sense in this argument. The first lesson to a child is the care of his body. He is constantly associated with nature, and is consciously or unconsciously affected and influenced by her lessons. It will be a grievous neglect if the child is not taught to read first from the Book of Nature.

A study of the elements of Biology in the High School Forms, in addition to Physics and Chemistry, is highly desirable for the additional reason that optionals are chosen in the Fifth Form, and that this specalisation persists until the end of the degree course. Natural Science gains in the College course as important a place as Physics or Chemistry. Choice having once been made in the High School, the student is expected to pursue it throughout. A science student alone has the liberty to take up Biology, because it

be studied in greater detail than would be possible if they were grouped with Physics and Chemistry under Elementary Science. But the schools do not seem to have made provision for these subjects. The importance of a knowledge of Natural Sciences side by side with Physical and Chemical Sciences, cannot be overrated. The prevailing ignorance of these sister sciences among the pupils should be deprecated. If it is our object to equip and train young minds to understand and comprehend natural phenomena in a logical order, then a change is desirable.

This matter engaged the attention of the Madras S. S. L. C. Board in 1927-8. A committee of competent teachers sat to discuss and decide it. The concensus of opinion was in favour of widening the scope of study; the Natural Sciences were made part of Elementary Science, and a revised syllabus was introduced in 1929, and the first public examination under the scheme was held in March 1931. The change must be deemed to be still in the experimental stage, and a few years' experience alone can determine the prudence of the expansion.

But the change was not accepted by those who had to work the scheme without protest. Managers of schools and science masters opposed it vehemently; but their arguments were based upon imaginary and not on practical difficulties perceived by working it, and therefore the opposition had not force enough to stay the introduction of the new syllabus. This syllabus consists of five sections:—Physics, Chemistry, Animal Life, Plant Life and Physiology, Hygiene and First-Aid. The scope of the study in each is clearly defined.

From the fact that these subjects are often studied even from the Infant Standard under the general term Nature Study, and are then followed up for some distance in the Primary Section by gardening and excursions etc., it seems a great pity that all this should go for nothing, as it were, in the Middle and High Schools, instead of being fostered so

After having whetted the appetite with these primers, elementary treatises present no difficulty. But the preparation of the Nature Study teacher does not stop there: science has never been acquired entirely from books. The teacher should cultivate, if he does not possess, the faculty of observation, and of taking pleasure in applying his book-knowledge to the teeming life around him. Then everything that breathes and moves and has its being has a wonderful story to tell.

Plea for Revision of the High School Syllabus :

Coming to the High School, we have a plea to make for the entire revision of the existing High School Syllabus for Elementary Science. Under the present rules every candidate has to study Elementary Science as a compulsory subject, but under the present syllabus this only includes Physics and Chemistry, but to a standard very close to that formerly demanded for the Optional Physics and Chemistry under the old rules, and it is much in advance of the syllabus for Elementary Science under Group B. This New Syllabus which commenced for Fourth Form only in June 1930, is based on the Madras S. S. L. C. Syllabus of 1929, but that Syllabus also included some Elementary Botany, Zoology, Physiology, Hygiene and First Aid, and in view of several good reasons we now wish to make, we desire to modify the present H. S. L. C. Syllabus to include these other branches of science, and we further consider that this will necessitate a slight reduction in the standard of Physics and Chemistry.

Our reasons for making this plea for a revised Syllabus are as follows :—

If we glance at the list of optionals, it will appear that the Madras Board has not ignored such sciences as Botany, Zoology, Physiology, Hygiene and First-Aid by giving exclusive preference to Physics and Chemistry, for the subjects appearing under group "C" include Botany and Physiology and Hygiene. These subjects are expected to

one or more from among the more prominent in these groups. The following listed statement of the scope of Nature Study is given for the sake of clearness :—

1. *Vegetable Kingdom :*

   (*a*) Flowering Plants, such as the Jasmine, the Mango, the Banyan, the Rice Plant etc.

   (*b*) Flowerless Plants, such as Ferns, Mosses, Mushrooms

2. *Animal Kingdom :*

   (*a*) Mammals, such as the Ape, the Whale, the Tiger, the Horse, etc.

   (*b*) Birds—of the Villages, Hills and Valleys.

   (*c*) Reptiles, such as Crocodiles, Tortoises, Lizards and Snakes.

   (*d*) Amphibians, such as the Frog.

   (*e*) Aquatic animals, such as the Fish and the Eel.

   (*f*) Insects, such as the Ant, the Bee, the Moth, and the Butterfly.

Space does not permit here to give the details of a proposed syllabus for Nature Study and Elementary Science suitable for the Primary and Middle Schools, but those interested in the subject will find this printed in the "Hyderabad Teacher" for April—June, and also it has been printed on separate leaflets for distribution at this Conference. An innovation into the ordinary Nature Study syllabus is the inclusion of a carefully graded treatment of Elementary Human Physiology, Hygiene and First Aid.

The Teacher of Nature Study :—

For the adoption of the treatment outlined above, it is essential that the teacher should have had scientific training and be acquainted with the principles of Botany and Zoology. There are many popular publications of these sciences, in which they are treated in such an easy and non-technical manner that they read like romances.

Another aim is to make the boys appreciate what they see. Mere description of objects based on observation has no lasting interest unless it be inter-woven with stories from real life; from adventures and explorations. If the description has this spice of romance and wonder in it, it is amazing how avidly it is absorbed.

It also gives great opportunities for making the boys real lovers of nature, through continued appreciation of it, and the love of God's creation through understanding and appreciation is one of the noblest aims in life, and Nature Study has this aim as its crowning achievement.

Another aim is to encourage the instinctive spirit of enquiry in small children, since this is the basis of all our vast scientific knowledge.

Scope of Nature Study :—

From the school point of view we consider the scope of Nature Study should include all which is included in the two great divisions of the living world, namely Animal and Vegetable. Small boys are not particularly interested in non-living matter, and even light reading in Astronomy, Meteorology and Geology should be omitted, at any rate in the lower classes.

Even in the two main Kingdoms mentioned, those microscopic cellular forms in which the two kingdoms merge into one, and become identical, will have to be, for obvious reasons, ignored, and only the well developed and well-differentiated examples will have to be included in the scope of Nature Study.

We suggest that a great deal of the inanimate Nature Study, as mentioned above, is so closely related to modern Geography that it could very well be left to that section.

Even the two remaining phases of the subject, namely the Animal and Vegetable Kingdoms, present such a vast field that at first sight it seems an impossibility to even master both of these. But Science has marshalled them into a handy number of groups, and Nature Study picks out

as an optional subject in the Osmania Matriculation Examination." The matter is still under consideration.

6. "In view of the need for introducing Vocational Education in all grades of schools, this conference recommends that until provision is made in the state for the training of teachers in Manual Instruction, an adequate number of stipends should be sanctioned annually by the Government to enable the teachers who have special aptitude for the subject to undergo a course of training in British India." The matter is still under consideration.

SYED MOHAMED SHARIF MUSHADI,
General Secretary.

Science in Relation to Everyday Life Sub-Committee's Report.

This report of the sub-committee appointed to deal with the subject "Science in Relation to Everyday Life," commences with the subject of Nature Study in Schools, since it may be considered the real basis and foundation of all other specialized scientific investigation.

Aims and Objects of Nature Study :—

The immediate aim in teaching the subject is to foster the habit of observation along well-defined lines. Small boys, as a rule, are naturally observant, and the teacher's work is not so much to encourage them to observe, as to direct their observation in the right direction, along channels which in the course of their passage through the school will bring out the analytical type of their perception when observing other scientific phenomena.

given the advantage of privilege leave with full pay in advance, not exceeding four months, for the performance of Hadj or a visit to the Holy lands or Jatras at least once in their whole service." The matter is still under consideration.

The Fourth Annual Conference held in Amardad 1339 F.

1. "This conference recommends that Science, including Hygiene, should be made a compulsory subject in the Middle stage and that immediate steps should be taken to provide each Middle School with a qualified science teacher and a well equipped laboratory." According to the present syllabus, science has been made compulsory, but the provision of qualified science teachers and well equipped laboratories is still under consideration.

2. "This conference recommends that with the view to make instruction in Oriental languages more efficient, provision should be made in the Osmania Training College for training such teachers with oriental qualifications as are in service at present." The matter is still under consideration.

3. "In the opinion of this conference it is high time that a school for defective children was started at the Head-quarters with a hostel attached thereto" Attention is being paid to this question by the Government and Mr. S. Ali Akbar was sent to Calcutta to inspect the schools for the Deaf and Dumb and the Blind there.

4. "That in view of the large volume of illiteracy prevailing in the state, this conference urges the necessity for taking vigorous steps for the advancement of Adult Education at the Head-quarters as well as in the Districts." The number of such schools is increasing in Hyderabad City and as regards the districts the matter is under consideration.

5. "This conference recommends that, as in the H. S. L C. Examination, commerce should be introduced

2. " That, in the opinion of this House, in view of the climatic conditions in the Deccan, the school hours should be from 9 a.m. to 3 p. m. with an interval of one hour from June till February and from 7-30 a.m. to 12 noon with an interval of half-an-hour during the rest of the academical year." Public opinion is being invited on the subject.

3. " That in the opinion of the conference the introduction of the system of Provident Fund for the benefit of employees of the Aided Schools is a measure calculated to ensure the stability of service in such schools, and that in view thereof, this conference requests the Government to take early steps in the matter by appointing a thoroughly representative committee for formulating a scheme and submitting it for sanction." The system has been introduced in Secunderabad, Residency and a few schools in the Hyderabad City and steps are being taken to popularise it and make it generally applicable.

4. " In the opinion of this conference there is an imperative need for introducing Elementary Science as a compulsory subject in the Osmania Matriculation and H. S. L. C. Curriculum." The subject has been already included in the new curriculum.

The Third Annual Conference held in Amardad 1338 F.

1. " That this conference requests the Government that special consideration should be given to the children of the employees of Education Department, in general, and the orphans, in particular, in awarding scholarships." The matter is still under consideration.

2. " In the opinion of this conference it is imperative to revise the present History and Geography courses of the Primary Classes and the First Form at an early date and that History of India be introduced in the First Form instead of the History of Dominions." The necessary alterations have been made in the new curriculum.

3. " This conference requests the Government that besides the summer and winter vacations, the teachers be

A. The courses of studies in the different subjects prescribed for public examination be so revised as to ensure that in no subject the standard fixed be higher than that adopted for the corresponding examination of the Madras Presidency.

B. " That the present cumbersome system of maintaining the H. S. L. C. records and registers be simplified by restricting the entries to the filling in of the marks obtained at the School Terminal Examinations and the Government Public Examination."

C. "That in case of candidates failing to get 35 of the agregate marks in any subject of groups A and C at the Public Examination, they may without prejudice to their claim for grace remarks, available under the rules now in force, be given the benefit of moderation and other concessions indicated on Pages 28 to 30 and 32 to 33 of the H. S. L. C. Calendar." The authorities are taking the necessary steps.

4. " The conference pleads for an adequate representation of those who have actual experience of teaching in schools with a view to their being appointed examiners or moderaters of the H. S. L. C. and Osmania Matriculation Examinations." The matter is under consideration.

5. " This conference is of opinion that the standard of additional languages in the Middle Examination should be made uniform." The Middle Examination has since been abolished.

The Seeond Annual Conference held in Shahrewar 1337 F.

1. " This conference is of opinion that it is high time that in the high school stage the differentiation in the syllabuses of the Osmania Matric and H. S L. C. courses be abolished and that steps should be taken to combine the two systems." The disparity has now been almost abolished.

bition, leaving thus a net balance of Rs. 987-2-3 at the end of 1339 F.

The "Hyderabad Teacher."

The magazine has completed the fifth year of its existence and is being run on efficient lines. No marked change has been made in its editorial staff, except that the work of Mr. Sebastian, who left for England, was taken up by the rest of the staff. Rev. Philip, Mr. Abdul Noor Siddiqi and Mr. Fakarul Hasan Mullah have been working with their usual zeal. I regret to have to state, as usual, that the journal has not yet become self-supporting and that it continues to be run by the Association at a financial loss.

During the year under report, the Association suffered a heavy loss by the sudden and untimely death of Mr. Abdus Salam, Nazir of Schools, Bidar, who used to take a keen interest in all the activities of the Association, especially the annual conferences.

In conclusion, it would not be out of place were I to enumerate the Resolutions passed at the previous Conferences and let you know what action has been or is being taken in regard to each of them :—

The First Annual Conference held on 19th Amardad 1335 F.

1. "In view of the pressing need for providing suitable buildings and play—grounds for schools, this conference requests that Government may be pleased to take early steps for supplying this need." Steps are being taken as regards this as far as the budget allows.

2. "That in the opinion of the conference there is an imperative need for a systematic Medical Inspection of Schools." This is under the consideration of the Government.

3. "This Assembly of Teachers in Hyderabad desires to place before the Government for favourable consideration the following suggestions for improving the conditions under which the H S.L.C. Examination is held."

Co-operative Society.

The number of members of the Co-operative Society, organised last year in the office of the Divisional Inspector of Schools, Head quarters, at the suggestion of this Association, rose from 49 to 66 during the year under report.

Miscellaneous.

1. During the year under report, the All-India Federation of Teachers' Associations merged itself into the All-Asia Educational Conference, which was held at Benares in Christmas last. Mr. S. Ali Akbar, M.A. (Cantab), Divisional Inspector of Schools, Head-quarters, the President of the Association, Mr. S. Fakarul Hasan Mullah, B.A., B.T., Head-Master Government Middle School, Chanchalguda, and Mr. Abdul Noor Siddiqi, B.A., B.T., Head Master, Government High School, Darusshafa, attended the Conference.

2. During the year under report, a fresh stock of books was bought for the Library of the Association from its own funds. The thanks of the Association are due to the Education Department for sanctioning a lump-sum grant of Rs. 1,000 and a recurring grant of Rs. 15 per month for the purchase of books.

3. The question of organising a Central Association for H. E. H. The Nizam's Dominions is still under consideration.

4. The application submitted to the Government for a grant to the Association has not yet been sanctioned.

The Financial condition of the Association.

At the end of the year 1338 F., the Association had a credit balance of Rs. 1,120. In the year 1339 F., in addition to the subscription payable to the All-India Federation of Teachers' Associations and the travelling allowances for the delegates to the Federation Conference, an expenditure of Rs. 300 had to be incurred on behalf of the *Hyderabad Teacher.* Besides, Rs. 270 were spent over stationery and allowances and Rs. 287-15-6 over the Conference and Exhi-

section 4-B, of the Byelaws of the Association has increased from thirty to thirty-six.

Meetings of the Central Executive Committee.

During the year under report four meetings of the Central Executive Committee were held at which, according to the rules of the Association, the programme of the monthly meetings was drawn up in advance, the budget was prepared, the office-bearers foi the year 1340 F. were elected, auditors nominated and the sub-committees on the subjects selected for the Conference appointed. As usual, the work of the Conference was facilitated by the formation of the Exhibition Committee, Reception Committee, and the Programme Committee.

Monthly meetings.

During the year under report, the following eight subjects were discussed at the different centres of the Association, all bearing on the three subjects announced at the last conference.

1. The Teaching of Nature Study in Primary classes accompained by a Model Lesson.
2. Science in Daily Life.
3. The Place of Physiology and Hygiene in the Curriculum.
4. Moral Instruction in the Class, at Home and in the Hostels.
5. Out-door Games as a means to Moral Instruction.
6. Boy Scouting as a means to Moral Instruction.
7. Drawing as a means of directing children towards natural appreciation.
8. The correlation of Drawing with other subjects

General Meetings.

No general meeting was held during the year under report.

of the title of Sultan-ul-Uloom in Hyderabad truly combined in his personality not only the name but the substance of the attributes which the words connote. May the destiny of more than a crore of human beings remain long in the hands of a Sovereign who has flung open the doors of his treasury for their education !

Extracts from the General Secretary's Report on the working of the Hyderabad Teachers' Association for the Year 1930—1931.

Translated by

SYED ANSAR AHMAD B. A., B. T. (ALIG)

The Hyderabad Teachers' Association has been successfully attempting to carry on its work for the past six and a half years in conformity with its rules and aims, and now on its seventh anniversary we have assembled here to hold the Fifth Annual Conference and discuss some important educational issues. During the year under report, the Association concentrated on the following subjects :—

1. Science
2. Moral Instruction in Schools.

Branches of the Association.

There has been no increase or decrease in the number of branch associations, which remains at 14.

Members of the Association.

The number of members has increased by about twenty-five, the total number of members now being 1125. The number of members who have been enrolled under

The warrior's voice may sink before yours. Your pupils may come to echo what you have taught them in the cause of humanity, and thus indirectly you may become the dictators and saviours of humanity itself. At present, the atmosphere of humanity looks to me dark and gloomy. The clashing of racial and economic interests in the world today do not portend a happy augury. But in the manner in which the teachers of the world are organizing themselves, I see a ray of light, I see even a silver lining. If the teachers of the world unite to train all students in such a manner that they may come to respect life more than anything else, that they may rise above colour, caste and creed, it may solve many a problem of humanity. May your organizations be successful!

There is one more remark which I may be permitted to make in connection with your Conference. The Resolutions which you pass year after year shall be of no avail unless you maintain a vigilant Executive Committee to see that the case of Teacher is properly represented before the Government. I dare say that at least as long as Sir Akbar Hydari is at the head of the Finance Department, no Government in India—whether British or State—will be found more sympathetic and helpful to the cause of Education as your own. You have only to convince your Government of the justice of your cause and you are bound to succeed. However, much will depend upon the presentation of your case and the methods that you adopt. Judge of the success of your Conference by actual and practical results. To achieve this end your Executive Committee should ever be vigilant and never go to sleep.

11. Prayer for His Exalted Highness.

If the future historian describes the present period as the Renaissance period of Hyderabad, he will not be wrong. After describing the activities of the different branches of Administration when he reaches the subject of Education, he shall have to admit that the present holder

been accustomed to do is to copy the curriculum from other foreign institutions and do not attach sufficient importance to our real needs and requirements. We want special medicines for the special diseases of our own students. Patent medicines will not do. It is this trend of my thought which induced me to make the several suggestions that you find under the headings of 'character,' 'physical culture.' 'Female education,' etc What is Italy doing today? Its Education minister has got the conception of an ideal Italian. The whole education is being moulded to fit in with that conception To achieve your object, you may have to change the curriculum of your teacher's training also. I feel that a break from the past is absolutely necessary. The old mould will go on turning out scholars of the old type with which the country is not satisfied. A bold and vigorous policy in the framing of curricula and adoption of new methods of teaching is the need of the day.

10. Importance of Teacher's Conference—vigilant Executive Committee to be maintained.

My teacher friends, I have almost finished now. I come before you as a friend and not as an adviser. I told you what struck me as a friend. The thing which strikes me most today is the efforts of the teachers all over India to cooperate and organize themselves, and the thing which pleases me most is their atitude in rising above all considerations of caste, creed and even all predelictions and prejudices of territory in their organizations and in trying to merge an All-India Federation of Teachers into an All-Asia Federation; and who knows, the next step may be to merge the All-Asia Federation into a World Federation of Teachers. If this continues to be the mentality of teachers of the present generation, the world may be saved from many a harrowing scene that humanity had the misfortune to witness during the last one hundred years in the history of the world. Your present Association may eventually prove to be only a branch of a big Association of the future which may rule the destinies of humanity.

city. A few miles trip can open his eyes. A day spent in taking the boy round and explaining to him what the fort of Golconda and the Qutub Shahi tombs mean from the artistic and historic point of view, will be more educative than the dry reading of a book. What I mean is that such trips may be included in the curriculum and one of the tests for judging the ability of the student may be how far he has utilized such sources of education in his country and home. In Germany, I saw whole class of boys and girls being taken out for this purpose. This again means the addition of a mark carrying subject to remove a particular defect. The question of physical culture also may be looked at from the same point of view. I believe that during the last fifty years no school student in the world had to bear a greater strain for the purpose of passing his examination than an Indian student. Much of this strain has been due to medium of instruction, But so far as this State is concerned, this difficulty has been greatly overcome. All the same, I believe much remains to be done in the matter of prescribing and arranging subjects of study in different classes, so that sufficient time be left at the disposal of a student to attend to games and sports. My own impression is that a student who is anxious to pass in the first class is always complaining of the want of time to attend to his physical exercises. To remove this defect, physical fitness may be made a subject which carries marks. In short, the result of keeping the defects in view before prescribing a curriculum may be that a few subjects at present thrown in the background may occupy the front rank and vice versa. Similarly, if you want to fix a curriculum for girls' classes, first think of your requirements as an Indian, then imagine an ideal Indian girl, and after this, proceed to fix the curriculum in such a manner as to fit in with that ideal. If you find that according to our present needs, an ideal Indian girl ought to know much of Trignometry, Algebra and European History, fix these subjects by all means, but if you come to a contrary decision, then make necessary alterations. What we have

those qualities which are inherent in the mental constitution of the boy than upon trying to store in his mind ideas which may ever remain undigested. An essay will probably occupy more importance in the curriculum than the mere explanation of words and phrases found in a text book. The books prescribed will serve as guides only. The present fixed and rigid rules of courses afford less scope for the play of spontaniety or development of human energies on national lines. We may have to alter the position of the different courses and subjects in such a manner that the examination results may bear some relation to the extent to which the above defects have been remedied by our students. At present, we do not care so much for efficiency in real learning and education as for efficiency in administration and for the number of passes which each school shows at the end of the year. We are inclined to attach more importance to number than to quality or nature of education. This angle of our vision towards education ought to be changed. Education does not mean storing a few facts in the brain of a student. It means development of the whole man. Similarly, in fixing the curriculum of the three R's, the general social condition of the village life is to be kept in view. Weaning our students altogether from that life will be disastrous. If we approach the subject of curriculum from the above point of view, a few subjects may have to be dropped from the curriculum and new ones may have to be added. For example, to cure the defect of character, even the general conduct of a student in the class and the teacher's note book as to the general behaviour of each of his pupils may carry a few marks like any other subject prescribed in the curriculum. This means the addition of a subject. Again, we may fix books which show India in its true perspective, which inspire in the student a love for his home, surroundings and civilization. Songs on national lines may even be sung, if necessary. Say, a student in a Hyderabad School should be made to realize and understand the beauties of old architecture that he meets all round the

of British India also. The present position is this. There is an old plan or structure of curriculum for different classes. We go on making slight alterations here and there without changing the system or the policy that underlies the same. The result is that if there has been a mistake of policy in the past, it is perpetuated in the future. There is no break from the system whatever may be our changing needs and requirements. What I want to say is that in fixing the curriculum, we often ignore our real requirements. Perhaps my meaning will be made more clear by the following illustration. Suppose we think first of the present defects of our boys and having found them out, then think of the remedy This will be the natural order of proceeding. The diagnosis should be before the prescription. If we start like that, we may find the following defects in our students.

(a) Want of creative thoughts and ideas, and want of initiative.

(b) Ignorance of what is good in the East, and a tendency to be detached from the past and the actual realities of Indian social life. In other words, education is not in harmony with their social environments.

(c) Want of character.

(d) Want of physical culture.

(e) Want of appreciation of Fine Arts with special reference to their country.

I note these five defects simply to illustrate my point. Having first placed the above defects before us, we should then proceed to fix our curriculum in such a way as to remedy these particular defects. For instance, to cure the first defect, namely want of creative thoughts, our curriculum should be so prescribed as to give greater scope to students for self growth, self consciousness or self-expression. We should not be tied down to books in the manner it is done now. If we proceed in the above order, we shall in teaching the students probably try to lay greater stress upon eliciting

Senior and Junior Cambridge classes in a Girl School can be to our girls. Five per cent of the girls may find some use in that but for the sake of 5 per cent we are sacrificing the real interests of 95 per cent of our girls. For our girls a different line of development has to be chalked out. I know that a few changes have been made in the curriculum of our girls' schools but they fall short of real requirements. I do not desire to develope this point any further. It is sufficient to say that the matter is a serious one and deserves the immediate attention of those authorities who are in charge of the Educational Policy of the State. As far as the question of Lady Teachers is concerned, I want to make one remark. Parents who are inclined to look upon this question from a pecuniary point of view cannot find a nobler and more useful occupation for their girls than the one of Teaching. The statistics of Indian Education as a whole show that people are awakening to the realities of the situation. If our country is to take its proper place in the list of advanced and civilized nations of the world of today, Female Education is indispensable. Day by day, the demand for Female Teachers is getting greater and greater than the supply. The time is coming when our Female Teachers will be able to dictate their own terms. The sooner our State decides upon a definite system of Female Education and opens classes for training girls to serve as Female Teachers, the better it is.

9. Curriculum in Schools.

In telling you how to fix the curriculum of different courses in schools, I am afraid I am trespassing upon your prerogatives and pretending to know subjects of which I cannot claim to be an expert. But the subject of Education has often occupied my mind in the past and you will pardon me if I place my ideas before you on this point. It seems to me that in framing the curriculum, we have been proceeding in a wrong order. We have been putting the cart before the horse. I am speaking in a general manner without thinking of the exceptions which may be existing here and there. What I say applied not only to this State, but to the greater portion

rightly or wrongly, the position is changed and the teacher does not hold the same position. However, the teaching profession should be tempting enough to attract our best men. Rich as he is not, I entirely agree with the proposal of providing special facilities for the education of the children of a teacher, of opening a Provident Fund for him, and of doing everything that helps him to discharge his duties with as little a distracted and troubled mind as possible. Further, if titles conferred by a State convey recognition of service to the public if precedence in Durbars and other official functions connotes social status, then I do not see any reason why the services of the best amongst them be not recognized in that also. I further think that it is possible to confer upon them greater liberty and power than they enjoy at present in matters that relate to teaching. In short, there is a great scope for raising the status of teachers. All the same, the teachers may well continue to maintain that high and noble conception of their profession which always prevailed in India where teaching was considered to be more of an act of piety and service to humanity than of a lucrative job. People took pride in teaching others. Unless a teacher is imbued with such high ideals and inspired by such noble motives, he can never do full justice to his work.

8. Female Education.

To-day, nobody can deny the value of Female Education from the national point of view. Illiterate girls can become a greater drag upon society than illiterate boys. It is question of the education of one half of humanity. It is an economic question also. Without their education, we are deprived of the advantage of such of human energy and intellect, which if properly enlightened, and utilized will add to our wealth and resources. In this connection, there is one thing which I remarked in 1925 when I presided over the Educational Conference of Hyderabad, and which in view of its importance. I may be pardoned to repeat. The education of our boys and girls need not be on similar lines. I cannot understand for a moment of what earthly use the

makes a lot of difference in the formation of character. There is great difference between a teacher who comes to the class, opens the books and tries simply to explain the meaning of words and phrases found in a sentence unintellgible to his pupil, unmindful of the effects of the lesson upon the character of the pupil and a teacher who keeps the ideas and the object of the lesson before him, puts his heart and soul into it, and then tries to infuse high ideals of life through his voice, gestures, and force of speech. In a few seconds, a teacher, can, I believe, wake a sleeping boy without touching him, and imperceptibly convert a laughing face into a serious one simply by the method of teaching. How many a judge goes to sleep on the Bench by the montonous methods of the arguments of a counsel and how many of them wake up if the counsel mingles his arguments with a little lively spirit and excites human interest by the method of putting his case. Day by day, month after month, the teacher may gradually creep into the inner recesses of a pupil's heart and mind; and work there quietly until the pupil begins reflecting many of the attributes on which the teacher has set his heart to impart to him. A good teacher can seldom fail to leave a permanent mark of his personality on the character of his pupils. You raise the moral tone of teachers and the character of pupils will rise. Lower the same, down and down will sink the character of boys. I think that the question of the formation of the character of our students is a question closely related to the question of training and education of our teachers.

7. Status of teachers to be raised.

A teacher's profession is one of the noblest in this life, but from the pecuniary point of view, it can not be said to be very paying. A teacher is a man after all. He is a man of family and has got his own share of the cares and anxieties of this world. In olden days, the ties which bound a pupil to his teacher or 'guru' were in no way less sacred than those which tied him to his own father. In one sense, a teacher was considered to be the absolute master of the pupil. But now

The question of the formation of the character of our students has been engaging the attention of all educationists and thinkers of India. Every one seems to be agreed on the point that our present system of education is not helping us as much in the formation of character as we expect it to do. Nobody can deny that sports, games and Scout movement can help us a great deal in this direction and every encouragement is to be given to them. It is equally true that home influences play an important part. However, at present, I am confining myself to that factor in the formation of the character of students which is represented by the teacher's influence inside and outside the class room. Ethics and moral teaching may or may not be included in the curriculum, but if a teacher wishes to impress certain principles and rules of conduct upon the mind of his pupils, he gets innumerable opportunities to do so. On the play ground, he can teach how to mingle self respect with humility, modesty and courtesy; how to respect those who fairly defeat their opponents in games; and how to love certain qualities of man for the sake of qualities independently of caste and creed. In the class room, when he comes across a lesson the object of which is to teach some rule of morality, he can take hold of the same and devote a few minutes in amplifying, illustrating and laying stress upon it. Say, there is the question of truth. The teacher may lay aside the book for a moment and rise to the occasion. I have no doubt that a good teacher can keep the class spell bound for a few minutes in describing what Truth is, how it permeates every thought of man, what its beauties are and how it moulds human character. When a lesson shows an act of bravery, a good teacher can really keep the whole class in a state of rapt attention by describing some of the brave deeds of the pupil's own countrymen. I am afraid I am trespassing upon a ground foreign to me in assuming the role of the teacher of a teacher. But what I can confidently state as a layman is that the method of teaching

6. Formation of character.

I can say as a father that one of the greatest needs of the day is the co-operation between teachers and parents. I think that the guardians of pupils will welcome the idea, if it be possible to fix a guardian's day in every two months so that the guardians and teachers of a school may meet and exchange views on the most vital questions relating to the future education of their wards. Apart from the advantages which will flow from knowing exactly the strong as well as the weak points of his ward, a sensible and thinking guardian can elicit much from the tutor which will enable him to form a correct opinion as to the future career or profession that his ward may be directed to follow in view of his special aptitudes, inclinations and educational capacities about which he, the guardian, himself could not be a good judge. How many blunders in this respect have been the cause of the ruin of the future career of our boys. How often attempt is made to put a square nail into a round hole. The teachers will in any case impress upon the parents the absolute necessity of forming opinion on this subject in the early stages of the life of the boy. Every teacher may be required to keep a confidential note book in which short entries may be made as the result of his observations of the conduct and character of different pupils with whom he has to deal. It will be helpful in many other ways also. If the Government accepts the principle of making an effort to bring the guardians and teachers together, I think it will be possible to devise some scheme to the mutual advantage of both. At present, the position is that the son may read in a school for years and may even finish his school career, but the father may get no opportunity even of seeing the teacher who is training and educating his son. Anyhow, some practical steps should be taken to bring about greater co-operation between teachers and parents than it is done today, and this, I believe, is possible.

5. Co-operation between parents and teachers.

been punished with total extinction for this neglect. Investment in the welfare of the children and students of a State is the best possible investment. Syed Mohammed Husain Saheb Jafri has recently written a valuable book in Urdu entitled 'Denmark and the system of its Education.' which contains his personal observation on the subject. It shows how much attention Denmark bestows upon the medical inspection of its students in public schools. As a matter of fact, the State is more interested in the physical welfare of its people than the parents. Whatever may be the respective duties of parents and the State in a matter like this, one point is clear. The parents may die away within a few years and be relieved of all the troubles that follow the physical unfitness of their issue, but the State survives and goes on suffering for ages for the physical unfitness of those who constitute the mainspring of its wealth. I have been informed that the matter of medical inspection is before the Government. I hope that the question will receive a favourable consideration.

Lastly, I would say that if the teachers want their pupils to take interest in sports, they themselves as a body should take more interest than what they have been doing in the past. I would expect every teacher to be on the play ground daily. You may consider this rule to be extraordinary and too hard. But today our people are in the most critical stage of evolution. We want to accelerate the speed of progress. We can not afford to wait. Extraordinary efforts are needed to meet an extraordinary situation. What Turkey has started doing in the cause of Education illustrates my point. Besides, the nerves and muscles of teachers are as much subject to the laws of physical science as those of their pupils. We may go so far as to make interest in games a condition precedent to the appointment of a teacher. I have no doubt that greater interest shown by teachers in sports will be followed by a corresponding increase in the interest shown by their pupils.

another of Rs. 500 per annum, may be opened for the best thesis on Educational subjects written by the members of the Conference. This I believe will give an impetus to the cause of teaching.

4. Physical culture.

Since the discovery of a close connection between physiology and psychology, it has become quite clear that proper mental culture is impossible without physical culture. Our State has not been behind any other in recognizing its importance. A teacher of European qualifications has been placed in charge of this branch and attempts are being made in different ways to look after the physical welfare of students The scout movement is being encouraged in every possible manner All the same I may be permitted to make two suggestions :—

Firstly, the physical condition of the boy should carry some marks in examination results. If a register be kept of students attending sports and games or some scheme be devised under which it may become possible to find out the respective merits of students qua their physical fitness for the purpose of carrying a certain percentage of marks—however small that percentage may be—I have no doubt that this will give an impetus to the cause of physical culture. I can imagine a few practical difficulties, but I do not think that they are insurmountable.

Secondly, the medical inspection of boys, both in Government and aided schools should be made compulsory and such an inspection should be followed by some practical steps to remedy the defects. The store of the general health of our students is a national asset. Who is responsible for the preservation or economic use of this treasure? Just as a father who neglects the mental or the physical culture of his son is punished severely at the end in his old age in the shape of consequences which follow such culpable deliquency on his part, so does a State bear the consequences sooner or later of the mental and physical deterioration of its people as a body. Under the laws of human society, nations have

3 Teachers to keep pace with the Science of Teaching.

the status of a regular Science. The art of Teaching is one of them. I belong to the profession of law and I feel that if I do not keep myself in touch with the current developments of Law and Rulings of High Courts, deterioration and stagnation set in and I can not discharge my duties conscientiously. I believe that the same rule applies to every man of the Teaching profession. Methods of teaching have already undergone many changes. Appeal to the heart has replaced the rod. Mind, memory and imagination are approached more effectively through senses and therefore teaching everything through senses is now considered to be the best method, but how to do it, depends upon the skill and knowledge of the teacher. The doctor who treats the outward man—the body—is required to possess a thorough knowledge of all the organs of the body, before he is able to prescribe for its diseases; but the machinery of the inner man—mind, and mental powers, which rule over the outer body—is much more complicated and delicate and equally requires a knowledge of the principles which regulate the same. It seems to me that for a teacher to be successful, not only a knowledge of physiology and psychology of man is essential, but he should keep pace with the daily progress of the Science of the art of teaching which goes on 'pari passu' with the advancement of knowledge as to the workings of the inner faculties of man. But a teacher generally is too poor to invest money for all the current journals and books on Education. As a rule, his remuneration is not commensurate with the nature of work entrusted to him. I understand that your Conference is going to suggest the opening of a Refresher Course which of course is the best practical and effective way of securing the object. I would however further suggest that the Government may provide the Conference with a handsome library containing books and current journals, mainly on Education which may be circulated amongst its members. The grants so far made for this purpose are not sufficient. Besides, the grant of two prizes, say one of Rs. 1,000 and

efforts which the present Director of Education has been making in this direction. One of our Conferences appointed a Committee to consider the question of Vocational Education and has already furnished a thoughtful Report. But for want of a definite Government policy in favour of Vocational Education, the speed of progress is not as good as it ought to be. The resources of the Government are not unlimited. The Government cannot afford to maintain many of the present type of Secondary Schools side by side with those schools in which attempts may be made to train and educate wealth producing citizens and units of society under the new policy. A few old channels in which the tax-payers money has been flowing may have to be dried up, and fresh channels may have to be dug to which old currents may be diverted. The work of expansion in Education may have to be stopped and the work of consolidation on right lines may begin in right earnest. We may have even to close a few Intermediate Classes lately added to some Secondary schools, not because they are quite useless, but because the gain is not proportionate to the money spent which can more profitable be employed under the new policy. Every future scheme and every new grant for Education will have to be tested in the light of the new policy. If we continue the present type of education which simply goes on adding to the list of unemployed literates every year we shall be complicating the problem which our State will have to face sooner or later as the signs of the times show. There can be no fear of agitation in giving this new turn to Educational policy I believe that the people will welcome the change. The present school will not be closed but will be reformed. In the same institution we will be closing a few doors which have been making the room stagnant and opening new ones which may bring fresh air and breeze. If the Government be inclined to initiate this policy in right earnest, I suggest that a strong committee of experts be appointed to give full effect to it as soon as possible.

During the last fifty years, many arts have acquired

light of education is better than the total darkness of absolute ignorance, to that extent it is good, but the economic forces which we are working in the world today force us to cry a halt and think whether the time has not arrived when we should change the very type of Secondary Education which we have been pursuing in the past Now the position is this. I as a parent, have begun thinking seriously how far my son has lightened my burden. I, as a citizen and a tax-payer have begun thinking how far the added number of scholars in schools will proportionately add to the wealth and prosperity of the State to which I belong. The cultivator of soil whose son is reading in a Government school has begun thinking how far the type of education provided for his son has been helpful to the family as a whole, or even to his profession as a cultivator. These are the questions confronting us now as parents, as citizens and as laymen. The reply is not satisfactory. I feel that the number of those whom I have been disappointing as an official in the matter of employment is increasing year after year. I feel that my cook and butler are probably earning more than the salary which some matriculates or even under-graduates educated under the present system would be willing to accept to find some sort of job to support them. Many statesmen think that half the causes of unrest and agitation in British India are economic. If it is true that the increased number of scholars of Secondary Education has resulted in increasing the number of unemployed, then it becomes a matter for serious consideration for the State how far these scholars have really added to its strength and how far the expenditure over them has been justified by results. There is overwhelming evidence to show that the present type of general education given in our Secondary Schools requires far reaching and drastic changes in favour of vocational education. In this matter, we can learn much from Germany, from Denmark and from many other advanced European countries. I do not want to spin out a point which seems to be admitted now. I am not unaware of the

where the shoe is pinching, though I may not be able to point out how to mend it. For the privilege of affording me this opportunity to express my views I thank the Association.

2. Definite and real change of policy in Secondary Education necessary.

Education has got three stages—Elementary, Secondary and University. At this place, I am dealing mainly with the second stage, viz , Secondary Education. About six years ago, I had the honour of presiding over the Education Conference of Hyderabad. On that occasion I laid much stress upon the necessity of defining and adopting an Educational Policy suited to the present requirements of the country. I then tried to point out in my address how the present system of Education originated and how it outlived its real purpose and object. I do not want to travel over the same the ground again, but in view of the importance of the subject, you may permit me to repeat some of the ideas then expressed though in a different form. Be it far from me to belittle the efforts which the Government have been making to advance the cause of education. Within the last fifteen years, its expenditure on education has swelled from a few lacs to about eighty lacs a year. Yet, I may be pardoned if I state what I believe. This education has not succeeded in proportionately increasing the number of self-supporting useful economic units of society. To me, the reason seems to be that we have been lacking in framing and giving effect to a definite Educational policy that may meet the requirements of the present times. We found a certain type of Secondary schools inherited as a legacy. We have gone on simply adding to the same type of schools. During the last few years, our Middle and High Schools alone have gone up from about 109 to about 155 and the number of scholars in these schools from about 25,000 to about 42,000, but the nature of Secondary Education given in these schools has not undergone any substantial change. Nobody can deny that the current type of education has advanced considerably and in as much as even a ray of the

something new every year. Sometimes the new method does not work. Even so, it is better to have tried and failed, than never to have tried at all. There is no better job in the world than teaching; none more important; none with effects so far-reaching and it is almost a crime if we don't use the best knowledge and the best methods available. This Conference should help us toward that. In the name of the Reception Committee may I express the hope that in these and in other ways, the Conference may prove a great success.

Presidential Address

BY

Nawab MIRZA YAR JUNG, Bahadur,

Chief Justice, H. E. H. the Nizam's High Court, Hyderabad

Ladies and Gentlemen,

1. Thanks.

I feel it a great honour to preside over the deliberations of an Association whose members have devoted their lives to the noble work of training and education of those who are going to be the custodians of human knowledge and who may have to play the role of future leaders of thought in this country. My teacher friends, I feel that I cannot enlighten you much on many technical matters relating to your profession as to which you are best qualified to express your own opinion in the form of Resolutions that are going to be moved in this Conference, but you would probably like to know the views of parents and citizens whose children you teach and who are in the best position to know how far the fruits of your labour have been sweet or sour. Whatever I say in this address, it will be in the capacity of a parent, a citizen and a layman. In that capacity I can say only

they should be) but they can't be permanently unaffected by the pressure of well-informed and well-directed public opinion. As a matter of fact our own Department has been. In looking back over past records, I have been surprised to find how many suggestions of the Teachers' Conference have already been accepted by the Authorities. Here are a few items (there may be more)—Medical Inspector of Schools; Revision of the H. S. L. C. Examination especially in making Science compulsory; Vocational Training; Physical Instruction; Provident Fund for Teachers: Abolition of the Middle School examination; The provision of a three years' course for the Osmania Matriculation. Resolutions on all these subjects have been passed at the Conferences of the last five years and in regard to them all, action has been taken. Only last Conference it was suggested that there should be a new syllabus for Primary and Middle Schools, and it is already in our hands in its resplendent yellow cover. Such a record should make it clear not only that the Education Department of the State is progressive but also that the proceedings of these Conferences have not been unfruitful. We have in this Conference a real instrument of educational progress, if we know how to use it.

There is another useful end served by this Conference—it keeps us in touch with new ideas. Of all the deadly sins that can beset a teacher, the deadliest is that of doing the same old things in the same old way. To get into a rut is fatal. New knowledge is streamimg in upon us from all sides at a prodigious rate, and the teacher whose mind is not open to it, is simply not doing his job. He ought to be on a shelf in a Museum among the fossils, and not an instructor of youth with its growing and enquiring mind.

No one can attend this Conference without getting new ideas and it is our duty to seize upon such ideas and, as opportunity affords, to try out new methods. We can't afford to be out-of-date. It is one of my maxims to try

We are also glad to have with us the Director of Public Instruction, because we know that he attends this Conference not as a perfunctory duty, but with a sympathetic and open mind desirous of furthering the best interests of teachers and schools alike. We miss Mr. Ali Akbar. As he is not present we can say what we like about him. As Chief Inspector he combines in an extraordinary way the office of official critic with that of friendly advisor. In my very young days as a teacher the visit of the Inspector was a most dread occasion. Both boys and staff trembled at the knees and consequently showed up at their very worst. Mr Ali Akbar does not create an atmosphere like that. He inspires respect without dread, and personally I feel grateful to him for his friendliness and for his really helpful suggestions. We also give a hearty welcome to all the teachers who are present and hope they will find in the Conference something of inspiration as well as information.

There are those who ask "What is the good of Conferences like this? Is'nt it all so much talk" full of sound and fury signifyiny nothing'? I entirely dissent from that view. May I be allowed to point out two very useful ends which this Conference serves?

It gives us, in the first place, an opportunity of expressing our views on the policy of the Education Department; of ventilating our grievances if we have any; of making suggestions for improvement in curriculum, organisations of schools, status of the teacher and so on. In a word it gives us a voice—even if no direct authority—in the management of the educational affairs of the country. And the more seriously we take part in the Conference, the more effective that voice becomes. Not that we shall get all we want at once. It is always easier to suggest reforms than to carry them out. But if there is sufficient reason and sufficient persistence in our demands, they cannot be altogether ignored. State Departments the world over are notoriously slow in action, (and there are good reasons why

The Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association
WELCOME ADDRESS

BY

Rev. L. SIMPSON B. A.

Principal, Wesleyan Mission High School, Secunderabad and Chairman of the Reception Committee.

I should like to express in one word my appreciation of the honour done to me in asking me to occupy this position to-day. I regard it as in no sense a personal tribute but rather as a recognition of the services of all my colleagues in Secunderabad. We from the regions beyond the Bund, cannot claim the same intimate relationship with the large educational family of Hyderabad as can the schools of this City. We are a sort of adopted son, but we are proud to belong to you and we are glad to have a place in the family counsels.

As Chairman of the Reception Committee it is my first duty and my great pleasure to extend a very sincere welcome to Nawab Mirza Yar Jung Bahadur our distinguished President. It is no small thing for one in his position to give up two whole days listening patiently to our discussions. We greatly appreciate his presence here and shall hope to reap the benefit of his trained and legal mind when he gives us a summing up of our proceedings. The fact that he has consented to preside at our Conference is an indication, I take it, of his interest in the cause of Education—possibly as a recognition also of his obligation to it. For may we remind you, Sir, that without schools there can be no courts, and without teachers there can be no judges. Indeed to put the matter modestly, we teachers are quite the most important people in the State. A country without teachers would make about as much progress as a motor car without petrol.

On Monday, 30th Amardad 1340 Fasli, special arrangements were made for the *Paradanasheen* ladies, Miss Webster being in charge of the arrangements for the benefit of European and Parsee lady teachers and visitors. Lady Ameen Jung Bahadur opened the Exhibition for the benefit of the lady visitors at 4-30 p. m. on the day, among whom were included lady teachers, pupils and other distinguished visitors who numbered over 3000. The whole compound of the City College, with the numerous motor cars and keenly interested visitors presented a gala appearance, thanks to the excellent arrangements made by Miss Webster and other Eurpean ladies. Though the function practically closed at 7 p. m , the bustle of the moving cars and the visitors continued till 8-30. p. m. The arrangements outside the Zenana zone were ably made by our enthusiastic Assistant Divisional Inspector, Mr. S. M. Khairat Ali, with the aid of the local police for regulating the heavy traffic, who also deserve our best thanks for the successful termination of this delightful function.

I cannot conclude this brief report of the Exhibition without expressing my sincere gratitude to Mr S M. Azam, Principal of the City College whose help not only in the matter of lending us the palatial college building for purposes of this exhibition but also in his valuable guidance, deserves special mention. I have also to thank the teachers of different schools and others who took part in making this exhibition a great success

NAZIR HUSAIN SHARIF,

Secretary, Exhibition Committee.

	No. of Prizes.
(xiv) A. V. High School, Bolarum.	1
(xv) The Girls Middle School, Machli Kaman.	1
(xvi) Primary School, Sultan Shahi.	2
(xvii) Osmania Technical School, Secunderabad.	1
(xviii) Sir William Barton Technical School, Secunderabad.	1
(xix) Madrasae Asafia, Malakpet.	1
(xx) Khadimul Muslimeen.	1
(xxi) Circle Drawing Master, Aided Schools, Hyderabad.	1

The Scout Prizes.

(xxii) St. George's Grammar School.	3
(xxiii) Afzal Shahi Rovers Troop.	1
Total	40

On the 26th Amardad 1340 Fasli, the Chief Justice Nawab Mirza-Yar-Jung Bahadur opened the exhibition prior to the commencement of the Teachers' Conference, who was pleased to express great satisfaction at the excellence of the exhibits and personally bought a copy of the photograph of H. E. H. the Nizam, as a mark of his approbation. On the next day the 27th Amardad, he was kind enough to distribute the prizes to the 40 winners.

The Director of Public Instruction was kind enough to sanction a special holiday on 28th Amardad to all the schools at the Head Quarters to enable the pupils to view the Exhibition. The day was a busy one, when over 15,000 boys from Secunderabad and Hyderabad schools visited the place to witness the exhibits. At the special request of the Principal of the City College, the following Sunday was set apart for the benefit of the boys of his institution and between 8 a. m. to 10 a. m. and 4 p. m. to 6 p m. on that day, nearly 1,300 boys took advantage of this concession.

for each exhibit, while this year the Central Executive Committee thought it fit to do away with this system, which perchance attracted a larger number of exhibits. The Central Executive Committee could not have made a better selection than that of Miss Webster, for the Chairmanship of the Exhibition Committee, in which capacity the talented lady made excellent arrangements, for which, I, on behalf of the committee, tender her our most sincere thanks.

The undermentioned ladies and gentlemen were appointed as 'Judges' for the award of prizes.

(i) Mr. Syed Mohamed Azam (ii) Moulvie Azeem Ali Saheb, Government Architect (iii) Revd. M. Clarke (iv) Mrs. Jabbar, B. A., L. T., Principal Zenana Training School, Hyderabad (Deccan) and (v) Miss Parker, Head Mistress, Methodist High School. These learned 'Judges' were pleased to recommend the award of 40 First grade prizes to different schools, after a sympathetic and critical examination of the merits of the exhibits, according to the varying standards of sex, age and originality, for which act of kindness they deserve our best thanks. The following is the list of prize-winning schools:—

	No. of Prizes.
(i) The Zenana College, Nampally.	5
(ii) The Zenana Training School, Hyderabad-Dn.	4
(iii) St. George's Grammar School.	3
(iv) Wesleyan Mission High School.	2
(v) All Saints High School.	2
(vi) Nampally High School.	2
(vii) Kachiguda Middle School	2
(viii) Darushafa High School.	1
(ix) Stanley Girls High School	1
(x) The Nizam College.	1
(xi) The Excelsior School.	1
(xii) The Darul Uloom High School.	1
(xiii) The Mahboob College, Secunderabad.	1

Report of the Honorary Secretary of the Educational Exhibition Committee for the year 1340 Fasli.

TRANSLATED BY

Mr. G. A. CHANDAVARKAR, M. A.

Mr. President, Ladies and Gentlemen,

I have great pleasure in submitting for your kind information this report in connexion with this year's Educational Exhibition. As in the previous years, the exhibition was held this year also, in connexion with the Hyderabad Teachers' Educational Annual Conference. Notwithstanding the fact that the dates fixed for receiving the exhibits were 21st, 22nd and 23rd of Amardad 1340 Fasli, some of them were received very late, in consequence of which considerable difficulty was experienced in properly arranging them. I sincerely trust that, in future, all the Head Masters will co-operate with us in making the exhibition a success by sending suitable exhibits in time.

I am glad to state that this year as many as 47 schools of Hyderabad and Secunderabad participated in our work by sending the exhibits, which were received from boys, girls and teachers connected with these schools, while last year 44 schools had competed. Thus there has been an increase of 3 schools competing for the purpose. Then again, the total number of exhibits received this year was 1510, which also shows an increase of 535, over those received in 1339 Fasli. This is a proof clear that in our schools greater interest is being evinced in imparting instruction in Handicrafts and Drawing. I have every hope that in the coming years this interest will be energetically sustained in all the schools and our exhibition will be receiving a greater measure of success year after year. Last year, as an experimental measure, one anna was levied

ceremony being performed by Lady Amin Jung. Judging from the number of lady-teachers and other interested *purdanishin* ladies, it was a grand success.

The fourth resolution was the outcome of long-standing grievance on the part of Head masters of private aided High Schools. The secretary wants to be all powerful and will not delegate even some of his powers to the Headmaster. The Managing Committee would not even take him into their confidence. The Headmaster has no free hand but is held responsible for the discipline and management of the school and in some cases he is not even a member of the Managing Committee. Under such cribbed surroundings how is he to work? Hence an endeavour is made in the resolution under reference to curb the powers of the management and give wider latitude to headmasters of private aided High Schools. The headmasters want to be *ex-officio* members of the Managing Committee and enjoy the same privileges as are enjoyed by their compeers of Government High Schools. They want that the Managing Committee or Board of Management should be approved by the Educational Department and that the rules governing grant-in-aid be so modified as to make the fulfilment of these conditions obligatory for the sanctioning or renewing of the grant. Since the question was a controversial one there was a very heated discussion. There was a regular tug of war between "Secretaries" on one side and headmasters of aided High Schools on the other. Some of the headmasters or principals of Mission High Schools who were enjoying sufficient privileges and had no special grievances, ranged themselves on the side of the "management" and stoutly opposed the resolution. Finally, when put to vote, the resolution was carried by not a very large majority of votes.

The Educational Exhibition was a great success and we cannot adequately thank Miss Webster, Headmistress, Kindergarten Department, St. George's Grammar School for continuing to act as President of the Exhibition Committee this year and getting together the exhibits, arranging them in sections, and housing them in the two spacious rooms adjoining the Conference hall. The *Zenana* day inaugurated last year was continued this year, the opening

subject a suitable President could not be found within the narrow circle of its members. Moreover the rules of the Association precluded outsiders being elected as President. Under the circumstances, there was no other choice but to give up, for the time being, this subject which has, we are glad to note, been earmarked along with two others viz. Classical Languages and Manual Training for the next Conference. Better late than never!

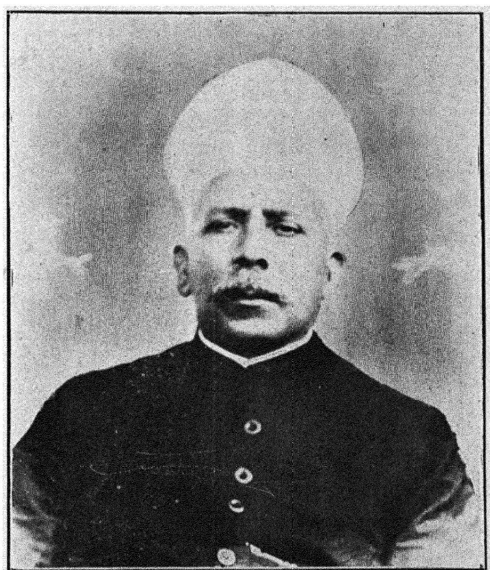
In all, four resolutions were placed before, and passed by, the Conference. The first was in regard to the Refresher Courses, the utility of which is acknowledged on all hands. Evidently this was unanimously passed. The second appertained to side grades in regard to Middle, Middle trained, Matric and Matric trained teachers who, having reached the maximum of their grade, were precluded on account of age from appearing for the higher examinations and thus making themselves eligible for the higher grade. We are glad to note that lowly-paid teachers are bestirring themselves to make their lot a little more comfortable in the evening of their lives. The third resolution was an attempt on the part of "specially qualified" teachers to create a little sunshine in their surroundings. The resolution says that the Divisional Inspector of Schools during his inspection rounds might, whenever possible, take "special" teachers e.g. of Mathematics, Science, Classical languages etc, and adequate renumeration be paid, if their services are availed of. The Divisional Inspector is not expected to know thoroughly every subject included in the curriculum and, as such, there was some purpose and logic behind the resolution. There was an animated debate in which several teachers took part. Eventually it was decided to substitute "should" instead of "might" to give the resolution greater force and weight and with this alteration, the resolution was passed. We doubt the wisdom of the change, for with the "should" are not the hands of the Divisional Inspector tied down and is not his "sphere of influence" invaded? Let the impartial reader read and judge!

Moral Instruction could be prepared and submitted before the Conference and the third report on Drawing had to be held over for the reason that plague dislocated the work of the Sub-Committees. As the majority of the city schools were closed for a long time and the head masters and other members of the staff were away in the camps, the members of the sub-committees could not easily meet. Subject Sub-Committee meetings could not be held for want of a quorum. The papers promised by individual members were not forthcoming. The plans adopted by the Association last year to ear-mark the headings of the topics selected by the Central Association for discussion at the monthly meetings of the various branches of the Association spread thoroughout the city in regard to the subject for which sub-committees were appointed, did not work well, for most of the schools were closed for months together. So, as was expected, co-ordination between the work done at the branch associations and the deliberations of the sub-committees, was not ensured. The full reports of the discussions of the branch associations could not be placed before, and made available to, the subject sub-committees. So the sub-committees had an up-hill work this year. In spite of these handicaps, it is a wonder how the "Science" sub-committee could submit its report to the Central Teachers' Association in time. The "Moral Instruction" sub-committee had to face many difficulties. Its members hailing from Charminar on one side to Secunderabad on the other, would not or could not meet. But for the indefatiguable efforts of Mr. Syed Gulam Mahmood formerly offg. Head master of the Shah Gunj Middle School and now First Assistant of the newly opened Urdu Sharif Middle School, the report on Moral Instruction would not have seen the light of day. We are extremely sorry that an English translation of the same could not be presented to the English readers of the *Hyderabad Teacher.* However a translation of the summary of the Report appears in this number. The Drawing Sub-Committee was, to speak the truth, never formed. From the technical nature of the

Editorial.

The present number of the *Hyderabad Teacher* marks the beginning of the sixth year of its life. It is entirely devoted to the proceedings of, and the papers read at, the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. We have published elsewhere in this issue, the full texts of the Chairman of the Reception Committee's interesting Welcome Address, the General Secretary's Report, the able and instructive Presidential Address, and the useful and illuminating reports on the Teaching of Science and Moral Instruction prepared by the Science and Moral Instruction Sub-Committees respectively and adopted by the Conference. For want of time, the report on Moral Instruction which was orginally prepared in Urdu could not be rendered into English and hence it appears *in toto* in the Urdu section (vide). In all, six papers were read and one lecture delivered at the Conference. Out of the former, no less than four find no place in this number and the one on "School Gardening" appears in the Urdu section. A special feature of the Conference under review was that two lantern lectures were respectively given by the Curator, Hyderabad Museum and the Assistant Director of Archaeology. In this connection we would be failing in our duty, were we to omit to thank Mr. Ghulam Yazdani, the Director of Archaeology who readily responded to our call and deputed his assistants to deliver the lectures at night and also Mr. Abdur Rahman Khan, the Principal of the Osmania University College for sending not only the magic lantern but also Mr. Abdus Salam, Science assistant to manipulate it. No less thankful are we to these three gentlemen who discharged their work and stayed in the Conference hall so late as 11 p. m.

Although, last year, three reports were submitted by the Sub-Committees on the teaching of Mathematics, History and Geography, this year, only two reports on Science and



NAWAB MIRZA YAR JUNG BAHADUR,
CHIEF JUSTICE,
HYDERABAD-DECCAN.

REGISTERED ASAFIA No. 47.

Vol. VI July—September 1931. No. 1.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

CONFERENCE NUMBER.

Editorial Staff.

1. S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)
2. F. C. PHILIP, M. A.
3. SYED ZAHUR ALI, B. A., B. T.

SECUNDERABAD-DECCAN.

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1931

Annual Subscription Rs. 3.

جلد (۶)　　　　شمارہ (۲)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساسِ معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (۱۲؍) سالانہ۔ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲؍) صرف اردو (۸؍)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عہ	صہ ۸؍	سے ۱
نصف صفحہ	صہ ۱	للعہ ۱۲؍	عہ ۸؍
ربع صفحہ	للعہ ۸؍	عہ ۶؍	۱۵؍
فی سطر	۱۰؍	۸؍	۶؍

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ آذر سنہ ۱۳۴۱ ف م اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء

فہرست مضامین

جلد ۶ شمارہ (۲)

رسالہ جامعہ

زیرادارت :- مولنا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

یہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جو تقریباً سات سال سے برابر شایع ہو رہا ہے اور اپنے بلند پایہ علمی مضامین کے باعث ملک میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے "جامعہ" کے مضمون نگاروں میں ہندوستان اور یورپ کے مشہور انشا پرداز شامل ہیں جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں ان تمام حضرات کے مضامین سنہ ۱۹۲۹ء میں شایع ہوئے ہیں۔

پروفیسر فریڈرش مائنکلے (برلن)	ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب پی۔ایچ ڈی
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی	ملک اسلم خاں صاحب بی۔اے (کیمبرج)
مولنا سید سلیمان صاحب ندوی	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی
یوسف حسین خانصاحب بی۔اے (جامعہ) مقیم پیرس	زبید احمد صاحب بی۔اے (لنڈن)
محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن)	سجاد ظہیر صاحب بی۔اے (آکسن)

رسالہ کی خوبیوں کا اندازہ نمونہ دیکھکر ہی ہو سکتا ہے۔ جو صرف ایک کارڈ لکھنے پر مفت ارسال کیا جاتا ہے البتہ تازہ پرچہ ۸ کے ٹکٹ موصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے رسالہ کی سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے اور اراکین اکادمی کی خدمت میں مفت پیش کیا جاتا ہے مفصل کیفیت خط و کتابت سے معلوم کیجیے۔

مینیجر رسالہ "جامعہ" دہلی

سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے

رپورٹ سب کمیٹی برائے سائنس

یہ سب کمیٹی جو "سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے" کے عنوان پر بحث کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اپنی رپورٹ کی ابتدا مدارس میں مطالعہ فطرت کے عنوان سے شروع کرتی ہے اس وجہ سے کہ جملہ علمی تحقیقات کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔

مطالعہ فطرت کے مقاصد و اغراض:۔

(۱) تعلیم مطالعہ فطرت کا پہلا مقصد یہ ہے کہ طلبا کی قوت مشاہدہ قوی ہو اور اس قوت کو صحیح راستے لگایا جائے۔ طلبا مطالعہ فطرت کی طرف فطرتاً راغب ہوتے ہیں۔ اس لئے معلم کا کام یہ ہے کہ وہ ان کی اس قوت مشاہدہ کی ترقی کا زیادہ خیال نہ کرے بلکہ محض اس قوت کو ٹھیک راستے پر لگائے رکھنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس قسم کی تربیت سے رفتہ رفتہ انہیں دوسرے قدرتی مناظر کے مشاہدے میں اپنی قوت تخیلہ کے اظہار کا موقع ملےگا

(۲) دوسرا مقصد یہ ہے کہ طلبا کو فطرت پرست بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے مشاہدے کے روکھے پھیکے بیانات کافی نہ ہوں گے، بلکہ ان بیانات کو قصوں کے ذریعہ دلچسپ بنایا جائے۔ اس لئے کہ اس قسم کے قصوں کو طلبا بے حد شوق سے سنتے ہیں۔

۳۔ تعلیم مطالعہ فطرت کا بہترین مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی مخلوق سے ان کی عظمت کو سمجھ کر محبت کرے یہ شریف ترین مقصد زندگی تعلیم مطالعہ فطرت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

طلبا کی جبلت ان کی خو اور استفسار کی قوت کا نشو و نما بھی اسی تعلیم کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور یہی قوتیں دنیا بھر کی معلومات کا ابتدائی زینہ ہیں۔

مطالعہ فطرت کی وسعت:۔

یہ ایک نہایت وسیع مضمون ہے۔ چونکہ لڑکے غیر ذی روح چیزوں کی تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے اور ان کا تعلق زیادہ تر جغرافیہ سے ہے! اس لئے ابتدائی جماعتوں میں علم ہیئت، علم حوادث سماوی اور ارضیات کا مطالعہ ترک

کر دینا چاہئے اس اعتبار سے مطالعہ فطرت کے صرف دو شعبے نباتات اور حیوانات نصاب میں داخل کئے جانے کے قابل ہوں گے۔ اِن میں سے بھی خوردبینی، خلوی اجسام ترک کر دینے ہوں گے اور اُن ہی مثالوں سے کام لیا جائیگا جو ما بہ الامتیاز فرق رکھتے ہوں۔ متذکرہ دو شعبے بھی بہت وسیع ہیں اور بادی النظر میں ان کا احاطہ ناممکن نظر آتا ہے لیکن سائنس نے انہیں مختصر کر کے مندرجہ ذیل چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور تعلیم میں آسانی پیدا کر دی ہے

(۱) شعبہ نباتات :۔

(الف) پھول والے درخت یا پودے۔ مثلاً۔ بڑ، آم، دھان، چنبیلی وغیرہ

(ب) بے پھول والے پودے نیسرلج، کائی، مش روم (Mushroom) یا کھمبی

(۲) شعبہ حیوانات :۔

الف۔ دودھ پلانے والے جانور۔ مثلاً۔ بے دم کے بندر (بن مانس) ویل یعنی دودھ پلانے والی مچھلی شیر، گھوڑا، وغیرہ۔

(ب) پرندے :۔ پہاڑی پرندے، دیہی اور سبزوادیوں میں رہنے والے پرندے۔

(ج) رینگنے والے جانور۔ مگرمچھ، کچھوے، چھپکلی اور سانپ۔

(د) دو عنصری یا خشکی اور تری میں رہنے والے جانور جیسے مینڈک وغیرہ۔

(س) آبی مخلوق :۔ مثلاً۔ بام اور دوسری معمولی مچھلیاں وغیرہ۔

(ھ) کیڑے مکوڑے :۔ مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، پروانہ یا مچھر اور تیتری۔

وسطانیہ اور تحتانیہ جماعتوں کے لئے مطالعہ فطرت اور ابتدائی سائنس کے نصاب کی مفصل فہرست بخوف طوالت یہاں درج نہیں کی گئی ہے لیکن اس قسم کی ایک مطبوعہ فہرست گذشتہ کانفرنس کے جلسے میں تقسیم کی گئی تھی۔ مندرجہ بالا نصاب کے ساتھ لطور اجتہاد ابتدائی عضویات، حفظان صحت، اور فوری امداد کو بھی مناسب ترتیب کے ساتھ مطالعہ فطرت میں شامل کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

مطالعہ فطرت کا معلم :۔

متذکرہ بالا مضامین کی اہمیت کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ مطالعہ فطرت کا معلم سائنٹفک ٹریننگ حاصل کر چکا ہو، علم حیوانات اور نباتات کے اصول سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ ان مضامین پر ایسی بیسیوں مشہور کتابیں بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں جو نہایت بہتر طریقے پر آسان زبان میں مرتب کی گئی ہیں اور جن میں علمی اصطلاحات سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ معلم ایسی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے وہ صرف کتابی معلومات پر اکتفا نہ کرے بلکہ ضرورت ہو تو خود مشاہدے کا شوق پیدا کرے اور اپنے کتابی علم کا اطلاق اپنے

ماحول کی زندہ مثالوں پر کرتا رہے۔ اس طرز عمل سے اسے حقیقی معنوں میں مطالعہ فطرت سے لطف اندوز ہونے کے مواقع مل سکتے ہیں۔

مدارس فوقانیہ میں ابتدائی سائنس کے نصاب کی ترمیم کی سفارش:۔

ہمارے مدارس فوقانیہ میں ابتدائی سائنس کا جملہ نصاب نظر ثانی کا محتاج ہے گو سائنس کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے لیکن تعلیم میں صرف طبعیات اور کیمیا پر اکتفا کرنا اور ان دونوں شعبوں میں بھی بہت سے ایسے امور کی تعلیم دینا جن سے طلبا کو فی الوقت کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو غور طلب ضرور ہے۔ مدراس۔ یس یس ال۔ سی کے ۱۹۲۹ء کا نصاب ہمارے یہاں فورتھ فارم میں جون ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا ہے۔ اس نصاب میں ابتدائی نباتات، حیوانات، عضویات، حفظان صحت اور فوری امداد بھی شامل تھے مگر ان مضامین کو ہمارے مدارس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی ان شعبوں کے بے شمار فوائد کے مدنظر سفارش کرتی ہے کہ [illegible] کے نصاب میں سائنس کے مذکرہ بالا شعبے بھی کیمیا اور طبعیات کے ساتھ داخل نصاب کئے جائیں۔ کیمیا اور طبعیات کے موجودہ نصاب کے معیار کو داخل شدہ مضامین کے تناسب کے اعتبار سے گھٹایا جائے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر کمیٹی نصاب کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتی ہے:۔

ایچ۔ یس۔ ال سی کے نصاب پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم پڑتا ہے کہ مدارس کے بورڈ نے طبعیات اور کیمیا کو علوم فطرت پر ترجیح نہیں دی ہے۔ اسی وجہ سے کہ گروپ (س) کے مضامین نباتات، حیوانات، اور حفظان صحت پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین کا علحدہ گروپ بنانے کا مقصد یہی ہے کہ آیندہ ان کی تفصیلی تحصیل کو ممکن بنایا جائے اگر یہ مضامین طبعیات اور کیمیا کے گروپ کے ساتھ ملائے جاتے تو یہ مقصد فوت ہو جاتا۔ ہمارے مدارس میں ابتدائی سائنس کے ساتھ ان مضامین کی تعلیم کی نسبت کسی قسم کا باقاعدہ انتظام پایا نہیں جاتا۔ اور طلبا میں ان علوم کی نسبت عام ناواقفیت پھیلی ہوی ہے علوم فطرت کی تعلیم کیمیا اور طبعیات کے ساتھ دیا جائے تو اوّل الذکر کو کوئی فوقیت حاصل نہیں رہتی۔ طلبا میں مناظر قدرت کو سمجھنے اور فطرت پرست بننے کی حقیقی قابلیت پیدا کرنے کے لئے تبدیلی نصاب کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے۔

انہیں امور نے مدراس۔ یس۔ یس۔ ال۔ سی بورڈ کو ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں متوجہ کیا۔ اور اس نے قابل اساتذہ کی ایک کمیٹی مقرر کی جس میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہونے کے بعد یہ طے پایا کہ ابتدائی سائنس کی تعلیم کو وسیع کر کے اس مضمون کا جز بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں نیا نصاب مرتب کیا گیا اس نصاب کے پانچ حصے قرار دئے گئے:۔ (۱) طبعیات اور کیمیا (۲) حیوانات اور نباتات (۳) عضویات۔ (۴) حفظان صحت (۵) فوری امداد۔ ہر حصہ بذات خود ترقی کے لئے کافی وسعت رکھتا ہے۔ اس مرمہ نصاب کے تحت پہلا امتحان

مارچ ۱۹۳۱ء میں لیا گیا یہ ترمیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر تجربہ تبلائے گا کہ یہ کس حد تک کامیاب ترمیم تھی۔

قاعدہ یہ ہے کہ ہر جگہ پر نئی تحریک کی مخالفت ضرور کی جاتی ہے۔ یہی حال اس تحریک کا ہوا۔ خصوصاً مدارس کے سربرآوردہ اساتذہ اور سائینس کے معلموں نے سخت مخالفت کی۔ چونکہ یہ مخالفت زیادہ تر قیاسی مشکلات پر مبنی تھی اس لئے مرمیہ نصاب کی ترویج میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو سکی۔

ہمارا یہ خیال کہ موجودہ نصاب میں ترمیم و توسیع کی ضرورت ہے کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ علوم فطرت کی جو تعلیم ہم نے جماعت ہائے تحتانیہ میں دی ہے، اس کا سلسلہ کافی اہمیت کے ساتھ ثانویہ جماعتوں میں بھی جاری رہے۔ یوں تو ہمارے مدارس میں صغیر ہی سے "نیچر اسٹڈی" کی برائے نام تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا سلسلہ جماعت ہائے تحتانیہ میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے لیکن مدارس ثانویہ کی طرح اس قسم کی تعلیم سے کوئی فائدہ پہونچ نہیں سکتا۔ اس لئے نیچر اسٹڈی کی جملہ شاخوں کو ہمارے مدارس میں ایسی ہی اہمیت دیجائے جیسی کہ کالجوں میں دیجاتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مدارس میں ایس ایل۔سی کے نصاب کو اختیار کیا جائے اور اس کے بعد مدرسین متعلقہ محنت سے تعلیم دیں تو امید ہے کہ نصاب کی ترمیم سودمند ثابت ہوگی اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

ماہران تعلیم کا جو اس مضمون میں کافی مہارت رکھتے ہیں خیال ہے کہ سائینس کے جملہ شعبوں کی تعلیم ابتدا ہی سے شروع کی جانی چاہئے۔ اس مضمون کو صرف طبعیات اور کیمیا تک ہی محدود کرنا اور علوم فطرت کو نظرانداز کردینا تنگ نظری ہے۔ صرف طبعیات اور کیمیا کو ترقی دینے کے لئے طلبہ کو علوم فطرت سے محروم کرنا قطعاً نامناسب ہے۔

طالب علم کے لئے پہلا سبق اس کی ذات کے متعلق ہونا چاہئے۔ بچے فطرتاً نیچر کی طرف راغب ہوتے ہیں اور وہ نیچر سے ہر حالت میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسی حالت میں انہیں علوم فطرت سے محروم رکھنا سخت غلطی ہے۔

فوقانیہ جماعتوں میں کیمیا اور طبعیات کے ساتھ حیاتیات کی تعلیم کا اختلاط ناگزیر ہے۔ اگر طالب علم میٹرک کی جماعت میں اس مضمون کی تعلیم حاصل کرے گا تو آئندہ اعلیٰ امتحانوں میں اس مضمون کو اختیار کرنے میں اسے کوئی عذر نہ ہوگا۔ جامعاتی تعلیم میں حیاتیات کو طبعیات اور کیمیا سے کم اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ صرف وہی طلبا کالج میں حیاتیات کا مضمون لے سکتے ہیں جنہوں نے میٹرک میں ابتدائی سائینس کی تعلیم پائی ہے ان میں سے بھی صرف معدودے چند طلبا حیاتیات کا مضمون اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے طبعیات اور کیمیا کے طلبہ کی بہ نسبت حیاتیات کے طلبہ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ فوقانیہ جماعتوں میں علوم فطرت کی

ابتدائی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کے طالب علم کو نباتات اور حیوانات بالکل ہی نئے مضامین معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان مضامین کو اختیار کریں گے جب کہ ان کی ابتدائی معلومات ہی ان کو حاصل نہوں۔ برخلاف اس کے طبعیات اور کیمیا سے اکثر طلبا واقف رہتے ہیں۔ اس لئے ان مضامین کو اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ طبعیات اور کیمیا کے طلبانین کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر کچھ طلبا حیاتیات لیتے بھی ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ اس شعبہ میں طلبار کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے اور انہیں وظیفہ وغیرہ کا بہت موقع مل سکتا ہے۔ حیاتیات کے طلبانین کی تعداد اس وجہ سے بھی کم ہے کہ وہ طلبہ جنہوں نے میٹرک کی جماعت میں ابتدائی سائنس پڑھی ہے۔ حیاتیات سے بھی کچھ نہ کچھ واقف رہتے ہیں اس لئے کہ وہ کالج میں اس مضمون کے لکچروں سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے ان طلبا کے لئے جنہوں نے میٹرک میں سائنس پڑھی ہی نہیں کالج کے حیاتیات کے لکچروں سے کافی فائدہ اٹھانا دقت طلب ہو جاتا ہے انہیں مشکلات کی وجہ سے بہت کم طلبا حیاتیات کا مضمون اختیار کرتے ہیں

طبعیات اور کیمیا سے ریاضیات کا تعلق مسلم ہے۔ مگر علم حیاتیات، طبعیات اور کیمیا سے ریاضیات سے بھی قریب تر تعلق رکھتا ہے ان کے طلبار کے لئے جو آئندہ طبی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حیاتیات کی تعلیم ناگزیر ہے۔ ایک ریاضی داں یا طبعیات و کیمیا کا ماہر اپنے مضمون کے سوا کوئی دوسرے مضامین سے واسطہ نہیں رکھتا۔ مگر حیاتیات کی تعلیم اس عیب سے بری ہے۔ طبعیات اور کیمیا کی تعلیم کسی شخص میں حیاتیات کا مذاق نہیں پیدا کر سکتی برخلاف اس کے طبعیات اور کیمیا کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

طریقہ تعلیم سائنس:-

بخوف طوالت یہاں ان سب طریقوں کا اعادہ مناسب خیال کیا گیا ہے جو سائنس کی تعلیم کیلئے بہ آسانی دستیاب ہو سکتے ہیں تعلیم سائنس کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ طلبا کے دلوں میں سائنس کے متعلق حقیقی دلچسپی اور سچی رغبت پیدا ہو جائے عموماً طلبا اس تعلیم سے ابتدا میں دلچسپی یا عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر یہ حالت دیرپا نہیں ہوتی۔ بصورت اول بہت ممکن ہے کہ ان کا شوق زوال پذیر ہو جائے یا بصورت ثانی ان کی اس خرابی کو دور کرنا دقت طلب ہو جاتا ہے اس لئے وہ پرانا طریقہ جس میں سائنس کی ابتدا مادہ کی تین مختلف حالتوں، اوزان، پیمانے اور ضوابط سے کی جاتی ہے ترک کر دینا چاہئے تعلیم سائنس کی ابتدا کسی دلچسپ اور حیرت انگیز تجربہ سے کی جائے اس طرح عمل کرنے سے طلبار کے خوابیدہ شوق میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ سائنس کی تعلیم کی ترقی کے لئے طلبا کی رغبت کی ارتقا کو ملحوظ رکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ نصاب تعلیم کی تکمیل میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے کسی اصول کی تفہیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس اصول کے متعلق کوئی کل یا آلہ، قدرتی منظر

یا کوئی اور چیز جو ہماری زندگی سے متعلق ہو تبلائی جائے اور اس کی مدد سے اصول دریافت کیا جائے تو یہ روکھا پھیکا اصول اپنے اندر ایک قسم کی دلاویزی اور کشش پیدا کرے گا گو اس طرح تبانے سے ممکن ہے کہ مدرس کو ایک ہی اصول کئی دفعہ لکھانا پڑے اور نصاب کی پابندی نہ ہو سکے۔ مگر بچوں کی محرکات اور محبوب پسندیاں خود بخود ایک خاص شکل و صورت اختیار کر کے نصاب کی تکمیل کا باعث ہوتی جائیں گی لیکن مدرس کا فرض ہے کہ وہ ان کے رجحانات پر خاص نگرانی رکھے تاکہ وہ بھٹکنے نہ پائیں۔

عملی کام :۔

آلات سائنس کو کسی اصول کی تفہیم یا طلبار کو موثر کرنے کے لئے ہی استعمال نہ کیا جائے بلکہ عملی کام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ طلبا میں سائنس کے آلات وصفائی، پھرتی، اور صحت کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ اور وہ حتی الامکان کم سے کم وقت میں اپنے تجربہ کا صحیح نتیجہ نکال سکیں۔ اس لئے کہ دنیا کو عملی کام کرنے والوں کی ضرورت ہے نہ کہ ان لوگوں کی جو صرف اصول ہی اصول تبلاتے رہیں۔

ارتباط :۔

تقریباً (۶) مضامین سے بآسانی ربط پیدا کیا جا سکتا ہے :۔

(۱) ڈرائنگ۔

عام آلات سائنس کے خاکہ اتارنے کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے اکثر طلبا کے سائنٹفک آلات و شکلیں درست نہیں ہوتیں اس لئے اور اشیار سائنس کے آلات کے خاکے بھی صفائی صحت اور تناسب کے ساتھ ڈرائنگ کی جماعت میں بنانا سکھایا جائے۔ اس طرح اس مضمون کے ساتھ نہایت ضروری اور آسان ارتباط پیدا کیا جا سکتا ہے۔

(۲) جغرافیہ :۔

ارضیات، علم حوادث سماوی وغیرہ کا جیسا کہ اوپر کسی اور جگہ بیان کیا گیا ہے مضمون سائنس کے ساتھ نہایت آسانی سے ربط پیدا ہو سکتا ہے۔

(۳) انگریزی :۔

اس مضمون کے ساتھ بجا طور پر تعلق اس صورت میں مضمر ہے کہ سائنس کے کسی اصول کی تفہیم کے بعد اس پر انگریزی میں طلبار سے مضمون لکھایا جائے۔ پھر انگریزی کا مدرس زبان کے لحاظ سے اور سائنس کا مدرس فن کے اعتبار سے اس مضمون کی صحت کریں۔ اس طرح عمل کرنے کے لئے انگریزی کے مدرس سے طے کر لیا جائے کہ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ میں یا اس سے بھی زیادہ مقررہ مدت کے بعد مضمون نگاری کی مشق باقاعدہ جاری رہے،

تعلیمی سیر و سیاحت جو علوم فطرت کے عملی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے ہوں یا کیمیاوی کارخانوں اور گرنیوں
کے معائنہ کے بعد بھی ان پر مضامین لکھائے جاسکتے ہیں۔

(۴) ریاضی:۔

درسی کتب کے اسئلہ طلبا کو حل کرنے کے لئے دینے کی بجائے دارالتجربہ کے نتائج اور مقادیر پر
سوالات دئے جاسکتے ہیں اس طرح نہ صرف دونو مضامین میں ربط پیدا ہوسکتا ہے بلکہ سائنس کی دلچسپی میں
اضافہ کی امید ہے۔

(۵) تاریخ:۔

تاریخ کا مدرس تاریخی واقعات کے ساتھ تمدنی ترقی کے حالات بھی تبلاتا جائے مثلاً کسی عہد کی
تاریخ بیان کرتے وقت اس زمانے کے مشاہیر سیاست اور مذہب کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصر علماء سائنس کا
ذکر بھی کر دیا جائے تو طلبا کو دنیاوی ترقی کے مکمل حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ اور اس ضمن میں اسے بہت سے
انکشافات اور ایجادات کے دلچسپ قصے بیان کرنے کا موقع ملے گا، جن سے طلباء میں ایسے کاموں کا
جوش اور ولولہ پیدا ہوگا۔

(۶) مذہب:۔

مذہب اور سائنس میں نہایت عمدہ ارتباط پیدا کیا جاسکتا ہے۔ مظاہر قدرت جہلا کی سمجھ میں
نہ آنے کی وجہ سے توہم پرستی کا باعث بن گئی ہیں یہ توہمات رفتہ رفتہ مذہب کا جز بن جاتے ہیں اگر
ہمدردانہ طریقہ پر سائنس کے انکشافات کی مدد سے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو مذاہب
ان توہم پرستیوں سے پاک ہوجائیں گے۔ مذہب کسی چیز کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ سائنس کا کام بھی
یہی ہے۔ مذہبی حقائق کو واضح کرے اور یہ ناممکن ہے کہ سائنس کسی مذہب کی حقیقت کو جھٹلائے یہی وجہ ہے کہ
مبلغین اشاعت مذہب اور مذہبی مسائل کی تشریح کے لئے انکشافات سے اکثر و بیشتر مدد لیا کرتے ہیں
کیا اس قسم کا ارتباط اہم نہیں ہے؟

عمدہ ارتباط کا اثر مدرس متعلقہ پر:۔

سائنس کا ارتباط دوسرے مضامین سے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر مدرس سائنس کے ہر شعبہ سے
تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرے۔ اس کے بعد وہ محسوس کرے گا کہ اپنے مضمون کے درس میں کتنی آسانیاں پیدا
ہوجاتی ہیں اور کس آسانی سے وہ طلبا کی غلط فہمیاں اور شبہات دور کرسکتا ہے۔ سائنس کی معلومات کے
بغیر کسی مدرس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے مضمون اور سائنس میں بجا طور پر ربط پیدا کرسکے گا۔

مترجمہ غلام جیلانی مددگار [illegible]

صفائی طلبہ مدرسہ

از

محمود خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ جڑچرلہ

قبل اس کے کہ خاص طور پر صفائی طلبہ مدرسہ کے عنوان پر بحث کی جائے نامناسب نہ ہوگا کہ اس کی خوبیوں پر سرسری نظر ڈالی جائے ہیں صفائی کے معنے کی تفصیل کی ضرورت نہیں صرف صفائی کو زیر بحث لانا کافی ہے۔

اگرچہ صفائی بادی النظر میں ایک معمولی اور کم مایہ لفظ معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظر غائر ڈالی جائے تو صفائی کی ضرورت زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جائے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ صفائی سے انسان کی عمر بڑھتی ہے کیونکہ اجزائے حیات انسانی یعنے ہوا، پانی۔ غذا، جن پر زندگی کا دارومدار ہے اگر ان کی صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو عمر انسانی یقیناً کم ہوجاتی اور حیات موجودہ طرح طرح کے آلام و اسقام میں مبتلا ہوجاتی ہے اور جو شخص ان تین بڑی چیزوں کے برتنے میں صفائی کا خیال رکھتا ہے، وہ یقیناً اپنے آپ کو تندرست و توانا رکھنے کے علاوہ اپنی عمر کو زیادہ اور اپنی زندگی کو پر لطف بناتا ہے۔

اسی طرح جسم و لباس اور مقامات رہائش کی پاکیزگی کا بھی جو زندگی کے لئے ضروری اور لازمی ہیں خیال رکھنا ضروری ہے۔ مندرجہ بالا بحث کا زیادہ تر تعلق ظاہری صفائی سے ہے لیکن اگر ہم صفائی کو دوسری نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ صفائی روحانی اعتبار سے بھی ایک ضروری چیز ہے کیونکہ اس سے دینی و دنیوی دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں، جن کا اجمالاً ذکر حسب ذیل ہے

۱۔ جسم کی صفائی سے بعض جلدی بیماریوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

۲۔ لباس کی صفائی سے بعض بیماریاں جو گندے کپڑوں کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں محفوظ رہتا ہے،

۳۔ جسم اور لباس کی صفائی سے انسان کا دل خود بخود خدا کی طرف مائل ہوجاتا اور آدمی دیندار بن جاتا ہے۔ جو مقصد آفرینش عالم ہے۔

۴۔ جسم و لباس کی صفائی آدمی کی وجاہت ظاہری میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے جس سے وہ عام طور پر پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

۵۔ صفائی اشیاء خوردنی سے تقویت جسمانی کے ساتھ انسان بیماریوں سے بھی محفوظ رہتا ہے۔
۶۔ ایسا آدمی جس کا قلب صاف اور صفائی لباس کا پابند اور مذہب اور روایات کا عامل ہو
ثابت ہے کہ اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔
۷۔ صاف قلب آدمی کسی کی برائی کے درپے نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے پہلو میں ایک شریف اور پاک
دل رکھتا ہے۔ صفائی پسند آدمی کی لوگ خود بخود عزت کرتے ہیں۔ اور عزت کی زندگی ہی ایک پرلطف زندگی ہے۔
بہرحال صفائی و ستھرائی مقصداً فرنیش انسانی و ممد حیات بشری ہونے کے علاوہ باعث عزت
و توقیر و ازدیاد و توانائی و تنومندی پیدا کرنا اور معاشرتی اور مدنی جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔ تو ہمارا
فرض ہے کہ طلبار کی صفائی کا خیال رکھیں اور اس معاملہ میں والدین و اولیاء اور سرپرستان طلبہ سے
اشتراک عمل کرکے ہر طرح ان میں صفائی و ستھرائی پیدا کریں اور چونکہ تکمیل مقاصد مندرجہ بالا یعنی (۱) دینداری۔
(۲) صحت جسمانی (۳) جلدی بیماریوں سے حفاظت (۴) باعزت و مذہب۔ (۵) جذبات مدنیت ہمارا ہی
کام ہے اس لئے ہدایات ذیل پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ **دینداری** ۔ یوں تو جن طلبار کے والدین اور اولیا دیندار بلحاظ مذہب و روایات نماز
و پوجا پاٹ وغیرہ کے پابند ہیں ایسے گھرانے کے طلبار خود بخود کم و بیش دیندار ہوتے ہیں مگر استاد و مدرس کا
کام بھی خاص طور پر دینداری پیدا کرنے میں حصہ لینا ہے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہم مدرسین پر لازم
ہے کہ خود دیندار اور اپنے مذہب کے پابند رہیں۔ اور اپنے طریقۂ عمل اور اخلاق سے طلبار میں جذبۂ عمل پیدا
کرادیں کیونکہ چھوٹے بچے ہمیشہ بڑوں کے نقش قدم پر چلا کرتے ہیں۔ اور بالخصوص استاد کے کردار و اطوار کی پیروی
زیادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ طلبار میں بعض فطری و جبلی عادات و اطوار اپنے آبا و اجداد کے وارثاً موجود ہوتے ہیں
مگر مدرس کے کیرکٹر کا اثر پر تاثیر ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مدرس ہمیشہ طالب علموں کا ناصح ہوا کرتا ہے
اور نصیحت اس وقت تک پر اثر نہیں ہوسکتی جب تک اپنے آپ کو ناصح خود اس کا پابند اور عامل نہ بنائے۔
بہرحال مدرس اپنے آپ کو نمونۂ عمل پیش کرکے طلبار میں دینداری پیدا کرے جو اصل مقصد آفرنیش ہے۔
اس دینداری میں خود بخود صفائی مضمر ہے جو پاکیزگی قلب اور صحت روحانی کا باعث ہے۔

۲۔ **صحت جسمانی** ۔ اصول صحت جسمانی اس وقت تک محال و ناممکن ہے جب تک اہم چیزیں
جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی ہوا، پانی، غذا کے برتنے اور استعمال کرنے میں صفائی کا لحاظ نہ رکھا
جائے اس مقصد کے حاصل کرنے اور طلبہ میں اس کا خیال پیدا کرنے کے لئے مدرس کو لازم ہے کہ طلبار کو
صحت جسمانی کے فوائد اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلائے اور سکھلائے اور اس معاملہ میں بھی سرپرستان

طلبا سے مکمل اشتراک عمل کرے تاکہ طلبا کی صحت کا والدین اور اولیاء طلبا کو بھی مزید خیال رہے اور طلبا کی صحت اچھی رہے کیونکہ "تندرستی ہزار نعمت ہے" بقول غالب

تنگدستی اگر نہ ہو غالب — تندرستی ہزار نعمت ہے

بہرحال مدرسین بچوں میں صفائی کے جذبات جو پیدا کرتا ہے تو گویا اپنے طالب علموں کو ہزار نعمتوں کی ایک نعمت دیتا ہے جو طالب علم کی زندگی کو پر لطف بنانے کے علاوہ مدحیات بھی ہے اس لئے ہر مدرس کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو نمونۂ عمل بنا کر ہدایتیں دیا کرے، اور اولیاء طلبا سے اشتراک عمل کر کے طلبا میں صفائی وستھرائی کا جوش عمل پیدا کرے۔

۳ **جلدی بیماریوں کی حفاظت**۔ جلدی بیماریاں اس وقت تک انسان کو چھو نہیں سکتیں۔ جب تک انسان اپنے جسم کو صاف اور لباس کو پاکیزہ رکھے جہاں جسم اور لباس کی صفائی کا خیال چھوڑ دیا وہاں لازمی طور پر جلدی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے ہر مدرس کا فرض ہے کہ طلبا کو صفائی جسم و لباس کا عادی بنائے اور بڑی سختی سے اس کا پابند کرائے تاکہ طلبا جلدی امراض سے محفوظ و مامون رہیں اس معاملہ میں بھی طلبا کے اولیاء سے جہاں تک ممکن ہو مدد لے اور ان کو بھی ان کے فوائد سے آگاہ کر کے اس کے جانب متوجہ کرائے اور جن طلبا کے اولیاء تعلیم یافتہ اور مہذب ہوں وہ خود بلا سعی آئندہ خود اس کی پابندی کریں گے۔ مگر جو لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں ان کو سمجھانے اور اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہے

۴ **باعزت بنانا**۔ صفائی سے فوائد جسمانی و روحانی کے علاوہ بعض خارجی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں چنانچہ صفائی جسم و لباس کی وجہ سے عام لوگوں میں اس کی نہایت عزت و وقعت ہونے لگ جاتی ہے اور دنیا میں باعزت زندگی ہی حقیقی اور پر لطف زندگی ہے کون شخص ایسا ہے جو باعزت زندگی کو پسند نہیں کرتا، یہ خیال انسان کو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ سن رشد و تمیز کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر بچوں میں اس جذبہ کا پیدا کرنا ہم مدرسین ہی کا کام ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جن طلبا کے اولیاء سمجھدار ہیں ان کے بچے ان میں بھی یہ جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر عام طور پر اس جذبہ کا پیدا کرنا عام طلبہ کو فائدہ پہونچانے کے علاوہ مندرجہ بالا قسم کے طلبا کے لئے سونے پر سہاگہ کا مرادف بن جاتا ہے بہرحال اس جذبہ کو ضرور پیدا کرنا چاہئے تاکہ طلبا آئندہ زندگی میں ایک شاندار پر لطف اور باعزت زندگی بسر کر سکیں ساتھ ہی ساتھ مدرس کو لازم ہے کہ جہاں صفائی جسم و لباس کی ہدایت دیتا ہو، وہاں جسم و لباس کے گندے ہونے کے اسباب و علل بھی بخوبی ذہن نشین کرا دے تاکہ نادان طلبا اس سے واقف ہو کر محترز اور اس کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں یا رہنے کی سعی کر سکیں مثلاً پسینہ کی زیادتی اور گرد و غبار میں کھیلنے کے نقصانات وغیرہ

ضرور بیان کرے۔

(۵) **تہذیب وشائستگی ومدنی فوائد**۔ صفائی کا دوسرا خارجی فائدہ یہ ہے کہ صفائی جسم ولباس سے انسان میں شہرت پیدا ہو جاتی ہے، تہذیب وشائستگی کا بنیادی پتھر ظاہری صفائی ہے جو مذہب کا جزو لاینفک ہے یہ سچ ہے کہ تہذیب وشائستگی صفائی جسم ولباس سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ صفائی دل سے وہ جو علم وعمل سے قوای ذہنیہ وعقلیہ کو مجلی کئے بغیر دشوار ہے" حاصل ہوتی ہے مگر علم وحکمت وعقل کا سرمایہ جو دل ودماغ میں محفوظ ہے وہ بدوں صفائی جسم ولباس اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک کوئی شخص اپنی زبان سے کچھ نہ کہے بقول سعدی علیہ الرحمۃ "تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب وہنرش نہفتہ باشد۔

لیکن صفائی جسم ولباس بھی علم وفضل وعقل ودانش وتہذیب وشائستگی کے اظہار کا ذریعہ ہے جو بغیر بحث وتکرار امتحان وآزمائش لوگوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مہذب ہونے کی وجہ سے بعض اوقات انسان کے حقوق کی حفاظت بلا امداد غیرے بھی ہو جاتی ہے تو گویا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حقوق کی حفاظت کا ذریعہ بھی صفائی ہے۔

بہر حال صفائی کے بہت سے فوائد ہیں جو بخیال طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں پس ہم مدرسین کا فرض ہے کہ طلبا میں تہذیب وشائستگی اور تمدن کے لوازم پیدا کر دیں" جس کا ابتدائی درجہ صفائی ہے پس ہم مدرسین کے ہمیشہ مطمح نظر طلبہ کو بلحاظ صفائی امور ذیل کا پابند وعمل پیرا بنانا رہے۔

بنظر صفائی جسمانی طلبا کو حجامت بنوانے۔ ناخن ترشوانے۔ منہ دھونے، غسل کرنے کی ہدایت کیا کریں اور بچوں سے اپنے اس حکم کی تعمیل سختی سے کرائیں۔

لباس کی صفائی کے متعلق ہدایتیں دیتے رہیں اور پابندی کرائیں کہ طلبا کرتے' یا دامن سے سلیٹ وناک وغیرہ صاف نہ کیا کریں تاکہ طلبا اس عام ومذموم عادت سے محترز رہیں۔

جسم ولباس کی صفائی ملحوظ رکھتے ہوئے تاکید کریں کہ طلبا گرد وغبار یا ایسے کھیل جس سے گرد وغبار کپڑوں کو میلا کچیلا کرے نہ کھیلا کریں۔

(۴) پڑھائی اور لکھائی کے وقت سلیٹ کو پانی سے صاف کیا کریں۔ کتب درسی، کاپیاں قلم وغیرہ صاف وستھرا رکھا کریں۔

صفائی مدرسہ

صفائی مدرسہ صفائی طلبا کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری ہے ایک عام خیال جو صفائی مدرسہ سے

پیدا ہوتا ہے وہ مدرسین وصدر مدرسین کے دلی جذبات کا دلچسپ منظر ہے گویا صفائی مدرسہ علی العموم مدرسین اور بالخصوص صدر مدرس کے افعال کا مظہر ہے یہ لازمی امر ہے کہ صفائی مدرسہ سے مدرسین اپنے افعال کا اثر طلبہ پر ڈالتے ہیں کہ رہایش کے مکانات کی حالت کیسی اور کیا رہنی چاہئے بہر حال اپنا نمونہ پیش کرنے کے علاوہ حسب ذیل فوائد صفائی میں مضمر ہیں۔

(۱) صفائی فرش مدرسہ سے یہ فائدہ ہے کہ جو کوڑا کرکٹ فرش پر پڑے رہنے سے بعض جراثیم پیدا ہوتے اور صحت جسمانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سے مدرسین وطلبا محفوظ رہتے ہیں۔

(۲) صفائی عمارت مدرسہ میں یہ فائدہ مضمر ہے کہ کسی قسم کے کیڑے پیدا نہیں ہوسکتے جو اکثر دیواروں کے سوراخوں، مکڑی کے جالوں، یا عمارت کی لکڑی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں

(۳) بعض حشرات الارض مثلاً کیڑے مکوڑے سانپ، بچھو، وغیرہ جو عدم صفائی کے باعث فرش عمارت و در و دیوار میں پیدا ہوتے اور اپنا مسکن بنائے رکھتے ہیں، نہ پیدا ہوسکتے اور نہ اپنے زہریلے اثرات سے کسی کو ضرر و نقصان پہونچا سکتے ہیں۔

بہر حال عدم صفائی کے باعث اقسام اقسام کے امراض طرح طرح کے نقصانات جو غیر محسوس طریقہ پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ان کے علاوہ ایک اور نقصان بہت پر خطر ہوتا ہے وہ عمارت کی بوسیدگی وانہدام ہے، جس سے شدید مالی نقصان کے سوا جانی نقصان ہے، جس کے باعث محض عدم صفائی و نگرانی ہے بہر حال ان تمام نقصانات کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ عمارت مدرسہ کی صفائی کا لحاظ رکھا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے حسب ذیل امور کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔

(۱) فرش کو روزانہ جاروب کشی کردی جائے اگر فرش پتھر کا نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار فرش کو لیپوایا جائے۔ بعض سوراخ وغیرہ جو حشرات الارض کے باعث پیدا ہوتے ہیں وقتاً فوقتاً بند کردئے جائیں۔

(۲) عمارت مدرسہ کے دیواروں کی صفائی ہفتہ میں ایک مرتبہ کرائی جائے، تاکہ کسی قسم کے کیڑے مکوڑے اور جالے وغیرہ دیواروں میں نہ رہ سکیں۔

(۳) عمارت کی شہتیروں اور لکڑیوں وغیرہ کو سال میں ایک مرتبہ تیل یا وارنش کرایا جائے تاکہ عمارتی چوبینہ کو کیڑے نہ کھانے پائیں دروازے اور دریچے روزانہ صاف کرائے جائیں اور عمارت کے ساتھ ساتھ ان پر بھی تیل یا وارنش کردیا جائے۔

(۴) حسب ضرورت بصورت کویلو سفال گردانی بصورت دا بہ جوڑ اندازی بصورت سنگلاخ ضروری

ترمیم کروائی جائے۔

(۵) اگر ہو سکے تو ہر ماہ ورنہ ہر شش ماہی پر ورنہ بتصور مجبوری آخری سال میں ایک مرتبہ آہک پاشی کرائی جائے اور ضروری ترمیم بھی ہوا کرے۔

۶۔ مدرسہ کا صحن اور اطراف و اکناف پاک و صاف رہے اور اطراف مدرسہ میں ایسی اشیاء نہ رہنے پائیں جس سے صحت جسمانی اور اخلاق طلبہ پر اثر پڑتا ہو۔

بیت الخلا کم از کم مدرسہ سے اتنے فاصلہ پر ہو کہ صحت پر بُرا اثر نہ ڈال سکے۔

مندرجۂ بالا فرائض مالک عمارت سے متعلق ہیں، لیکن مدرسہ کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ طلباء کو تاکید کے علاوہ کافی نگرانی رکھیں کہ طلباء دیواروں پر پنسل کی لکیریں نہ کھینچیں۔

۲۔ کاغذات کے پرزے وغیرہ فرش پر نہ پھینکیں۔

۳۔ کوئی ایسی چیز طلباء مدرسہ میں لاکر نہ کھائیں جس سے فرش خراب ہو۔

۴۔ جب کبھی طلباء ناک صاف کریں دیوار وغیرہ سے ہاتھ نہ پونچھنے پائیں۔

۵۔ پیشاب وغیرہ کے لئے طلباء مدرسہ کے احاطہ سے باہر یا بیت الخلاء میں جایا کریں۔

۶۔ طلباء بازی گاہ کے سوائے مدرسہ کے اندر نہ کھیلنے پائیں۔

اس کے علاوہ تزئین مدرسہ کے تحت مدرسین اور صدر مدرسین کا فرض ہے کہ فرنیچر کو خراب و خستہ حالت میں نہ رکھا کرے، ہر جماعت میں میز کرسی، بورڈ، و ڈسٹر تختیات متعلقہ جماعت موزوں مناسب مقامات پر رکھے اور آویزاں کرے۔ اگر حالات اجازت دیں تو صدر مدرس کو لازم ہے کہ مدرسہ کے صحن میں چمن بندی کرائے۔ جو آرائش مدرسہ کے علاوہ دیگر تعلیمی فوائد کا بھی ذریعہ ہو سکے۔

بہرحال صفائی مدرسہ و طلباء ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ اس کی تمام ذمہ داری ہم مدرسین پر ہی ہے جس کا خیال رکھنا ہمارا فرض اولین ہے فقط۔

(ضلع محبوب نگر میں "صفائی طلبہ و مدرسہ" کے عنوان پر ایک مقابلہ مضمون نگاری عمل میں آیا تھا۔ مضامین کی جانچ و مقابلہ سید علی نواز صاحب جدی بی اے بی ٹی۔ کے سپرد تھا جنھوں نے اس مضمون کو درجہ اول کا مقالہ قرار دیا۔ مضمون کچھ برا نہیں لیکن ٹیچر کے معیار تک پہونچنے میں ابھی بہت کسر رہ گئی ہے۔ گر مضمون نگار صاحب کی ہمت افزائی اور سید جواد صاحب۔ بی۔ اے بی۔ ٹی مہتمم ضلع محبوب نگر کی خاطر سے ہم اس کو ٹیچر میں شایع کر رہے ہیں۔)

نصابِ تعلیم اور چند اہم مضامین

عام طور پر صدر مدرسین اور ان کے مددگاروں کو نصاب کی ترتیب میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایک بنا بنایا نصاب ان کو دیدیا جاتا ہے وہ اس کی مناسب تقسیم اور نفاذ کے ذمہ دار ہیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ان کو قابل اطمینان نظام الاوقات مرتب کرنا پڑتا ہے اگر صدر ایک اچھے رٹانے والے استاد کی شہرت کا خواہاں ہے تو وہ نصاب کو امتحان کی تیاری کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اگر وہ جہاں دیدہ اور ضمیر شناس ہے تو اس کا حقیقی نصب العین طلبا کی دماغی، اخلاقی اور جسمانی نشو و نما کرنا ہوتا ہے۔ وہ نصاب مقررہ کے مضامین کو اس خوبی اور نہج سے ترتیب دیتا ہے کہ مقصد بالا ممکنہ حد تک حاصل ہو جائے وہ کارآمد مضامین انتخاب کر لیتا ہے اور اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ وہ مفید طور پر پڑھائے جائیں۔

اس موقع پر لفظ مفید کے معنی واضح کرنے کی ضرورت ہے اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اگر ایک طالب علم کو منشی بنانا ہے تو اس کو خوشنویسی اور کاروباری مراسلت برسوں سکھائی جائے یا اگر اس کو نجار بنانا مقصود ہے تو اس کی تمام عمر چوبی کام اور دستکاری میں صرف کر دی جائے۔ مفید سے مطلب تعلیمی معنوں میں کارآمد کے ہیں یعنی دماغی نشو و نما کے لئے مفید، غور و خوض اور اخذ نتائج کے لئے مفید قوائے متخیلہ کے بیدار کرنے کے لئے مفید اور سیرت اور خصائل کے ڈھالنے کے لئے مفید۔ مدرسہ اس لئے نہیں ہے کہ آنے والی زندگی کی جنگ کا سپاہی ہتھیار کے ڈھالنے ہی میں مصروف رہے جن سے وہ نبرد آزمائی کرنے والا ہے بلکہ ان ہتھیاروں کے استعمال بھی سیکھے۔

مطالعہ اور غور و خوض تعلیم کا اصلی مقصد ہے۔ اس کی مدد سے بے عقلی اور سفلہ پن دور ہو جاتا ہے درس و تدریس وہی کامیاب ہو سکتی ہے جس میں ہر فن کے حدود متعین ہوں اور طالب علم بھی ان کے سمجھنے سے قاصر نہ رہے۔ اگر استاد کو اچھا ماحول اور حالات مساعد مل جائیں تو اس کی کامیابی یقینی ہے مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ کوئی کاشتکار کھیت میں ادھر ادھر پھر کر اور بیج بکھیر کر عمدہ فصل حاصل نہیں کر سکتا۔ زمین میں بیج ڈالنے سے قبل بہت سے کاموں کی ضرورت ہے۔ زمین کی نوعیت اور اس کی موقتی حالت کا لحاظ ضروری ہے۔ اسی طرح دماغی کاشت کے لئے اس کی حالت پر غور ضروری بات ہے۔ بند ھانڈی کی اندرونی

اندرونی اشیا، کو معلوم کئے بغیر پکانا یا دوسری چیزوں کا اس میں ڈالنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا ۔

دماغ کیا ہے ؟ ایک زندہ اور متحرک قوت کا نام ہے اس میں زندگی کے تمام تغیر پذیر اجزا موجود ہوتے ہیں پس استاد کا کام خیالات پیدا کرنا اور خیالات میں تغیر پیدا کرنا ہونا چاہئے ۔ اس موقعہ پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حافظہ کا تعلق سچی قوت سے کچھ نہیں اور اگر ہے تو اسی قدر ہے جیسا کہ ایک گاڑی کو فصل کی پیداوار سے ۔ وہ گاڑی جو بیج کو کھیت تک لیجاتی ہے ۔

زمانۂ جدید میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اہمیت اظہر من الشمس ہو چکی ہے ۔ دنیا میں شاید ہی اب کوئی ملک ایسا باقی رہا ہوگا سوائے ہندوستان کے جہاں اس مسلمہ اصول پر عمل نہ کیا جاتا ہو ۔ اس فطری ذریعہ سے علوم وفنون کی تعلیم ایک معمولی بات چیت کا کام ہو جاتی ہے جب تمام خیالات مادری زبان میں طلبا کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا حقیقی مقصد فوت نہیں ہو سکتا ۔ یعنی ان کا اثر دائم اور پائدار ہوتا ہے ۔ طلبا کے دماغ خیالات اور دل جذبات سے معرا نہیں رہتے بالفاظ دیگر اگر تعلیم مادری زبان میں ہو تو غور وخوض کرنے کی قوت صحیح راستہ پر گامزن ہو جاتی ہے ۔

مدرسہ کا مقصد زندگی کی جدوجہد اور زمانہ کے نشیب وفراز کے لئے طلبا کو تیار کرنا ہے کہ پنساری کی دوکان یا کسی دفتر کی ضرورت کیلئے ان کو یہ بتلانا چاہئے کہ قدرت نے جو حصول مسرت کی قوتیں ان کو ودیعت کی ہیں اور جو قابلیتیں کہ انہوں نے پیدا کی ہیں ان کو کسی طور پر وہ اپنے اور دوسروں کے فائدہ میں صرف کریں ۔ نہ کہ تجارت کی چالیں اور طلب منفعت کے ڈھنگ سیکھیں اگر مدرسہ کی تعلیم نے ایک طالب علم کی عقل کو تیز ۔ اور قوت مطالعہ اور تفکر کو تربیت یافتہ لائق اعتماد اور قابل اطمینان سیرت اور مضبوط اور تندرست جسم دیا ہے تو وہ ہر اس کام میں کامیاب ہوگا ۔ جو وہ اپنے فطری رجحان اور قابلیت کی مناسبت سے اختیار کرے گا ۔

ایک وسیع النظر اور بلند خیال صدر معلم ان اصول کی روشنی میں اپنے مدرسہ کے نصاب کو عملی جامہ سے مزین کرے گا ۔ نیز سرکاری نصاب اور مقامی ضروریات کا لحاظ بھی ایک حد تک ناگزیر ہے ۔ مثلاً نباتات کی تعلیم اور مطالعہ قدرت شہری طلبا کے لئے اس قدر موزوں نہیں ہے جیسا کہ دیہات کے طلبا کیلئے ایک ہی قسم کے کھیل اگر دکھنی اور افغانی طلبا، کو کھلائے جائیں تو کیا وہ ہر دو کے لئے یکساں مفید ہو سکتے ہیں ۔

جو نصاب تعلیم کو ایک مدرسہ کے لئے اہمیت حاصل ہے وہی نظام الاوقات کو جماعت کے لئے ہے ۔ بہت کچھ کام کا انحصار اسی کی ترتیب پر ہے ۔ صدر مدرسین کا فرض ہے کہ وہ نظام الاوقات کے

مرتب کرتے وقت اس پر غور کریں کہ آیا نصاب کے جملہ مضامین اپنی مناسب اہمیت کے ساتھ تقسیم ہوگئے ہیں۔ ہر فن کے لئے ٹھیک وقت دیا گیا ہے۔ تحریری اور زبانی کام زبانی وقفہ کے بعد جماعتوں کو ملے گا۔ نیز آرام و ورزش اور کھیل کے لئے کافی وقت دیا گیا ہے۔

بعض مضامین کی تعلیم کے وقت طلبا کے دماغ پر زیادہ بار نہیں پڑتا۔ ان کو ایسے وقت پڑھانا چاہئے جب کہ طلبا تھک گئے ہوں کام کی تبدیلی۔ آرام کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ہر گھنٹے کے بعد نیا سبق اور نیا کام ہونا چاہئے۔ دو قریب قریب کی جماعتوں کو بلند آواز سے پڑھنے کا کام نہیں دینا چاہئے ورنہ شور و شغب میں کسی کا کام درست نہ ہوگا۔

ہر فن کی اہمیت جدا جدا ہے۔ تاریخ نصاب میں اس لئے رکھی گئی ہے کہ اس سے طلبا کی قوت متخیلہ کو ترقی ہو۔ قوت استدلال جلا پائے۔ فرمانبرداری، حب الوطنی، انصاف اور نفرت کے جذبات ظاہر ہو کر سیرت کو ڈھالیں اگر وہ صرف امتحان کی تیاری کی غرض سے پڑھائی جائے اور صرف واقعات کو ازبر کرا دیا جائے تو اس کی تمام قدر و قیمت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس طرح گویا ڈھانچ کو گوشت اور خون پر ترجیح دینا اور جسم کو روح پر حاکم بنانا ہوگا۔ تاریخ کے اسباق بغیر تصاویر اور نقشوں کے پڑھانا بھی بہت بڑی غلطی ہے۔

ریاضی کی تعلیم کا مقصد تخیل اور توجہ کو ایک مرکز پر لانا ہے نتائج اخذ کرنا اور ہر عمل میں صحت کی تلاش اس کے لوازمات میں سے ہے۔ سوالات کی تعداد یا درستی طلبا کے کام کا معیار نہیں ہے بلکہ غور طلب امر یہ ہونا چاہئے کہ سوالات کس طرح ٹھیک نکالے گئے ہیں۔ ایک مسئلہ کے اصول پر حاوی ہونا اور عمل میں لانا زیادہ ضروری ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ہندسوں کی بھول بھلیوں میں سے ٹھیک جواب حیرت انگیز طریقے سے پیدا کرایا جائے۔ اس فن میں نئے نئے طریقے سکھائے جاتا۔ زیادہ اہمیت رکھتا ہے چہ جائے تعداد سوالات۔ کوئی شخص ایسا احمق نہ ہوگا۔ جو درستی جواب کو ہی سوال کے لئے مفید اور قیمتی بات تصور کرتا ہو۔

جغرافیہ مقامات کے ٹھیک ٹھیک محل وقوع ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد غور و مطالعہ کرنا اور اسباب و علل کا استخراج ہے۔ جغرافیہ جدید تحقیق کے بموجب اس علم کو کہتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین نے اپنے اثرات مختلفہ سے انسان کی حالت کو کیوں کر تبدیل کر دیا اور انسان نے اپنی جد و جہد تحقیق اور جستجو سے زمین پر کیا کیا تبدیلیاں اور تغیرات رونما کئے جغرافیہ کا سبق جہاں تک ممکن ہو خوب دلچسپ بنانا چاہئے۔ دلکش تصاویر اور عمدہ نقشے اور اقسام و انواع کی اشیا طلبا کو دکھانی چاہئے۔

مادری تعلیم کی نگرانی نہایت ضروری بات ہے مگر یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس کی پروا نہ مدرسین ہی کرتے ہیں۔ اور نہ طلبا اس پر کافی توجہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ مادری زبان کو ایک معمولی مضمون سمجھا جاتا ہے اور ایسے مدرسین کو پڑھانے کو دی جاتی ہے جو ناکارہ ہوتے ہیں ان کا طریقہ تعلیم بھی کافی فرسودہ ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم میں بچوں کی گھریلو زبان کی پیروی کرنا کوئی بری بات نہیں ہے ہاں رکیک الفاظ اور مبتذل گفتگو روکنا چاہئے۔ استاد کو خود اپنی زبان سادہ اور نمائش سے پاک رکھنی چاہئے! ابتدا ہی سے بے حجابانہ اور آزادانہ اظہار خیال کا موقع طلبا کو دینا چاہئے خیالات کو نئے الفاظ اور نئے طرز بیان میں پیش کرنا اچھا ہے۔

الغرض جو بھی مضمون پڑھایا جائے اس میں طالب علم کا فائدہ اور بہبودی ہونی چاہئے نہ مضمون اور فن کی اعلیٰ نمائش۔ اس قسم کی بھڑک میں طلبا کا کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مدرس کو ہر وقت یہ خیال اپنے دل میں رکھنا چاہئے کہ طلبا مضمون سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور خود سے یہ سوال کرتے رہنا چاہیے کہ یہ مضمون میں کیوں کر پڑھاتا ہوں۔ وہ غرض اور غایت جو اس مضمون سے ہے وہ میں نے کہاں تک حاصل کری ہے۔ اور کون سے نئے طریقے اختیار کر دوں کہ یہ غرض پوری طور پر حاصل ہو جائے۔

اس زمانہ میں امتحانات کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی بلکہ ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ کیا خوب تمثیل سے کسی نے امتحانات کی تضحیک کی ہے۔ ایک گڈریا اپنی بھیڑوں کو خوب کھلانے کے بعد ان سے کہتا ہے کہ تم نے جو چارا اور گھانس کھایا ہے وہ اسی حالت میں اگل دو۔ وہ اس قدر انتظار نہیں کرتا کہ وہ غذا اُون اور دودھ کی شکل اختیار کر کے اس کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو امتحانات سے بڑھکر مدرسین کا طرز تعلیم ہے جس کی جانچ خوب کرنی چاہئے صدر معلم کو ہر وقت یہ دیکھتے رہنا چاہئے کہ آیا مدرسین کا طریقہ تعلیم ٹھیک باقاعدہ اور با اصول ہے یا نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صدر مدرس استادوں کے پیچھے پڑ جائے اور ہر وقت ان سے مواخذہ کرتا رہے مطلب یہ ہے کہ ان کو پسندیدہ طریقوں سے آگاہ کرے۔ ان کی رہنمائی کرے اور ان کی مدد کرے۔

محمد عبدالشکور خاں بی اے (عثمانیہ)
مددگار، مدرسہ فوقانیہ بسیٹر۔

۲۰

روئداد و اقتباس تقریر

اجلاس ہفتم اتحاد انجمن ہائے مدرسین ہند منعقدہ بنگلور

آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنز کا ساتواں سالانہ اجلاس بمقام بنگلور شہر انٹرمیڈیٹ کالج کے بڑے ہال میں بتاریخ ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۱ء منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت بجائے سر سری وی رامن کو بوجہ علالت آنہ سکے، مسٹر ان۔ ایس۔ سبّا راؤ، ایم۔ اے کنٹب۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ ناظم تعلیمات میسور نے کی۔ نمائندوں کی تعداد گو خاصی تھی، مگر آل انڈیا کانفرنس کے لئے جتنا اجتماع ہونا چاہئے، نہ تھا شمالی ہند کے نمائندے کم تھے، زیادہ تعداد جنوبی ہند کے نمائندوں کی تھی۔

جلسہ کا آغاز دعائیہ نظم سے ہوا جو مدرسہ کی طالبات نے خوش الحانی کے ساتھ سنائی پھر راؤ بہادر بی وینکٹش چار ایم۔ اے پروفیسر سنٹرل کالج اور صدر استقبالی کمیٹی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور سر رامن کی عدم موجودگی پر افسوس ظاہر کیا صاحب موصوف نے نمائندوں کا استقبال کرتے ہوئے بے روزگاری کے دو سبب بیان کئے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ مدارس اور کالج کے نصاب تعلیم ضروریات زندگی کے مطابق تیار نہیں ہوئے ہیں۔ دوسری یہ کہ روزگار اور معاش کی راہیں ہندوستان میں اس قدر نہیں ہیں جتنی کہ مغربی ممالک میں۔

جہاں تک میسور کا تعلق ہے، خوشی کی بات ہے کہ فنی تعلیم کو ترقی دی جارہی ہے اور یہ بھی طے پایا ہے کہ مہاراجہ میسور کی سلور جوبلی کی یادگار میں ایک ٹکنالوجکل انسٹی ٹیوٹ کھولا جائے۔ دوسرا اہم جزو تعلیم کا یہ ہے کہ یہاں ایک حد تک جبری تعلیم مفت دی جارہی ہے اور دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی ابتدا بھی ہو چکی ہے

اس کے بعد باقاعدہ تحریک پیش کی گئی کہ مسٹر سبا راؤ کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کر جلسہ کی کارروائی شروع کریں۔ اس تحریک کی تائید اور تائید مزید مختلف صوبوں کے نمائندوں نے کی صاحب موصوف نے کرسی صدارت پر متمکن ہونے کے بعد ہز ہائینس سر سری کرشنا راجندر بہادر مہاراجہ میسور۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای کا پیام تہنیت و تبریک پڑھ کر سنایا، جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

پیام مہاراجہ میسور

آپ کی کانفرنس ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ مگر میرے نزدیک اس کی قدر اور اہمیت ان کانفرنسوں سے زیادہ ہے، جو کرسمس کے زمانہ میں یہاں ہو رہی ہیں۔ آپ لوگ اس انقلاب پذیر زمانے میں قوم کی ذہنی ترقی و تشکیل میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم سب اس سے ناآشنا نہیں ہیں کہ اس زمانہ میں علمی ترقی بجلی کی رفتار کی طرح سرعت سے ہو رہی ہے اور ہر دور میں قدیم معیار و اصول فرسودہ ہو کر نابود ہو رہے ہیں ان کی جگہ نئے معیار و اصول لے رہے ہیں۔ یہ آپ کا کام ہے کہ قوم کی رہنمائی کریں تاکہ نئی پود غلط راہ روی سے محفوظ رہے۔

آپ کی ذمہ داری اہم ہے۔ آپ کو جدید تعلیم کے دوش بدوش رہنا ہوگا۔ اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول کو پیش نظر رکھ کر دانش مندی کے ساتھ صرف مغز کی باتیں لے کر انہیں ضروریات زمانہ کے مطابق پھیلانا اور اشاعت دینا ہوگا۔

یہی اصول ایسا ہے جسے ہر معاملہ میں غالب رہنا چاہیئے۔ اس وقت ہندوستان کی ایک ایک حکومت پر اسراف کا الزام بجا طور پر عائد ہو رہا ہے کہ رعایا کا روپیہ ایسی تعلیمی اسکیموں میں پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے جس سے طلبہ یا قوم کا فائدہ کم ہے اس تخفیف کے زمانہ میں بھی ہمیں ان اسکیموں کی تنسیخ سے اس وقت تک باز رہنا پڑتا ہے جبتک کہ نئی اسکیمیں پرانی اسکیموں کی جگہ نہ لے لیں، کیونکہ عام احساسات تخفیف کے خلاف ہیں۔

نئی اسکیموں کے لیے ایسی ہی کانفرنس کی جانب نظریں اٹھتی ہیں، جن کی تیاری میں چند خاص عوامل جیسے طلبہ کی نوعیت، اُن کی عمر اور صلاحیت نیز مدت تعلیم کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ موجودہ اسکیموں کے محاسن یا نقائص کے ظاہر کرنے میں آپ کے اپنے مشیر بھی موجود ہیں، جو آپ کی انجمن کے اراکین کے علاوہ اولیا ر طلبا پر بھی مشتمل ہیں۔ آپ کے سامنے قومیت کی تعمیر کا ایک عظیم الشان نصب العین ہے۔

آپ کی آمد پر میں خلوص کے ساتھ "خوش آمدید" کہتا ہوں، اور آپ کے مباحث کے نتیجہ کا منتظر رہوں گا۔ یقین ہے کہ ہندوستان کے اہم مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ پر جو اس وقت ہم سب کو پریشان کئے ہوئے ہے نئی روشنی ڈالی جائے گی۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے افتتاحیہ تقریر کی جو درج ذیل ہے۔ منتخب

صدارتی تقریر مسٹر سبا راؤ ایم۔ اے۔ ناظم تعلیمات میسور و صدر

مجھے ذاتی طور پر اور سرکار کانفرنس کی جانب سے بھی افسوس ہے کہ سر سی۔ اے دامن اپنی

غیر متوقع علالت کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ جن کی رائے اور قیمتی مشورہ آپ سننے کے لئے بے چین تھے میری موجودگی بحیثیت صدر کانفرنس ایک رسمی چیز ہے تاکہ عین وقت پر اس کمی کو پورا کروں جو غیر معمولی طور پر محسوس کی جا رہی تھی۔

عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ صحیح تعلیم کا اگر پتہ چلایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہ انسانی مشاغل کے سنوارنے کا موثر آلہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم انسانی زندگی کو بلحاظ کیفیت ابھارنے میں طاقتور حربے کا کام دیتی رہی ہے بلا رد و قدح یہ مسلم طور پر مان لیا گیا ہے کہ تعلیم حیات انسانی کا ایک لازمی جزو ہے۔ یا بالفاظ دیگر جمہوریت کے نشو و نما کی ایک پیشرو صورت ہے۔ اس کی خوشگوار علامت یہ ہے کہ تعلیمی منظوریاں صادر کرنے میں اراکین مجلس مقننہ نے گرمجوشی کے ساتھ تائید کی۔

تعلیم اور پیشہ مدرسی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم کی قبولیت کے ساتھ ساتھ سماج میں مدرس کا پیشہ بھی موقر سمجھا جانے لگا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ اس سرزمین میں جہاں گرو کا رتبہ روایاتی حیثیت رکھتا ہے مدرس کے ساتھ وہی سلوک مرعی رکھا گیا ہے جو روما کے رئیس اپنے مہذب یونانی غلاموں کے ساتھ (جو ان کے بچوں کے معلم تھے) روا رکھتے تھے میں کچھ تنگ دلی کے خیال سے یا اس لئے کہ میرا تعلق بھی اس طبقہ سے ہے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سماج میں مدرس کا جو اہم فریضہ ہے اس کا اعتراف فراخ دلی کے ساتھ کیا جائے مدرس کی اس بے وقعتی سے بعض وقت اس کی تعینیت پر برا اثر پڑتا ہے اور مدرسین نے اپنے مرتبہ کی پستی کو محسوس کر کے ہمیشہ کے لئے کمتری کی ذلت میں اپنے کو گرا دیا ایسی ہی کانفرنسوں کا کام ہے کہ وہ ان غلط تصورات کو جو مدرس کی شخصیت کے بارے میں عام ہیں دور کرے تاکہ ایک طرف ان کا پیشہ باوقعت سمجھا جائے تو دوسری طرف مدرس فن تعلیم کی نظری اور عملی معلومات اور جدید ترقیات سے لیس ہو کر اپنے فرائض کو انجام دے سکے۔

موجودہ کانفرنس کا تعلق دوسری کانفرنسوں سے بھی ہے جیسے سائنس کانفرنس اقتصادی کانفرنس اور تاریخی کانفرنس وغیرہ یہ سب کی سب مدرسین کی منظم کوشش کا نتیجہ ہیں تاکہ وہ جدید ترین ترقیات اور معلومات کے دوش بدوش رہ سکیں۔

ایک اہم ضرورت

اس زمانہ میں جب کہ تعلیمی دنیا سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں مدرسین کی مستعدی اور ان کی متحدہ کوشش کی سخت ضرورت تھی اب تعلیم کسی خاص طبقہ کے لئے محدود نہیں ہے بلکہ ہر فرد کا پیدائشی حق ہے تعلیم کی وسعت حیات انسانی کے

ہر شعبہ پر نرسری اسکول سے لیکر تعلیم بالغان تک کسی نہ کسی صورت سے چھائی ہوئی ہے مغرب میں اگر ایک طرف
نرسری اسکول قائم کئے جاتے ہیں تو دوسری طرف اس کا توازن مدارس بالغان کے ذریعہ برقرار رکھا
جاتا ہے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ غور و فکر کے بعد ایک ایسا مکمل نظام تعلیم مرتب کیا جائے۔
جو حیات انسانی کی گوناگون ضروریات انفرادی صلاحیت اور ضروریات کو ملحوظ رکھے۔ ہمارے مدارس
سے اس سے بھی زیادہ توقعات کی جارہی ہیں جنگ عظیم اور موجودہ اقتصادی پستی سے ایچ۔ جی۔ ویلس
کے اس مقولہ کی توضیح ہوتی ہے۔ کہ موجودہ زمانہ میں قوم ایک طرف تباہی و بربادی اور دوسری
طرف تعلیم کے درمیان ہے فی الوقت غالباً سب سے شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی پود کے خیالات
و عادات کی تربیت باہمی بھائی چارگی کے لئے کی جائے۔ اسی جانب پریسیڈنٹ ہوور صدر جمہوریہ
امریکہ نے کچھ دن پیشتر اشارہ کیا ہے کہ ہم اب انفرادی اعمال سے گذر کر جماعتی یا اجتماعی اعمال کی جانب
بڑھ رہے ہیں تعلیم سے اجتماعی طور پر کام کرنے کی اسپرٹ بمقابلہ انفرادی مادی کامیابی کے زیادہ
پیدا ہونا چاہیئے۔

فی الحقیقت تعلیم سے مراد وہ انفرادی تیاری ہے جس سے انسان دنیا میں بے تکلفی کے
ساتھ سرگرم عمل رہ سکے اور اپنے تئیں ماحول کے مطابق بنائے اور اپنے ماحول کو اپنی ذات سے
مستفید کرسکے فی الوقت اس ملک میں دو طرح کے رجحانات پیدا کرنے کی ضرورت ہے اولاً فنی تعلیم
کی تیاری ہے۔ جو مدارس میں اور مضامین کے ساتھ دی جائے۔ ثانیاً دیہی زندگی کو موجودہ صورت
کے حسب حال بنایا جائے کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے زراعتی ملک رہا ہے اور آئندہ بھی ایک عرصہ تک
زراعتی ہی رہے گا۔ بالفاظ دیگر ہندوستان میں مقاصد تعلیم چاہے کچھ اور ہی کیوں نہ ہوں فنی اور
زراعتی تعلیم کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بے روزگاری

ہمارا نظام تعلیم روز افزوں تعداد میں طیلسانین اور اس سے کم درجہ کے افراد
پیدا کررہا ہے جن کا ذریعہ معاش ملازمت سرکاری یا اُسی قسم کے اور کوئی روزگار
کے سوا کچھ نہیں ہے اب ہی ایسے خطرناک آثار موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں
بے روزگاری کا مسئلہ نزاکت اختیار کرتا جارہا ہے اگر حقیقت میں تعلیم قومی نقطۂ نظر سے عام کردیجائے
تو یہ مسئلہ بلاشبہ غیر معمولی وسعت اور نزاکت اختیار کرے گا تاوقتیکہ جو تربیت دیجارہی ہے اسے سماج
کی ضروریات کے مطابق نہ بنایا جائے۔ مغربی ممالک میں اقتصادی حالات زیادہ ترقی یافتہ
ہیں۔ اور پیشوں کی تعداد بھی بمقابلہ ہندوستان زیادہ ہے۔ وہاں صنعت و حرفت اور تجارت کی

ضروریات کے مطابق کامیاب طلبہ کی تعداد کو مطابق کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ کام بہت دشوار ہے
پہلے ملک کی اقتصادی حالت پر غائر نظر ڈالی جائے، پھر ترقی کے امکانات پر غور و فکر کر کے اُن کا
تعین کر دیا جائے۔ تب یہ ممکن ہے کہ مغربی ممالک کی طرح ہم اپنے نظام تعلیم کو ضروریات ملک کے مطابق
بنا سکیں گے۔ بحالت موجودہ فنی مدارس کا قائم کرنا تاوقتیکہ ضروریات کا اندازہ نہ ہو محض بے سود ہوگا۔
ضرورت ہے کہ صنعت و حرفت کے قائدین، ماہر تعلیم اور ماہر اقتصادیات کا اتحاد قائم ہو۔

دیہی تنظیم

دوسرا مسئلہ جس کے حل کرنے میں ملک کے مدارس کا اہم حصہ ہے، وہ دیہات کی اصلاح
یا دیہی تنظیم ہے۔ یہ بات تو عام طور سے معلوم ہے کہ ہندوستان کی زراعت نازک حالت
میں ہے جس سے مزارعین کی ابتری میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ دیہات کی زندگی خستہ حالت میں ہے
معمولی ضروریات زندگی مثلاً پینے کا صاف پانی، طبی امداد اور ابتدائی تعلیم کا نقصان ہے۔ اشیاء
کی قیمتوں میں تخفیف ہو جانے سے کسانوں پر کاری ضرب لگی۔ اس لحاظ سے دیہاتی رقبوں کی حالت
سقیم ہے۔ جو مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ وہ یہ ہے کہ رہائش کے لائق بنایا جائے۔ اس خصوص
میں مدارس قومی مرکز بن جائیں گے۔ اور مدرس کے فرائض توفیر طلبہ کی تعلیم کی حد تک محدود نہیں رہیں گے
بلکہ انہیں دیہی تنظیم میں بھی حصہ لینا ہوگا۔ ان کی حیثیت مثل ربط کی کڑیوں کے ہوگی۔ جو دیہات کو ان
قومی مرکزوں سے جو اصلاح کے لئے مقرر ہوں گے مربوط کر دیں گے۔

مندرجہ بالا امور اپنی نوعیت کے اعتبار سے عظیم الشان کام ضرور ہیں، جن کی مشکلات میں
اور بھی اضافہ اجنبی ذریعہ تعلیم کے باعث ہوگیا ہے۔ انگریزی ادب میں جو کچھ مفید باتیں ہیں، اور
جس قدر جدید ترقیات ہر شعبہ میں ہو رہی ہیں، اس کے واقف رہنے کے لئے انگریزی کا جاننا ضروری
ہے۔ ہمارا نظام تعلیم اس اعتبار سے کہ اجنبی ذریعہ سے طلبہ کی تربیت کر رہا ہے حالات کے موافق
نہیں ہے۔ اور اس سے کافی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ یہ امر طمانیت بخش ہے کہ اب وثوق کے ساتھ رائے
میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ اور اس بات کی تائید کی جا رہی ہے کہ دیسی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔
مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں ایسا نظام تعلیم سارے ملک پر چھا جائے گا۔ جس سے نہ صرف روپیہ
بلکہ محنت کی بچت بھی ہوگی۔

تعلیم کو اقتصادی ضروریات کے مطابق

بحیثیت ایک متعلم اقتصادیات کے، جو تعلیم کے صیغہ میں رہ پڑا ہو، میں نے
غالباً زیادہ بلکہ شاید غیر معمولی زور دیا ہے کہ تعلیم اقتصادی ماحول کے
مطابق ہو، لہٰذا اس الزام سے کہ میں تعلیم کے عملی پہلو کو زیادہ اہمیت دے رہا ہوں
ہونا چاہئے۔

بچنے کی کوشش کرونگا۔ مجھے پورا پورا احساس ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں جہاں اور نقائص ہیں وہاں یہ بھی ایک نقص ہے کہ فنی تعلیم کے لحاظ سے اس میں تنوع نہیں ہے۔ نیز فطرت انسانی کے جذباتی اور جمالیاتی پہلوؤں کو ترقی دینے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ مثلاً مدارس میں موسیقی سے غفلت برتی جارہی ہے میں زور دوں گا کہ خاص طور پر مشترکہ گانے رائج کئے جائیں۔

تعلیمی ترقی کی یہ سب راہیں ایسی ہیں کہ جن میں تنظیم اور پالیسی اور ان سے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ ایسی کانفرنسوں کے انعقاد کا منشا یہ ہے کہ اول الذکر کے سلجھانے میں مدد دے اور ثانی الذکر کو قوم اور مدبّرین کے لئے اٹھا رکھے کہ وہ اس کا انتظام کریں۔

مذہبی اور اخلاقی تعلیم

دوپہر کے جلسہ عام میں جس کی صدارت پروفیسر اے۔ آر واڈیا بی۔ اے کینٹب بار ایٹ لا پروفیسر فلاسفی مہاراجہ کالج بنارس نے کی تھی، دلچسپ اور گرم مباحثہ رہا "مذہبی اور اخلاقی تعلیم" پر بحث کرتے ہوئے مسٹر وینکٹ راما وظیفہ یاب سرکل انسپکٹر نے کہا کہ مدارس میں مذہبی تعلیم کی کمی قابل افسوس ہے حالانکہ مذہبی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ لہٰذا میں زور دیتا ہوں کہ یہ مضمون شریک نصاب کیا جائے۔ راؤ بہادر ونکٹیشن چار نے اس بنا پر مخالفت کی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام ہندوستان میں محض اس بنا پر ناممکن ہے کہ مذاہب کی کثرت ہے اس کے علاوہ مذہبی تعلیم اولیائے طلبہ کا فریضہ ہے نہ کہ مدرسین کا طلبہ کے محاسن یہ ہیں کہ وہ عصبیت سے مبرا ہوں اور صداقت کو سختی کے ساتھ اپنا شعار بنائیں نصاب تعلیم میں یہ بات بھی ہو کہ طلبہ کی تہذیب اور شائستگی اور جمالیاتی ذوق کو ابھارے۔ مسٹر سباش چندر دسو نے کہا کہ مذہبی تعلیم عملی نمونہ سے دی جائے اور مدرسین مدرسہ میں اور مدرسہ کے علاوہ آزادی کے ساتھ طلبا سے ملیں۔ مسٹر ہنمنت راؤ نے کہا کہ ہندوستان میں مذہبی لوگوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ عملی انسانوں کی

مسٹر ہاشمی (علی گڈھ) نے کہا کہ مذہب وجدانیات کا نام ہے، اور یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس لحاظ سے بچوں کے ذہن پر مذہبی اصول کا بار نہ ڈالا جائے۔ سلطان محی الدین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر میسور نے مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ مذہب نام ہے اخلاق حسنہ کا جس میں تاثر کا عنصر بھی شریک ہے یہ مناسب نہیں کہ تعلیم اخلاق کی آڑ میں مذہب کو آگے بڑھایا جائے۔ مس ٹیلر وغیرہ نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا جس کے بعد پروفیسر واڈیا نے اختتامی تقریر میں فرمایا کہ میں مذہبی تعلیم کو رواج دینے کے سخت مخالف ہوں مذہبی تنگ نظری سے ہندوستان کا کافی نقصان ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اچھا مدرس مل جائے تو اخلاقی تعلیم دیجا سکتی ہے، بفرض محال اگر مذہبی تعلیم دی بھی جائے تو اس بنیاد کی ہو کہ

کہ خالق اکبر مجازی باپ ہے اور سب اس کے بندے ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس طرح عالم گیر اخوت قائم ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ہندوستان میں طلبا بے لگام چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اور ان میں اخلاقی کمزوری پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ہندو بھگوت گیتا کے ساتھ قرآن مجید پڑھیں اور مسلمان قرآن مجید کے ساتھ گیتا کا درس حاصل کریں۔

تعلیم اور تغیر پذیر ہندوستان

فیڈریشن کا دوسرا اجلاس انٹرمیڈیٹ کالج میں زیر صدارت مسٹر بتاماؤ بتاریخ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء منعقد ہوا۔ عنوان بالا کے تحت کئی مضامین پڑھے گئے، اور دلچسپ تقریریں اور مباحثے ہوئے۔

تعلیمی مطمح نظر وفاقی ہند میں

سردار اے نی. مکرجی (ریاست دیواس) نے اپنا مضمون بہ عنوان "تعلیمی مطمح نظر وفاقی ہند میں" پڑھا۔ موصوف نے فرمایا کہ نافذ الوقت نصاب تعلیم اور اس کے فرسودہ مقاصد کے تحت محض ادب پر زور دیا جارہا ہے، ایک ڈھرّے پر تعلیم ہو رہی ہے طلبا اسی طرح معلومات جذب کرنے اور نظریوں کو دُھراتے ہیں انہیں نہ بصیرت پیدا ہوتی ہے اور نہ انھیں نظریوں کا مصرف معلوم ہوتا ہے مبادیات علم کو سیکھنے کی وہی غیر دلچسپ کوشش ہے وہی مدرسے کے روکھے پھیکے اوقات مسلسل تعلیم کا تھکا دینے والا ناقص طریقہ امتحان کے باوجود ان کے پاس کرنے کی وہی کوشش اور کشمکش حیات کے لئے بڑی بڑی ڈگریاں مضحکہ خیز خبط، یہ سب چیزیں قوم کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں، صنعت وحرفت کے انکشافات کی کمی اور افزائش سرمایہ کی عدم تشویق سے کمانے کی قوت گھٹ رہی ہے، اور فوجی تربیت کے نہ ہونے سے اخلاقی شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ وفاق ہند کے مختلف تعلیمی ضروریات پر نظر ڈالی جائے، اور اس وفاق کے تحت معائنہ مدارس کے انتظامات کئے جائیں اور یکساں معیار سب کے لئے قائم کیا جائے اور تعلیم بھی وفاقی نقطہ نظر سے ہو نیز تعلیمی ترقی کی ذمہ داری حکومت پر اسی طرح عائد کی جائے جیسے قیام امن اور نفاذ قانون کی ذمہ داری۔ جبری عام تعلیم کو رواج دیا جائے اور فوجی تربیت اور حکومت خود اختیاری طلبہ میں عام کی جائے دیسی زبانیں ملک کے طول وعرض میں اختیار کی جائیں اور انگریزی کی حیثیت بطور لازمی زبان برقرار رہے، اس کے ساتھ ساتھ جسمانی اور دماغی نشو ونما نیز دست ورزی کو نظر انداز کیا جائے۔

تعلیم حکومت خود اختیاری کے لئے تیار کرے

رائے بہادر شنکر جیا (بنارس) نے کہا کہ ہندوستان تیزی کے ساتھ جمہوریت کی جانب قدم بڑھا رہا ہے۔ اگر تعلیم کو کارآمد اور مفید بنانا ہو تو نئی پود کو جمہوری حکومت میں زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے۔ موجودہ نظام تعلیم

اس کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ اس لئے نئے دور کے آغاز کی ضرورت ہے جمہوری ملک میں ضرورت ہے کہ طالب علم مندرجہ ذیل صفات سے متصف ہو۔

(۱) طالب علم اپنے خیالات کو تحریر یا تقریر میں اپنی مادری زبان میں ادا کر سکے۔

(۲) رواداری ہو۔

(۳) زندگی کو سماجی مطمح نظر سے دیکھے

(۴) دیانت داری اور راست بازی ہو۔

(۵) کاروبار کو سنبھالنے کی عادت ہو اور راست بازی سے کام لے۔

(۶) ضبط کا کما حقہ احساس ہو۔

تعلیمی اداروں میں سیرت سازی اور طلبہ کی انفرادیت کا ابھارنا مطمح نظر ہو نہ کہ امتحان پاس کرانا۔ سیر تکمیل، کشافہ، ڈرل، کیڈٹ کور، اتحادی انجمن، مباحثے اور مصنوعی پارلیمان وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے حصول مقصد میں بڑی مدد ملے گی بشرطیکہ صحیح طریقہ پر طلبہ کی تربیت کی جائے۔

لاسلکی اور تعلیم پروفیسر ایس۔ آر کینٹی بٹ (ٹاٹا سائینس انسٹیٹیوٹ بنگلور) نے "لاسلکی اور تعلیم" کے عنوان پر زور دیا۔ لاسلکی کے انتشارات کے ذریعہ تعلیم دینے میں دو فائدے ہیں، اولاً یہ کہ تمام عالم بمنزلہ جماعت مدرسہ کے ہے۔ دوسرے مدرس کی شخصیت کا سوال باقی نہیں رہتا۔ عوام کی تعلیم اور ان میں روشن خیالی پیدا کرنے کا نہایت ہی سستا اور تیز تر ذریعہ ہے۔ لاسلکی کے مدارس ہمارے مدارس تعلیمی کا بدل تو نہیں ہو سکتے مگر بڑی حد تک ان کے معاون بن سکتے ہیں

نصاب کی تیاری ڈاکٹر ایم سیدھ لنگیا ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے مسئلہ نصاب پر بحث کی اور زیادہ تر تحتانیہ مدارس کے نصاب پر زور دیا موجودہ نصاب تعلیم مدارس تحتانیہ کے لئے بے حد غیر موزوں ہے وہ زیادہ تر ذہنی تربیت Mental Discipline کے نظریہ پر مبنی ہے اور جو کچھ اس میں اصلاح ہوئی ہے وہ کسی بنیادی اصول کے تحت نہیں ہوئی۔

ضرورت ہے کہ ایسا نصاب نامہ تیار کیا جائے جو موجودہ ہندوستانی زندگی کے لائق ہو نصاب تعلیم شہری اور دیہی زندگی اخلاقی اور اقتصادی نیز سیاسی زندگی اور ملک کی تہذیب اور تمدن کے پہلوؤں کو لئے ہوئے ہو اس سب سے زیادہ حقیقی عملی زندگی پر زور دیا جائے۔ نئے نصاب سے یہ مطلب ہے مقصد میں تبدیلی کی جائے اور اس مقصد سے طلباء کی موجودہ زندگی میں بہتری اور اصلاح ہو۔ نصاب نامہ کی فہرست مضامین میں تبدیلی ہو۔ اور یہ مضامین طلباء کے مشاغل زندگی پر مشتمل ہوں۔ ان مضامین کا آپس

گہرا تعلق ہو اور اس کے ساتھ طریقہ تعلیم میں بھی تبدیلی کی جائے۔ استاد کی حیثیت سخت گیر مدرس کی نہو
بلکہ شفیق رہبر کی۔

نصاب تعلیم ہر وقت اور ہر مقام کے لئے ایک ہی معین نہ ہو بلکہ طلبا کے ماحول کے مطابق بنایا جائے
جو کچھ تبدیلی نصاب میں کی جائے وہ تدریجی ہو۔ نیچے کی جماعتوں سے ابتدا کی جائے تاکہ اس تبدیلی کی صورت
ارتقائی رہے۔ دیہی ماحول اس قابل ہے کہ اس میں پراجکٹ متھڈ کو اچھی طرح رواج دیا جا سکتا ہے دیہی
اور شہری نصاب میں کافی امتیاز برقرار رکھا جائے ان کے مقاصد ایک ہی ہوں گے مگر راہیں الگ الگ

تعلیم اور وفاقی مطمح نظر

مسٹر ایس۔ کے یگنارائنا ایر (مدراس) نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان
میں نئی پالیسی کا آغاز ہونا چاہیئے ہندوستانی تمدن اور وفاقی مطمح نظر اس جدید
پالیسی کی خصوصیت ہوگی۔ موجودہ نظام تعلیم قدیم زمانہ کی یادگار ہے جس میں
قومی زاویہ نظر سے تعلیم دینے کی کوئی رعایت نہیں ملحوظ رکھی گئی۔ امریکہ میں طلبا کو حکومت خود اختیاری
عطا کی جاتی ہے اور آزادی کے منشور دیے جاتے ہیں۔ ہمارا نصاب تعلیم ان تحریکات سے کوسوں دور
ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ جلد ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے، جو کامل تحقیقات کر کے ایک ایسا نظام العمل
پیش کرے، جو ملکی حالات اور ضروریات کے لحاظ سے موزوں ہو۔

معائنہ مدارس

دوپہر کے اجلاس میں جو کنہیا لال صاحب رازدان ایم۔ اے انسپکٹر مدارس گوالیار کی صدارت
میں ہوا، دلچسپ تقریریں ہوئیں، اور گرم مباحثہ چھڑ گیا۔ عنوان زیر بحث "معائنہ مدارس" تھا۔ معائنہ مدارس
کے خلاف بولنے والوں کی تعداد بکثرت تھی، اور موافق بولنے والے بمشکل دو نکلے۔ مخالفین نے سارا کچا چٹھا
کھول کر رکھ دیا ساری تقریروں کا ماحصل یہ تھا کہ معائنہ کے اغراض و مقاصد فوت ہو رہے ہیں۔ مدرسہ کی
کارگزاری یا عدم کارگزاری کا مدار محض شخصی رائے اور افسر کی خوشنودی اور اس کے افتاد طبیعت پر
ہے۔ کوئی ظاہری صفائی اور مدرسہ کے ٹیم ٹام پر خوش ہو کر اچھی رپورٹ لکھ دیتا ہے، تو کوئی معائنہ کی
تقریب میں اسی جلسہ کی صدارت کرنا چاہتا ہے۔ ایسے بھی انسپکٹر موجود ہیں جو اپنی رائے کے آگے کسی کی
چلنے نہیں دیتے۔ لہجہ درشت انداز بیان تحکمانہ ہوتا ہے، اور طلبا کی موجودگی میں مدرسین سے الجھ پڑنے
میں تامل نہیں کرتے اور ڈانٹ پھٹکار سے کام لیتے ہیں غرض کہ اس طرح کے معائنہ سے کبھی مدرسہ کی
اصلی حالت کا اندازہ نہیں ہوتا ایک مقرر نے اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایسے بھی
انسپکٹر مدارس موجود ہیں، جو معائنہ تو خاک بھی نہیں کرتے مگر کمروں کی چھت اور کونوں کا معائنہ کر کے

صرف کلرکی کے جائے ڈھونڈنکالتے ہیں۔ جوش تقریر میں مقرر نے کہا کہ کاش انسپکٹروں کی جماعت ہی دنیا سے مفقود ہوجاتی۔

مسٹر۔ کے ایس۔ وکیل۔ ایم۔ اے۔ ام۔ ای۔ ڈی۔ انسپکٹر مدارس دھارواڑ اور سلطان محی الدین صاحب ایم۔ اے۔ ایم ای ڈی۔ ڈپٹی۔ ڈائرکٹر میسور نے پرمغز تقریریں کیں اور شکوک دور کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی تقریروں کا لب لباب یہ ہے اس عہدہ کا نام ہی سرے سے غلط ہے۔ ہندوستان میں انسپکٹر کہتے ہیں مگر دیگر ممالک میں ڈائرکٹر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ البتہ میسور میں یہ خوش گوار تبدیلی ضرور ہوی کہ اب انسپکٹر کو ڈپٹی ڈائرکٹر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے وہ بمنزلہ ایک مشیر یا ڈائرکٹر کے ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ مدرسہ کی اصلی حالت کا اندازہ لگائے اور مقامی حالات اور ضروریات سے واقف ہو۔ صدر مدرس اور اسٹاف مدرسہ سے خانگی طور پر گفتگو اور مشورت کرے، اور ان کی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دے۔ انسپکٹر بمنزلہ داعی اور پیام بر کے ہے جو پیام تعلیم یورپ کے جدید تحقیقات اور تجربات ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچاتا ہے۔ آپ لوگوں نے انسپکٹر کا مسخ شدہ نمونہ پیش کیا ہے جو شاید قدیم زمانہ میں ملتا ہو، یا آپ لوگوں کے لڑکپن کے تخیل کا نتیجہ ہو غرض کہ یہ مباحثہ دلچسپ تھا جو تقریباً ڈھائی گھنٹہ تک ہوتا رہا بعد برخواست جلسہ شرکا ر کانفرنس کو ٹاٹا سائینس انسٹیٹیوٹ کا معائنہ کرایا گیا، اور سہ پہر میں نمائش کا افتتاح ہوا، جس کی روئداد علحدہ درج ہے۔

جامعاتی تعلیم

تیسرے دن راؤبہادر ونکٹیش چار کی زیر صدارت جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ زیر بحث عنوان وو تعلیم یونیورسٹی تھا، جس میں متعدد سربرآوردہ اصحاب نے مثلاً پروفیسر پرنچ پائی، مسٹر نیٹسن، پروفیسر واڈیا اور مسٹر ہاشمی علی گڑھ وغیرہ نے حصہ لیا چونکہ یہ عنوان ہمارے مفید مطلب نہیں اس لئے ہم صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا چرچہ اب ہر جگہ ہونے لگا ہے اور وثوق کے ساتھ زور دیا جا رہا ہے کہ ذریعہ تعلیم دیسی زبان ہونا چاہئے عثمانیہ یونیورسٹی کے مطبوعات کی نمائش سلیقے کے ساتھ ایک بڑے ہال میں کی گئی تھی مستند کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں دیکھ کر شرکا ر کانفرنس متحیر نظر آتے تھے مسٹر ہاشمی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا تعارف مناسب الفاظ میں کیا۔ صاحب موصوف کی رائے میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی ذمہ داری بجا طور پر بجائے لارڈ میکالے کے راجہ رام موہن رائے پر عائد ہوتی ہے مسلم یونیورسٹی کے مقاصد کے بارے میں یہ کہا کہ محض ادیب پیدا کرنا اس کا مطمح نظر نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عملی انسان پیدا ہوں۔ علی گڈھ یونیورسٹی کی

ایک نمایاں خصوصیت انہوں نے یہ بیاں کی کہ اس کے دروازے ہمیشہ ہر مذہب و ملت کے طلبہ اور پروفیسروں کے لئے کھلے رہتے ہیں۔

فڈریشن کا اخیر اجلاس زیر صدارت سُبا راؤ صاحب ناظم تعلیمات بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء منعقد ہوا۔ یہ جلسہ صرف تحریکات کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ کارروائی شروع کرنے سے پیشتر سر آوردہ اشخاص کے پیام تہنیت و تبریک صدر منتخب نے سنائے، جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔

ڈاکٹر پال مرسو پریسیڈنٹ ورلڈ فڈریشن آف ایجوکیشنل اسوسی ایشنز نیویارک، پروفیسر جی کے۔ دیوادھار صدر سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی، ڈی۔ ان کرجی ٹریننگ کالج آگرہ وغیرہ۔

تحریکات منظورہ کانفرنس

پہلی تحریک کے ذریعہ مولوی سید ظہور علی صاحب کے انتقال پر اظہار رنج اور افسوس کیا گیا۔ اس کے بعد کی تحریکات بتقریب سلور جوبلی سرا بندرا ناتھ ٹیگور اور بتقریب سترہویں سالگرہ پنڈت مدن موہن مالویہ باتفاق آرا پاس ہوئیں۔ باقی رزولیوشن درج ذیل ہے۔

کانفرنس ہذا ریلوی بورڈ سے استدعا کرتی ہے کہ مدرسین کو جب وہ باغراض تعلیمی سفر کریں رعایتی ٹکٹ عطا کرے۔

کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ ہندوستان کی جامعات ادبی تعلیم سے زیادہ شعبہ ٹکنالوجی کی جانب توجہ کریں۔

کانفرنس ہذا میں طے پایا کہ مدارس اور کالجوں میں طلبہ کی جسمانی نشو و نما کا زیادہ لحاظ کیا جائے۔

کانفرنس کی رائے میں پیشہ مدرسی کی اہمیت کے مدنظر قرین انصاف ہے کہ مختلف تعلیمی اداروں میں تنخواہوں کا امتیاز اٹھا دیا جائے۔

کانفرنس ہذا ان انقلابی جرائم کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ جس کے مرتکب طلبہ ہوئے ہیں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ تعلیمی اداروں کے نیک نام پر اس قسم کا بدنما دھبہ نہ لگنے پائے۔

کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ مدارس فوقانیہ اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم ملکی زبان میں ہو۔

جہاں تک کہ اس تحریک کا تعلق مدارس فوقانیہ سے تھا، سب نے باتفاق آرا منظور کر لیا، مگر اعلیٰ تعلیم کے بارے میں شدید اختلاف رہا۔ اور گرم مباحثہ چھڑ گیا۔ مگر اس تحریک کا دوسرا

جزو بھی بغلبہ آرا منظور ہوا۔ تحریکات کے پیش اور منظور ہونے کے بعد سکریٹری معتمد آل انڈیا فڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنز کانپور نے استقبالی کمیٹی اور رکارکنان کانفرنس کا شکریہ ادا کیا۔ ٹیچرس اسوسی ایشن پنجاب نے سال آیندہ فڈریشن کا اجلاس بمقام لاہور منعقد کرنے کی دعوت دی تھی جو منظور کی گئی پھر صدر جلسہ نے کامیابی کانفرنس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی جس کے بعد اجلاس برخواست ہوا۔

دوسری مصروفیتیں اور دلچسپیاں

استقبالی کمیٹی نے نمایندگان کانفرنس کی دلچسپی کے انتظامات بھی معقول کئے تھے۔ کانفرنس کے دوسرے دن ٹاٹا سائنس اسٹیٹوٹ بنگلور کا معائنہ کرایا گیا جو بلحاظ اہمیت قابل دید ہے۔

متواتر دو دن ۶ بجے سے ۸ بجے تک موسیقی کا انتظام زیر نگرانی مس لزارس کیا گیا تھا۔ دیتی ولاس اسٹیٹوٹ کے طلبہ اور زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج کے طالبات نے شرکائے کانفرنس کو کانسرٹ سے محظوظ کیا۔ "خلیفہ بغداد" سے چند سین انگریزی میں دکھائے پھر کالج آرکسٹرا نے نغمہ سرائی کی۔ رتناولی کا سین سنسکرت میں کیا گیا۔ پھر تمام رضاکاروں نے مشترکہ طور پر حصہ لیا اور مادر ہند کی ستایش میں گائے ہوئے حاضرین جلسہ طلبہ اور طالبات کی اداکاری اور ترنم سے مسرور ہوئے۔

ختم کانفرنس کے بعد میسور کا سفر کیا گیا۔ راستے میں جتنے تاریخی اور اہم مقامات پڑے ان کے دیکھنے کا انتظام بھی تھا۔ مثلاً آبشار سیوا سمدرم الکٹرک پاور ہاؤس اور سیرنگ پٹن وغیرہ آبشار کا منظر جس کے پانی سے برقی قوت پیدا کی جاتی ہے اور برقی خزانہ کا منظر خوش نما ہے۔ جو مشین پاور ہاؤس میں کام کر رہی ہے ان کے معائنہ سے انسانی سرگرمیوں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں سے ۱۰۰ میل تک برقی رو پہونچائی جاتی ہے جس کی خالص آمدنی دو لاکھ روپئے سرنگ پٹن میں بجز مقبرہ (حیدر علی و ٹیپو سلطان مدفون ہیں) اور دولت دریا باغ کے کوئی عمارت شاندار نہیں ہے باقی تمام شہر کھنڈر بن چکا ہے میسور کے مشہور مقامات شامنڈی ہل راجہ صاحب کا محل موہن بیلیس اور چڑیا خانہ قابل دید ہیں میسور سے ۱۲ میل پر ایک زبردست بند کے ذریعہ دریا کا پانی روکا گیا ہے۔ یہ تالاب کرشنا راج ساگر کے نام سے موسوم ہے جس سے ملک کے کافی حصہ کو نہروں کے ذریعہ سیراب کیا ہے۔

عبدالنور صدیقی

آل انڈیا نمائش تعلیمی بنگلور

آل انڈیا نمائش تعلیمی کا انتظام آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنز کی استقبالی کمیٹی نے وسیع پیمانے پر بمقام بنگلور کیا تھا جس کا افتتاح بمقام مشن ہائی اسکول بسوناگڈی بنگلور، دیوان بہادر سر کے۔ پی۔ پٹناچیٹی نے کیا۔ فیڈریشن کے نمائندے اور شہر کے ممتاز اشخاص بوقت افتتاح موجود تھے اس موقع پر صاحب موصوف نے حسب ذیل تقریر کی۔

دیوان بہادر سر کے پٹناچیٹی

مجھے اس امر سے مسرت ہے کہ میں اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ موجود ہوں جب معتمد صاحب نے افتتاح نمائش کے لئے مجھے مدعو کیا تو مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ میں کس قسم کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہوں لیکن نرم الفاظ نے مجھ پر اثر کیا اور میں بلا سوچے سمجھے اس اہم ذمہ داری کے لئے تیار ہوگیا۔ نمائش کے افتتاح کے لئے سب سے موزوں شخص ناظم تعلیمات تھے مگر سر رامن کی عدم موجودگی کے باعث کانفرنس کی رہنمائی کا اہم فریضہ ان کے تفویض ہوا تو کمیٹی نے مجھ جیسے دیرینہ سال بڈھے کو جو مدتیں گذریں از کار رفتہ ہوچکا تھا۔ اور گوشۂ تنہائی کے لئے وقف تھا، ڈھونڈ نکالا۔ بڈھے آدمی بھی کبھی کام دے جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت نئی پود سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جس کی ترقی پر ہندوستان کے مستقبل کا مدار ہے۔ تعلیم بڑا ہی وسیع مضمون ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس قسم کی تعلیمی نمائش سے کیا جاسکتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قوم کے ہر چھوٹے یا بڑے طبقہ کی ترقی کے لئے کیا کیا جارہا ہے؟۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ پانی کہاں مرتا ہے۔ اور ہماری کمزوریاں کیا ہیں۔

تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اپنی تعلیم کے صحیح نمونے مل رہے ہیں؟ ڈیڑھ صدی کی تعلیمی جد و جہد کے بعد بھی بمشکل ۵۔ فی صدی اشخاص تعلیم یافتہ ہوسکے بقول ایک قدیم فیلسوف کہ حکومت کا استحکام اس کے نوجوانوں سے ہے۔ فی زمانہ ہم نے تو یاس انگیز اور قنوطیت آمیز چیخ پکار ہی سنی کہ ہمکو... تعلیم سے نقصان ہی پہونچا۔ اس حیثیت سے کہ ہم نے ایسا پست طبقہ پیدا کر دیا جو اپنے بقاے حیات کی کوشش آپ نہیں کرسکتا۔ ہماری تعلیم سے

بلاشبہ سربرآوردہ مرد اور سربرآوردہ خواتین پیدا ہوں۔ اس لحاظ سے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا نظام تعلیم ناکام رہا۔ ہم اپنے گرد و پیش علمی چہل پہل ضرور دیکھتے ہیں اور ہم ترقی اور بلند پروازیوں کے آثار نتیجہ کے طور پر مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم سے عملی انسان پیدا ہو رہے ہیں۔ تعلیم کا اثر جیسا کہ وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے یہ ہونا چاہئے کہ دماغ کو دولت علم سے مالا مال کر دے، اور ہاتھ کو عملی کام کے لئے جنبش میں لے آئے۔ اگر یہی معیار قائم رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس کے آثار ناپید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم کا مقصد سیرت سازی بھی ہونا چاہئے لیکن تنہا یہی مقصد کافی نہیں۔ انسانی تعلیم کا اہم جز عمل ہے میں لفظ عمل پر خاص طور سے زور دے رہا ہوں کیونکہ عمل بے علم انسان کی حیات عملی میں سراسر ناکامی کا مترادف ہے۔ اس قسم کے نمائشوں کی قدر و قیمت خاص ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن کیا تصور کر سکتا ہے اور ہاتھ کیا کام انجام دے سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ یہاں موجود ہے اس سے آنکھوں کو بھی سکھ نصیب ہوگا۔ اگر کوئی چیز ملک کی اصلاح کرتی ہے تو وہ تعلیم ہے تعلیمی مقاصد اور زاویہ نظر میں تبدیلی کی ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کی کانفرنس میں اس تبدیلی پر زور دیا گیا ہوگا۔ میں اپنے ناچیز خیالات کو جو اصلاح کے بارے میں ہیں مختصراً عرض کرونگا۔

۱۔ موجودہ اوسط تعداد مدارس میں اضافہ ہو۔ اور ٹرینڈ مدرسین کی تعداد میں بیشی ہونا چاہئے۔ پیشہ معلمی کے لئے مستورات کو ترجیح دیجائے کیونکہ تہذیب یافتہ ممالک میں عورتوں کی دو تہائی تعداد ایسی ہے جنہیں بچوں کی تربیت اور پرداخت کا خلقی طور پر مذاق ہونا چاہیے۔

خاص مدارس اندھوں، بہروں، اور ناقص القویٰ کے لئے قائم جائیں اور فنی تعلیم کا وسیع پیمانے پر انتظام ہو۔ تیمارداری اور مبادیات اصول طب کی تعلیم مدارس میں دیجائے۔

مدرسہ کے کام کے بارہ میں خصوصاً طبقہ تحتانیہ میں بچے کی زندگی مدرسہ کے اندر یا مدرسے باہر آپس میں گہرا تعلق رکھے اور تعلیم کتابی نہیں بلکہ عملی ہو۔ نیز نصاب کے تقریباً ہر مضمون کی تعلیم میں مدرس ایسے آلات اور تجربوں سے کام لے، جن سے طلبا واقف ہوں۔

مدرسہ کا اثر اور نفوذ طالب علم کے جملہ مشاغل اور دلچسپیوں پر چھایا رہے۔ مدرسہ کی تعلیم بچوں کو سکھائے کہ وہ اپنے دماغ اور ہاتھ دونوں کو کام میں لائیں اور کام اور کھیل دونوں کی قدر جان لیں۔

مجھے آپ جیسے ماہرین تعلیم کے سامنے جو ہندوستان کے ہر گوشہ اور چپے سے یہاں جمع ہوئے ہیں زبان کھولنے کی مہارت کہاں اور نہ مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ تعلیم کے ذریعہ انسان کی عملی زندگی کو کیسے ترقی دیجا سکتی ہے بچوں کی تربیت کامیابی کے ساتھ اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ طلبا کے نفسیات سے واقفیت ہوجائے۔ مدرس کا کام ہے کہ بچوں کی خصوصیات اوران کی جبلت کو ترقی دے۔ رُوسو، سب سے پہلا شخص ہے جس نے زیادہ توجہ بچہ پر دی اور فطرتی طریقہ تعلیم کوان کے حسب حال قرار دیا۔ پتا لوزی نے اسی بنیاد پر نئی عمارت کھڑی کردی اور فروبل نے اسے تکمیل کو پہونچایا۔ ان ماہران فن کے اصول پر کام کرنے کے لئے خصوصاً چھوٹے بچوں کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہندوستانی عورتیں آج وہ نہیں رہیں جو کل تھیں اور مستقبل قریب میں وہ تعلیم اور تنظیم میں بہتر طریقہ پر حصہ لیں گی۔ ہندوستانی عورتیں قوم کے آگے اس سے بہتر کیا تحفہ پیش کرسکتی ہیں کہ نونہالان ملک کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لیں اور ہندوستان کی عظمت کو چار چاند لگادیں۔

اس تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا، اور حاضرین نمائش کے کمروں میں داخل ہوئے۔ آٹھ کمروں میں تقریباً چار ہزار اشیا رنمائش سلیقہ کے ساتھ رکھی گئی تھیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ اشیار نمائش طبقۂ تحتانیہ،

۲۔ تعلیم جدید۔ (مانٹی سوری سسٹم ڈالٹن پلین) پراجکٹ میتھڈ، سیا فور سگنلنگ اوراندھوں بہروں کی تعلیم،

۳۔ فنون لطیفہ۔

۴۔ تعلیم نسوان۔

۵۔ فنی تعلیم۔

۶۔ جسمانی تربیت۔

۷۔ بچوں کی بیکاری کے شغلے۔

۸۔ بچوں کی تعلیم۔

اس نمائش میں ۱۲۵ مدارس نے حصہ لیا جن میں سے صرف ۳۵ مدارس ریاست میسور کے تھے۔ گو باہر سے نمائش کی چیزیں بہت کم آئیں مگر اشیار نمائش تعلیم کے تمام مختلف شعبوں اور پہلوؤں سے تعلق رکھتی تھیں۔ چن پٹنم۔ (میسور) کا چوبی کام نہایت عمدہ تھا، مال دیلی اور رمیلاپور کی

چیزیں بھی قابل تعریف تھیں۔ چونکہ یہ کام سرکاری مدارس کے صنعتی شعبہ کا تیار کیا ہوا تھا اس اعتبار سے ہر طرح قابل داد وستائش ہے۔

نمائش کے علاوہ ہندوستان کے مشہور کتب فروشوں نے بھی بک اسٹالس قائم کئے تھے جس کے لئے انٹرمیڈیٹ کالج کے چھ کمرے مختص تھے۔

عبدالنور صدیقی۔

ذیلی جلسے

متعلقہ اجلاس ہفتم آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشنز

فیڈریشن کے عام جلسوں کے ساتھ ساتھ چار ذیلی جلسے بھی منعقد کئے گئے۔ چونکہ دونوں اجلاس ایک ہی وقت میں ہوتے تھے۔ اس لئے شرکا کانفرنس کا دونوں جگہ رہنا ناممکن تھا۔ پچھلے سال آل ایشیا کانفرنس میں بھی یہی دشواری پیش آئی۔ اگر مضامین کی کثرت ہے تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بجائے تین دن کے کانفرنس چار دن رکھی جائے تاکہ شرکا کانفرنس تمام جلسوں میں شریک ہوکر مستفید ہوسکیں۔ ان جلسوں میں بھی اہم مضامین پڑھے گئے۔ شائقین کی دلچسپی اور استفادہ کے خاطر چند مضامین کا ضروری حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ذہنی نقص ڈاکٹر فرینک نورَنہا سپرنٹنڈنٹ ذہنی شفاخانہ بنگلور نے اس عنوان کی بحث کرتے ہوئے زور دیا کہ "ناقص القوای کی نگرانی حفاظت اور تعلیم کا معقول انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ پبلک اس سرد مہری کو بالائے طاق رکھ کر خاص طور پر ملتفت ہو جائے۔ اور جدید طریقے ناقص اور مردہ قوی کو ابھارنے اور جلا دینے کے لئے استعمال کرے، اب ذہنی نقص کے دریافت کرنے اور ان کے علاج کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ پبلک کو اس طرف رجوع ہوجانا چاہیئے۔ تاکہ قوم کا ایک ایسا طبقہ جو محض بے کار ہے کارآمد بن جائے۔

اس معاملہ میں افسوس ہے کہ کوئی منظم کوشش نہیں ہورہی ہے۔ اور نہ مجلس مقننہ ہی ایسے

تدابیر اختیار کر رہی ہے جس سے اس کا سدباب ہو سکے۔ خاص طور پر نوعمر مجرمین young Delinquent قابل لحاظ ہیں جن کے جرائم کی اصلی وجہ بیشتر کوئی نہ کوئی ذہنی نقص ہوتا ہے۔ نوعمری کی خطائیں اُن کی آوارگی اور آوارہ گردی عام ہے۔ مگر اس سے پبلک کی بے پروائی محض خطرناک ہے۔

اس قسم کی کوئی تربیت گاہ ان کی نگرانی اور تربیت کے لئے نہ ہونے سے ان اولیاء کی بے چینی اور پریشانی کا کیا حال ہوگا، جن پر بدقسمتی سے ناقص القوای بچوں کا بار ہے۔ ایسی صورتیں جہاں تک ہمارا خیال ہے اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

معمولی قسم کے ناقص القوای طلبہ کا صحیح القوئی کے ساتھ تعلیم پانا جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے حد درجہ نامناسب ہے۔ اس کا ارتفاع اچھے اور ناقص القوی دونوں کی خاطر جلد ہو جانا چاہئے، جن طلبہ میں معمولی سا نقص ہو ان کی اصلاح اور تربیت ہو سکتی ہے۔ مگر خاص طریقہ پر اور خاص خاص اساتذہ کی نگرانی میں موجودہ طریقہ جس سے دونوں قسم کے طلبہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں بے حد مُضر اور تضیع وقت ہے۔

میں کانفرنس سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اس آوارہ گردی اور آوارگی کے خطرہ کو دُور کرنے کی متحدہ کوشش کی جائے گی تاکہ ان نظر سے گرے ہوئے اور حقیر افراد کو نجات مل سکے اور اقتصادی حیثیت سے قوم پر جو بار ہے اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔

مدارس ثانویہ میں فنی تعلیم مسٹر ڈی آر مدہول کر (دہاڑواڑ) نے اس عنوان پر مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا۔

غیر تعلیمی حلقوں میں فنی تعلیم کے رواج دینے پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ بس اقتصادی حیثیت سے طلبہ کو کوئی محتاجی نہیں رہے گی اور وہ آیندہ زندگی میں بے فکر ہو جائیں گے جب یہ مقصد حاصل ہوتا ہوا انہیں دیکھتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ دماغی تربیت کے حامی اس کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ فنی تعلیم کے رائج کرنے سے طلبہ پر خواہ مخواہ بار پڑتا ہے۔ اور ان کی دماغی تربیت خاطرخواہ نہیں ہوتی۔

ماہرین تعلیم کو ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں کامل دماغی نشو و نما کے لئے فنی تعلیم ضروری ہے۔ ڈاکٹر سیگم، ڈاکٹر مانٹی سوری اور فردبل کے تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ دماغی قوت اور حرکی مشاغل Motor Activity میں گہرا ربط اور تعلق ہے

اسی لئے ماہرین تعلیم فنی تعلیم کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ فنی تربیت سے طالب علم خود کو پہچانتا ہی جو اور کسی پیشہ کی صلاحیت یا عدم صلاحیت کو معلوم کر لیتا ہے محنت کے کام اُسے ذلیل نہیں معلوم ہوتے اور اس سے اہل حرفہ کے بارے میں جو بدگمانی ہے۔ دوُر ہو جائے گی۔ مدرسہ میں مشاغل کی تبدیلی اور دلچسپی پیدا ہو جائے گی نیز مدرسہ اور سوسائٹی میں باہمی ربط بھی قائم ہوگا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ فرصت کے اوقات میں طلبہ کسی نہ کسی مشغلے میں مصروف رہنے کے عادی ہو جائیں گے۔

ذہنی پیمائش اور چند تجربے مسٹر این ایس۔ این شاستری ایم۔ ای (میسور) نے اپنے مضمون میں دو دلچسپ تجربوں کا ذکر کیا جو قارئین کی دلچسپی کی خاطر درج ذیل ہے۔

پچاس طلبہ کو سولہ تصویریں مع ان کے عنوان کے دکھائی گئیں اور سائیکو گیلوانومیٹر کے ذریعہ طلبہ کے تاثر کی پیمائش کی گئی۔ سب سے زیادہ تحتانیہ جماعات کے طلبہ نے تصویروں سے دلچسپی ظاہر کی اور عنوان کی جانب بہت کم متوجہ ہوئے۔ بخلاف اس کے چھٹے درجہ (اس۔ ال سی کلاس) کے لڑکے نمایاں طور پر عنوان کی جانب مائل ہوئے۔ صاحب موصوف کی رائے میں تیرہ سال کے سن میں اس قسم کی تبدیلی ہوتی ہے۔ اور طلبہ بجائے تصویر کے عنوان کی جانب توجہ کرنے لگتے ہیں۔

مضمون کا دوسرا حصہ ایک دوسرے تجربے سے متعلق ہے اس کے ذریعہ سے تجربہ کیا گیا کہ مادری زبان اور غیر زبان میں کسی چیز کے پیش کرنے سے جذبات میں کس درجہ کا فرق ہوگا۔ دو انگریزی شعرا کی مشہور نظمیں اور ان کا کنڑی ترجمہ پیش کیا گیا۔ ان کے پیش کرنے کے بعد جو ہیجان جذبات میں ہوا۔ وہ سائیکو گیلوانومیٹر کی مدد سے نوٹ کر لیا گیا مجموعی طور پر جذبات کا جس قدر ہیجان ہوا اس سے نتائج متخرج کئے گئے۔ دیسی زبان میں نمایاں طور پر جوش تھا اور انگریزی میں بہت ہی کم۔ پس جہاں تک جذبات کو اُکسانے اور ان کے تربیت کا تعلق ہے، دیسی زبان کو مفید طریقے پر ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی مدارس میں معیار انگریزی از را۔ ایس ونکٹ رامن (چتور) کیا انگریزی کا معیار گھٹ گیا ہے؟ انگریزی لکھنے کی قابلیت (قطع نظر انگریزی بولنے اور سمجھنے کی قابلیت کے) ایک حد تک کم ہو چکی ہے لیکن ہمیں غور کرنا چاہیے کہ پہلے انگریزی کی تعلیم صرف ایک طبقہ تک محدود تھی اب سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں اس کا اثر ہے۔ معیار کے گھٹنے کے اسباب یہ ہیں

عدم توجہی اور منافرت کے احساسات عام ہو چکے ہیں۔ دیسی زبانوں کو رواج دیا جا رہا ہے، مدارس ثانویہ میں انگریزی کے نصاب کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ اور انگریزی تعلیم کی تنظیم بھی با قاعدہ نہیں ہے۔

اصلاح کے لئے چند مشورے بھی دیئے جاتے ہیں۔ کتب کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت ہے طلبہ کی ذاتی کوشش کو ابھارا جائے اور سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہندوستانی مدارس کے لئے انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ قائم کیا جائے تاکہ انگریزی تعلیم کی بہتر تنظیم ہو سکے۔

اندھوں کی تعلیم اور مدرس از۔ بی۔ ان۔ دی راؤ (دیوریکھو) ہر شخص مدرس نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر شاذ ونادر کسی ناواقف مدرس کو کامیابی نصیب ہو تو اسے اتفاقی یا استثنائی صورت سمجھنا چاہئے۔ ایسی چند مثالوں سے بعض انانیت پسند مدرسین بھی پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے کو ہمہ داں سمجھنے لگے ہیں جن کی ذات سے طلبہ پر مضر اثرات مترتب ہو رہے ہیں جب تندرست اور صحیح القویٰ طلبہ پر اس قسم کے مدرسین کا اچھا اثر نہیں پڑتا تو اندھے لڑکوں کی تربیت کا جو کچھ بھی حشر غیر تربیت یافتہ مدرسین کے ہاتھوں ہو کم ہے۔ لہذا میں سخت احتجاج کرتا ہوں کہ اندھے اور بہرے لڑکے کسی طرح ان مدرسین کے سپرد نہ کئے جائیں جو اس خاص کام سے واقف نہ ہوں۔

اندھے لڑکے کی کیا تعریف ہے؟ اس میں اور صحیح القویٰ لڑکے کے ذہنی طریقۂ عمل میں کیا فرق ہے؟ صحیح القویٰ لڑکے Normal child کے حواس خمسہ اچھی حالت میں ہوتے ہیں اور حواس کا عمل بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ نیز دماغی مرکز صحیح طریقے پر مہیج کو قبول کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اندھا لڑکا ہمیشہ بصارت سے محروم رہتا ہے اور باقی حواس کی غیر معمولی ترقی سے بصارت کا بدل ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت بدل تو نہیں ہوتا گر چونکہ اسے ضرورتاً باقی حواس کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کے استعمال میں غیر معمولی صحت انہیں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس غیر معمولی صحت کی تعبیر اس طرح کی جا سکتی ہے جیسے کثرت کار اور مشق سے لوہار کو مہارت ہو جاتی ہے اور وہ لوہے کو ٹھوک پیٹ کر جب چاہتا ہے ڈھال لیتا ہے۔ یا ایک نقاش کی تیز نظر یا گانے والے کے تیز کان کو لیا جائے کہ وہ ایک نظر میں تصویر کی تفصیلات پر حاوی ہو جاتے ہیں یا تھوڑی سی توجہ میں گانے کی کسی خاص سر یا لے پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ بس یہی حال اندھوں کے حواس کا ہے۔

یہ کہنا کہ اندھوں کے دماغ کا وہ حصہ جس سے حس باصرہ کا تعلق ہے، مردہ یا ضائع ہو جاتا ہے۔ بالکل غلط ہے۔ ہاں بصارت کا آنا حصہ یا اور دوسرے حصے جو اس سے قریبی

تعلق رکھتے ہیں۔ ترقی نہیں کرتے یا یوں کہا جائے کہ زنگ آلود ہوجاتے ہیں۔ ان حصوں کا استعمال موقوف ہوجاتا ہے مگر وہ ماؤف نہیں ہوتے۔ حالیہ تحقیقات کی رو سے اس نظریہ کا بطلان ہوتا ہے کہ دماغ کے مختلف قطعات صرف متعلقہ آلات حس سے ہی تہیج میں آسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی آلہ حس دماغ کے کسی حصہ کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دماغ کے قطعات بصری اور اس کی متعلقہ قوتیں لامسہ حس اور حس بصری سے ترقی اور نمو پاسکتی ہیں۔ لہذا اندھے یا بہرے لڑکے کو تعلیم دی جاسکتی ہے لیکن کسی قدر دقت اور خاص نگرانی سے۔ اس اعتبار سے اندھے یا بہرے لڑکے کو ناقص القویٰ نہ کہنا چاہئے۔ وہ اندھا یا بہرا جیسی کچھ صورت ہو ضرور رہے۔

میں ادھر عرض کرچکا ہوں کہ اندھے لڑکے کے قطعات دماغ باوجودیکہ بصارت مفقود ہے مہیج قبول کرسکتے ہیں۔ اور ان سے کام لیا جاسکتا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ اندھوں کی تعلیم بھی خاطر خواہ ہوسکتی ہے۔ (باقی دارد)

عبدالنور صدیقی

شذرات

جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ بانسواڑہ بتاریخ ۲۸ بہمن ۱۳۴۱ف روز جمعہ مدرسہ تحتانیہ بانسواڑہ میں زیر صدارت جناب مولوی مرزا ابراہیم علسگ بی اے بی ٹی ناظر تعلیمات ضلع نظام آباد ایک تعلیمی جلسہ ہوا جس میں مدرسہ تحتانیہ میں کورومدارس بوکلفنڈ ڈرکی ویشائی مٹھ لنٹہ بانسواڑہ کے مدرس صاحبین معہ اسٹاف وطلبہ کے شریک تھے۔ مسٹر بیو دتاتری راؤ مددگار مدرسہ ہذا نے ایک نمونہ کا سبق مضمون حساب مطحات چاردیواروں کا رقبہ ا پر دیا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

بعد ازاں فٹ بال ٹیم بانسواڑہ بیرکور کے درمیان جناب ڈاکٹر صاحب بانسواڑہ کے امپائری میں میاچ ہوا۔ اس مقابلہ میں دونوں ٹیمیں مساوی رہیں۔ اس لئے اس میاچ کے جیتنے والی پارٹی کے لئے منجانب مدرسہ بانسواڑہ جو پیتلی شیلڈ رکھی گئی تھی تقسیم نہ ہو سکی اور یہ میاچ آیندہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا جو بعد رمضان منعقد ہوگا۔

یہاں کے ہمدرد سیٹھ یارلہ سچا تلوسا ہونے آیندہ اس میاچ کو ٹورنمنٹ کی شکل دینے کی خواہش ظاہر فرمائی اور تحریری وعدہ فرمایا ہے کہ اس ٹورنمنٹ کے جیتنے والوں کو ایک چاندی کی شیلڈ دونگا۔

اس ٹورنمنٹ میں جملہ مدارس تعلقہ بودہن کو شرکت کا موقع دیا جائیگا اور یہ ٹورنمنٹ۔۔

فٹ بال ٹورنمنٹ بانسواڑہ

کے نام سے موسوم ہوگا

روئداد جلسہ سالگرہ مبارک جلسہ سالگرہ مبارک سلطان دکن زیر صدارت مسٹر وینکٹ راؤ صاحب مقدم پولیس بتاریخ ۱۱ ردی ۱۳۴۱ف بروز پنجشنبہ منعقد ہوا۔ بعد حمد وثنا جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی جملہ باشندگان وطلبہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ چمن چوڑ تعلقہ چنچولی ضلع گلبرگہ شریف شریک جلسہ تھے۔ مدرسہ وصحن مدرسہ کو رنگین کاغذ ونقشہ جات سے آراستہ کر کے جدید نصاب کے بموجب دستی مشاغل کے اشیاء و دیگر مصنوعی چیزوں سے مختصر نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس سے

سوداگر مسٹر سرینواس راؤ صاحب منشی بیہ ونارائن راؤ صاحب پٹواری کریم نگر سلطان دکن کی اوصاف و انتظام ملکی و بیدار مغزی پر پرتاثیر تقریریں کیں۔ بعدازاں چند طلبار انجمن مدرسہ نے اوصاف سلطانی بیان کرتے ہوئے۔ قرض کی خرابی پر تاثیر ڈرامہ تبلایا سینری اور طلبار کا کام دیکھنے کے قابل تھا۔ اور کمسن لڑکیوں نے "دیہات کی صفائی" پر مکالمہ کیا جس سے حاضرین جلسہ پر گہرا اثر پڑا۔ اس کے بعد صدر مدرس صاحب نے خسرو دکن کے اوصاف و آصفجاہی خاندان کے مختصر تاریخی حالات بیان کرتے ہوئے مولوی محمد ابراہیم صاحب عفو کی مرتبہ دعائیہ نظم پڑھی۔ تمام حاضرین جلسہ نے جوش مسرت میں آمین آمین کی صدائیں بلند کیں جس سے جلسہ میں ایک خاص پرلطف کیفیت پیدا ہوی۔ جناب صدرنشین صاحب نے رعایا پر ولی نعمت کے حقوق و اوصاف سلطانی پر تقریر کی اور اپنے دست مبارک سے طلبار مدرسہ کو انعامات تقسیم فرمائے۔ صدارتی تقریر کے ختم پر صدر مدرس صاحب مدرسۂ ہذا نے جناب صدرنشین صاحب معززین حاضرین جلسہ شکریہ ادا کیا۔ جلسہ ٹھیک ۹ بجے شب بعد دعا اعلیحضرت شہریار دکن و شہزادگان بلند اقبال کی ترقی عمر و اقبال جاہ و جلال برخاست ہوا۔ اور معزز مہمانوں کو چائے و پان سے تواضع کی گئی

جلسہ سالگرہ مبارک

تقریب سالگرہ مبارک مدرسہ وسطانیہ مچھلیگاؤں کا سالانہ جلسہ، مورخہ سنہ ۱۳۴۱ ف بروز پنجشنبہ بمقام آفیسرس کلب منعقد ہوا۔ کلب رنگا رنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ صبح میں لڑکوں نے پرچم آصفی کو سلامی دی۔ دن میں مختلف اسپورٹس ہوے جن کا سلسلہ پانچ بجے تک جاری رہا۔ پانچ بجے بصدارت جناب عبدالمجید خانصاحب جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی ابتدا بھجن سے ہوی۔ سب سے پہلے تین لڑکوں نے انگریزی مکالمہ کی شکل میں جلسہ کا مکمل پروگرام پیش کیا۔ پھر چھوٹے بچوں نے نہایت دلکش لہجہ میں نظمیں پڑھیں۔ اور کئی مکالمے کئے جن میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ورزش جسمانی کے متعلق تھا۔ اور دوسرا سالگرہ مبارک کے متعلق۔ جس کو دوم و سوم کے سات لڑکوں نے کیا۔ اس وقت بارش شروع ہوجانے کی وجہ سے نظام العمل دوسرے دن کے لئے ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے روز صبح میں نو بجے پھر جلسہ منعقد ہوا آج دو نہایت موثر ڈرامے کئے گئے ایک ار دو ڈرامہ سودخواری کے متعلق تھا۔ اس کو عدالتی کارروائی کی صورت میں لڑکوں نے پیش کیا۔ مدعی و مدعی علیہ، ان کے وکلار اور حاکم عدالت کا سین قابل دید تھا۔ دوسرا مرہٹی ڈراما شراب خواری کی مذمت میں تھا۔ اس کی ایکٹنگ نے پبلک کو متحیر کردیا۔ شراب خواری کی کثرت کی وجہ سے ایک شخص کا بیمار رہنا۔ مریض کے مرض کی تشخیص۔

ڈاکٹر اور وید کی بحث شاستری اور راو روید کی گل فشانیاں نہایت پر اثر منظر تھا۔ اس کے بعد مولوی
سراج الدین صاحب اور مسٹر کھنڈے راؤ صاحب مدرسین نے سالگرہ مبارک اور عہد ہمایونی کے
متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آخر میں جناب صدر صاحب مدرسہ نے صدر جلسہ و حاضرین کا
شکریہ ادا کرتے ہوئے بیان کیا کہ آج دُہری خوشی کا دن ہے یعنی شاہ ذیجاہ کی سالگرہ اور شہزادگان
اعظم جاہ و معظم جاہ کی شادیاں۔ جلسہ گیارہ بجے برخاست ہوا۔

اس کے بعد فٹ بال میچ ہوا۔ بارہ بجے دوسرے کھیل بوجہ نماز جمعہ ملتوی کئے گئے۔
تین بجے سے پھر دوسرا فٹ بال میچ ہوا۔ چار بجے ایک دلچسپ فٹ بال کا کھیل ہوا جس میں ایک طرف
طلبار اور دوسری طرف مدرسین اور دیگر حضرات تھے۔ انہیں دونوں پارٹیوں میں رسہ کشی بھی ہوئی

ایک نمائش بھی ترتیب دی گئی تھی جس میں مدرسہ کے طلبار کی تیار کردہ چیزیں تھیں نیز
مدرسہ نسوان کے کروشیا و ڈرائنگ کے کام بھی تھے۔ پانچ بجے نمائش کو حاضرین نے ملاحظہ فرمایا اور
بہت خوش ہوئے۔ ساڑھے پانچ بجے مدرسہ کا سالانہ جلسہ بصدارت جناب رشید الدین صاحب
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف منعقد ہوا۔ سب سے پہلے جناب انوار حسین صاحب بی۔ اے۔ صدر
مدرس مدرسہ نے مدرسہ کی رپورٹ پڑھی جس میں تعداد طلبار کی کمی پر اظہار افسوس کیا۔ اور اس کے
اسباب بتلا کر پبلک سے ان کو دور کرنے کی اپیل کی۔ اس کے بعد ایک طالب علم امجد علی خاں۔
(ششم) نے "میرا مقصد زندگی" پر پر اثر تقریر کی۔ مسٹر دگڑو راؤ مدرس مدرسہ نے "مقصد تعلیم" پر
اور مولوی محمد رضا صاحب مدرس مدرسہ نے "مدرسہ اور طلبار کے سرپرست" پر مضامین پڑھے
جناب ماسٹر کلکرنی صاحب نے "طلبار کی صحت" پر تقریر فرمائی۔ جناب صدر جلسہ نے طلبار کو انعامات
تقسیم فرمائے۔ آخر میں آپ نے دلچسپ تقریر فرمائی۔ خاتمہ پر جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ نے
صدر جلسہ و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے روز مدرسہ میں بچوں کو شیرینی تقسیم کی گئی۔ اور مدارس نسوان میں نمائش کی چیزوں
کے انعامات کے ساتھ تقسیم چائے بھجوائی گئی۔ اس طرح پر یہ پُرمسرت تقریب ختم ہوئی۔

مدرسہ لنگسگور میں بوائے اسکوٹ کا پہلا جلسہ

بتاریخ ۲۴ ر آذر ۱۳۴۱ف جمعہ کے دن چار بجے شام کو جناب کپتان
لیو نارڈ مین او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ اے۔ اسپیشل آفیسر محکمہ کندیگی باؤلیات
و معدنیات کی صدارت میں تحریک بوائے اسکوٹ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا
جمیع اولیائے طلبار معززین او راجگان گجل گنٹہ۔ آدبال و آنا مولاؤ

و مقامی عہدہ داران عدالت و محکمہ کندیدگی باولیات و محکمہ محققین طبقات الارض موجود تھے اکثر وبیشتر وکلاء صاحبین نے بھی جلسہ کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا تھا۔

مدرسہ کی سرکاری عمارت جھنڈیوں سے آراستہ وپیراستہ کی گئی تھی نشست کا انتظام معقول تھا۔ مدرسہ ہذا کے لکچر حال میں صدر صاحب کا اجلاس قائم کیا گیا تھا۔ دیواروں پر نقشہ آویزاں تھے اور انگریزی میں خوش نما حروف میں سلامتی شاہ دکن کے دعائیہ جملے چسپاں کئے گئے تھے۔ جلسہ کا آغاز "خضر کی عمر ہو تجھ کو عطا بخت سکندر ہو" کی دعائیہ نظم کے ساتھ عمل میں آیا۔ محترم صدر وجمیع حاضرین انتہاے خاموشی کے ساتھ ایستادہ تھے ختم دعا پر تمام اصحاب اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔

صدر نشین صاحب کے کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد صدر مدرس صاحب مختصر تقریر کے ساتھ جناب صدر کی خدمت میں پھولوں کا ہار پیش کیا۔ کیاپٹن لیونا ڈومن صاحب نے اظہار مسرت کے ساتھ قبول فرمایا۔ جناب صدر صاحب نے اسکوٹ ایسوسی ایشن کے نسبت تمہیدی ارشادات کے بعد فرمایا کہ مدرسہ ہذا کے ہیڈ ماسٹر صاحب تحریک مذکور کو آپ کے سامنے اردو میں پیش کریں گے چنانچہ صاحب موصوف کے ارشاد کے مطابق جناب مولوی محمد جیلانی صاحب بی۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر مدرسہ وسطانیہ لنگگور نے اسکوٹس اور اسکوٹنگ کے عنوان پر جامع اور مانع تقریر کے ذریعہ حاضرین کو بتایا کہ اسکوٹینگ کی غایت انسان میں اعلیٰ ترین اخلاق حسنہ کو راسخ کرنا ہے۔ اسکوٹینگ ایک ایسا کھیل ہے جس میں بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کو مصروف رکھ کر اس میں اوصاف حسنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ طلبار کی اخلاقی جسمانی و دماغی نشو ونما کی ضمانت اسکوٹینگ کی تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔ اقبال کا یہ پیام کہ۔

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا محبت کی زباں ہوجا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

اسکوٹس اور اسکوٹینگ کی تعلیم کا دائرہ عمل ہے۔

اسکوٹ ملک ومالک کا بہی خواہ اور سچا وفادار ہوتا ہے۔ بزرگوں کی تعظیم اور پٹرول لیڈر کی عظمت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ فرمانبرداری اس کا عین فرض ہے ایثار و ہمدردی

اس کی طبیعت کے جزو لاینفک ہیں۔ بنی نوع انسان اور ہر جاندار کے ساتھ اس کا رحم و کرم وابستہ ہے۔ بے نیازی کے ساتھ خادم الناس کہلانے کا مستحق ہوتا ہے استعانت اس کا وظیفۂ حیات ہے اسکوٹس ہمیشہ تیار باش کے اصول پر اخلاقی جسمانی و دماغی لحاظ سے خدمت کے لئے خود کو تیار و مستعد رکھتا ہے ذاتی وقار و خودداری کا حامل ہوتا ہے۔

خوش مزاجی و زندہ دلی کو وہ زندگی کے لئے ضروری سمجھتا ہے ہمیشہ مصیبتوں اور گوناگون آفتوں کا مقابلہ انتہای بشاشت خوش مزاجی و زندہ دلی سے کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال کے اسکوٹ یہ سمجھتا ہے کہ زندہ دل وہی ہستیاں ہوتی ہیں۔ جو جفا طلبی سے کبھی نہیں بہاگتی ہیں۔

به کیش زنده دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر به کعبه نکردم که راه بے خطر است

اخوت و موانست کے جذبات کی پیدائش اسکوٹنگ کی تعلیم پر مبنی ہے غرض طلبہ میں اس مبارک تحریک کے ذریعہ قوت برداشت پیدا کی جاتی ہے کہ اس عرصۂ جد و جہد میں اس کارزار حیات میں گامزن ہوکر مختلف صعوبتوں و تکالیف پر غلبہ حاصل کرکے اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں مذہبی عقائد و قدیم رسوم کی پابندی سے اسکوٹ کبھی گریز نہیں کرتا۔ اس مبارک و مسعود تحریک کے ذریعہ عالمگیر برادری قائم ہوسکتی ہے۔ اور اتحاد و اتفاق کی بنیاد مستحکم طور سے رکھی جاسکتی ہے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوے صاحب موصوف نے دیہاتی اسکوٹس کے فرائض کو تبلایا کہ وہ اپنے قریہ کی صفائی اور گلیوں کی جاروب کشی ؟ میں حصہ لیتے ہیں۔ اپنے پڑوسی کسان کے خار وار کشگر کو جس میں جانور رکھے جاتے ہیں۔ نکال کر دیوار اٹھاتے ہیں بوقت ہیضہ و طاعون صفائی و ٹیکا اندازی کے انتظامات اور بیماروں کو فوری طبی امداد پہونچانے میں مستعد رہتے ہیں۔

اپنے قریہ کے مدرسہ کو آباد کرتے اور اپنی بہن و چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں کافی حصہ لیتے ہیں دیہات کے ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو اخبار وغیرہ پڑھ کر سناتے ہیں غرض دیہاتی اسکوٹس کی اس قسم کی مصروفیت ان کے والدین۔ اعزا اور اہل دہ کی اخلاقی حالت میں ایسا تحیر خیز انقلاب پیدا کرتی ہے کہ وہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے میں تیار ہوجاتے ہیں اور ملک و مالک کی خدمت میں ہمہ تن منہمک ہوتے ہیں۔ اس مختصر تقریر کے بعد آپ نے حاضرین و اولیاے طلبار کو مخاطب کرتے ہوے فرمایا کہ سر بیڈن پاول کی اس مبارک تحریک کو

چاردانگ عالم میں ہردلعزیزی حاصل ہے اور ہر ملک نے انتہائے مسرت کے ساتھ اپنی تعلیمی دائرہ میں اس کو رواج دیا ہے اس لئے باشندگان لنگسگور بھی اسکوٹنگ کی صدا پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہونگے ختم تقریر سے پہلے امداد و اعانت کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہوئے جناب ہیڈ ماسٹر صاحب نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ ضروریات اسکوٹس کی فراہمی میں دلی ہمدردی سے حصہ لیں ہیڈ ماسٹر صاحب کی تقریر ختم ہونے کے بعد وکلا صاحبین نے بھی اپنی تقریر سے بوائے اسکوٹ ایسوسی ایشن کی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ بعد از اں جناب عبدالمجید صاحب بی۔اے بی جی انجینرز راعت کی تحریک سے ٹروپ کمیٹی کی تنظیم عمل میں آئی۔ عالیجناب کیاپٹن لیونارڈمن صاحب اس کے سرپرست قرار دئے گئے۔ اور جناب مسٹر الیاس قریشی منصف عدالت لنگسگور صدر تجویز کئے گئے جناب سید کلیم اللہ صاحب قادری ایم۔ایس۔سی۔ایچ۔سی۔یس دوم تعلقدار ڈویژن لنگسگور جناب راجہ صاحب اُدیال جناب جاگیردار صاحبان گنجل گٹہ آنا ہور نائب صدر قرار دئے گئے۔

اراکین ٹروپ

۱۔ مولوی محمد جیلانی صاحب۔ بی۔اے ہیڈ ماسٹر وسطانیہ لنگسگور
۲۔ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب پیشکار تحصیل لنگسگور۔
۳۔ پنڈت وینکٹ راؤ صاحب وکیل لنگسگور۔
۴۔ پنڈت سوامی راؤ صاحب دیسپانڈے کرڈکل۔
۵۔ مولوی سید امیر احمد صاحب وکیل۔
۶۔ مولوی امین خانصاحب وکیل۔
۷۔ ڈاکٹر متھا۔
۸۔ پنڈت کے وینکٹ راؤ صاحب وکیل چھاونی۔

نامزد شدہ اراکین کا اعلان کئے جانے کے بعد جناب کیاپٹن لیونارڈمن صاحب نے پچاس روپیہ کا گرانقدر عطیہ اسکوٹس کی تیاری لباس کے لئے عطا فرمایا۔ جس کا جناب ہیڈ ماسٹر صاحب نے ادائے شکریہ کے بعد حاضرین میں اعلان کیا۔ گنجل گٹہ کے راجہ صاحب نے بھی پچاس روپیہ کا وعدہ فرمایا اور جناب مولوی سید الیاس قریشی صاحب منصف عدالت لنگسگور نے (عـــہ) کا عطیہ معاونت میں پیش کیا۔ اور مسٹر مہادیوی تند نے دس روپیہ عطا کئے ان کا رروائیوں

ختم پر صدر صاحب کی تحریک پر ہیڈ ماسٹر صاحب نے ٹروپ کمیٹی کے اراکین کے فرائض کو انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا۔ صدر صاحب کی اختتامی تقریر کے بعد طلبا نے ترانہ سکوٹس کو خاص پر کیف طرز میں پڑھا ختم پر جناب محمد جیلانی صاحب بی۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر مدرسہ ہذا نے جمیع حاضرین وعہدہ داران مقامی و جناب کپتان لیونارڈ من صاحب کا شکریہ انگریزی و اردو میں مختصر الفاظ میں فرماتے ہوئے اس مصرعہ پر ختم کیا۔ ع

شکر خدمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

ان کارروائیوں کے بعد جلسہ برخواست ہوا۔ کپتان لیونارڈ من صاحب کی روانگی کے وقت مسٹر ونکٹ راؤ ہیجب اسکوٹ ماسٹر نے اسکوٹس کی سلامی کے بعد انگریزی میں نعرۂ مسرت بلند کیا۔

قیام اسکاؤٹنگ ٹروپ بمدرسہ وسطانیہ کوڑنگل

بتاریخ ۹ بہمن ۱۳۴۱ف بوقت سہ پہر مدرسہ وسطانیہ گوڑنگل میں جلسہ قیام اسکاؤٹنگ ٹروپ منعقد ہوا جناب مولوی خورشید علی خان صاحب دوم تعلقدار گلبرگہ نے جو سلسلہ دورہ تشریف فرما تھے جلسہ کی صدارت فرمائی حاضرین میں حکام مقامی جاگیرداران وکلا و شرفا اور رعایائے بستی نے کامل دلچسپی سے شرکت فرما کر جلسہ کی کامیابی اور رونق میں اضافہ فرمایا۔ جناب مولوی سید کرامت علی صاحب بی۔ ایم۔ اے (علیگ) صدر مدرسہ کی تحریک اور مولوی سید محمد صاحب ندوی معتمد انجمن اساتذہ کی تائید سے جناب مولوی خورشید علی خان صاحب دوم تعلقدار نے شکریہ کے ساتھ کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ تلاوت قرآنی اور عثمانی جھنڈے کے آگے قومی اور کشافی ترانوں کے بعد مولوی سخاوت مرزا صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ اسکاوٹ ٹرینڈ مددگار مدرسہ نے ایک بسیط عالمانہ پر مغز تقریر سے اس عالمگیر انسان ساز تحریک کی تاریخ افادا اور اہمیت کو حاضرین پر واضح فرمایا۔

اور مولوی سید محمد سعید صاحب معتمد اور جناب مولوی سید کرامت علی صاحب صدر کے تقریروں کے بعد محترم صدر جلسہ نے فاضلانہ وسیع النظری اور جامعیت کے ساتھ اس تحریک کے مالہٗ وما علیہ پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ عالمگیر اخوت ومساوات انسانی اور مذہب اعلیٰ بنوع انسانی کو پہونچانے کی یہ تحریک واحد ذمہ دار ہے موجودہ دور کی یہی وہ مبارک تحریک ہے۔ جس نے امتیاز عصبیت اور تفریق مذہبی کو مٹا کر ہر صنف انسانی کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا ہے

یہ کوتاہ نظری ہوگی اگر اس کو مذہبی تحریک سمجھا جائے

فیوض و برکات عہد عثمانی کے اظہار کے بعد شاہ جمجاہ اور شاہزادگان ہمایوں خصال اور شہزادیان خجستہ خصال کی دعاء عمر و اقبال پر جناب صدر جلسہ نے تقریر ختم فرمائی اور جناب صدر مدرسہ نے شکریہ ادا فرمایا۔ الائچی پان سے تواضع کے بعد بازیگاہ مدرسہ پر شام تک حاضرین نے کھیل کا معائنہ فرما کر طلبا کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جناب نواب صاحب معز نے غیر مستطیع طلبہ کی امداد کے لئے [illegible] روپیہ مرحمت فرمائے۔

جلسہ مبارکباد بمدرسہ وسطانیہ تعلقہ چنچولی ضلع گلبرگہ شریف

بتاریخ یکم رجب المرجب ۱۳۵۰ھ بروز پنجشنبہ ٹھیک بوقت ۹ ساعت صبح جلسہ کی کارروائی شروع ہوی مدرسہ کے بالمقابل بازیگاہ کے میدان میں مقامی عہدہ داران وکلاء و معززین و طلبہ جمع تھے بازیگاہ کے میدان سے ملحقہ سڑک پر ایک سرخ کپڑے کی کمان بنی ہوی تھی جس پر انگریزی زبان میں نمایاں طور سے لکھا گیا تھا "(خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے) میدان میں داخل ہونے کے لئے وسط میں نہایت خوبصورت و شاندار سفید کاغذ کی کمان بنائی گئی تھی جس پر (ہماری سلطنت پھلے پھولے)" "خدا ہمارے بادشاہ جمجاہ کو خوش رکھے" اور دعائیہ جملے انگریزی میں لکھے گئے تھے سارا میدان رنگا رنگ کی بیرقوں سے بوقلموں بنایا گیا تھا۔ میدان کے جنوب میں دو بڑے شامیانے ایستادہ کئے گئے تھے آخری حصہ پر ڈراموں کے لئے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ عین بیچ میں پرچم آصفی لہلہا رہا تھا جمعیت پولیس اور اسکاوٹ مدرسہ دعروب نے سلامی دی بندوقین سرکیں پھر طلبہ نے پرچم آصفی پر پھول نچھاور کئے طلبۂ اسکاوٹ نے دعا پڑھی سلطان العلوم تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ اور شاہزادگان بلند اقبال کے لئے چیرز دیئے شیرنی تقسیم کی گئی ٹھیک گیارہ بجے جلسہ برخواست ہوا

جلسہ ثانی کی کارروائی ٹھیک چار بجے شام سے شروع ہوی صدر مدرس صاحب مدرسۂ ہذا نے ایک مختصر اور جامع تقریر میں حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے عہد میمنت مہد کے فیوض اور برکات بیان کئے اور فرمایا آج کا دن دو حیثیت سے مبارک دن ہے ایک تو یہ کہ جلالت مآب شاہ دکن کی پیدائش کا یوم مسعود اور ہمارے بادشاہ ذیجاہ کے عزیز شاہزادگان حضرت اعظم جاہ بہادر ولی عہد و حضرت معظم جاہ بہادر کے عقد کا پھر آپ نے تحریک پیش کی کہ جناب مولوی سید محمد نیاز علی صاحب تحصیلدار کی صدارت سے آج سالگرہ مبارک کی تقریب منائی جائے۔ اور کل شہزادگان بلند اقبال کے عقد مسعود کی خوشی منائی جائے۔

مولوی میر جعفر علی صاحب مددگار مدرسہ ہٰذا نے اس تحریک کی تائید کی۔

ٹھیک پانچ بجے طلبہ مدرسۂ ہٰذا اور دیگر مدارس کے طلبا کے مدارس کے اسپورٹس ختم ہوتے ہی نماز مغرب کے لئے وقفہ دیا گیا۔ اور بعد کا اسپورٹس کے کامیاب طلبا کو انعامات تقسیم کئے گئے۔ ز ان بعد طلبا ، مدرسہ نے ایک اردو ڈراما (جہالت کا انجام) جو نہایت ہی نتیجہ خیز تھا کیا اور اختتام ڈرامہ پر باران رحمت کا نزول ہوا اور جلسہ کی کارروائی ختم ہوی۔

دوسرے روز شام کے ساڑھے پانچ بجے جلسہ کا آغاز ہوا طلبہ مدرسہ نے زندہ بادشاہ دکن کی نظم پڑھی اس کے بعد کنڑی میں دو طلبہ مدرسہ نے ہارمونیم پر نہایت خوش الحانی سے دعائیہ نظم گائی مدرسہ ہٰذا کے دو طالب علموں نے کنڑی اور مرہٹی میں نتیجہ خیز ڈرامہ کئے اور انگریزی میں دو طلبا نے مکالمہ کیا بعد ازاں صدر مدرس صاحب نے ڈراموں کے نتیجہ پر نہایت موثر و موقتی تقریر فرمائی۔

معزز صدر نشین نے اپنی تقریر میں سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کے اوصاف حمیدہ اور زریں کارنامے تفصیل سے بیان فرمائے۔ صدر محترم نے حضور اقدس و اعلیٰ کی درازی عمر و اقبال و شاہزادگان بلند اقبال کی عمر و والیی ملک برار کے لئے دعا فرمائی تمام حاضرین نے سرو قد آمین کہی جس سے فضا آسمان میں گونج پیدا ہوی۔

روئیداد جشن چہل سالہ جوبلی فوقانیہ عثمانیہ نلگنڈہ ۱۳۴۸ف

مدرسہ فوقانیہ نلگنڈہ کی چہل سالہ جوبلی کا جشن مدرسہ کی تاریخ میں ایک اہم بالشان یادگار رہے گا کیونکہ وہ بہت تزک و احتشام اور کامیابی کے ساتھ بتاریخ ۱۴ اربہمن ۱۳۴۱ف منایا گیا۔ اس موقع کے لئے عمارت مدرسہ میدان بازی گاہ کی آرائش و زیبایش کے علاوہ خاص طور پر نمایش ٹورنمنٹ اور ڈرامہ کے بھی انتظامات کئے گئے تھے۔ نمایش کے لئے عمارت مدرسہ کا درمیانی وسیع ھال مختص کیا گیا تھا جس میں ڈرائنگ ، سوزن کاری ، دستکاری ، نجاری آلات تعلیم اور کنڈر گارٹن کے بہترین نمونے قرینے سے میزوں پر سجائے گئے تھے ڈرائنگ میں سب سے بہتر کام فوقانیہ نلگنڈہ کے طلبا کا تھا جو مولوی محبوب علی خانصاحب سینیر ڈرائنگ ماسٹر کی شبانہ روز ممنون کا نتیجہ تھا۔ دستکاری میں عمارت مدرسہ کا نمونہ جس کو یٰسین خان طالب علم جماعت پنجم نے اپنے قابل استاد مولوی احمد مرزا صاحب جونیر ڈرائنگ ماسٹر کی نگرانی میں متوسے سے تیار کیا تھا قابل ستایش تھا طلبا ، انجمن اصلاح المسلمین کی سینگ کی بنی ہوی قلمیں انجمن اسلامیہ کلپاک جاگیر بہادر الملک

کی نجاری کا سامان، مولوی احمد شریف صاحب صدر پرائمری اسکول نلگنڈہ کے کنڈرگارٹن کے نمونے بھی بہت عمدہ تھے۔

فٹ بال ٹورنمنٹ کے میاچس ۶ بہمن سے ۱۱ بہمن تک ہوتے رہے جس میں صوبہ میدک کی سینیر وجونیر او مقامی خانگی ٹیمیں بھی شریک تھیں۔ ۱۲ بہمن کو فائنل مقابلہ ہوا مسرت وحیرت کی بات ہے کہ سینیر وجونیر دونوں ٹیموں میں مدرسہ نلگنڈہ ہی کی ٹیمیں کامیاب رہیں۔

جمعہ کے دن نماز کے بعد ہی سے میدان بازیگاہ میں بہت چہل پہل نظر آ رہی تھی سیکڑوں اشخاص جوق جوق چلے آ رہے تھے حتی کہ سارا میدان بازیگاہ جن میں نشستوں کا معقول انتظام تھا عہدہ داران مقامی معززین بستی اور پبلک سے کھچا کھچ بھر گیا۔ ٹھیک تین بجے جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات صوبہ میدک نے تمام عہدہ داران و وکلائے مقامی کیساتھ جس میں عالیجناب اول تعلقدار صاحب ضلع بھی شریک تھے نمایش گاہ کا افتتاح فرمایا بعدازاں اس کے مختلف اسپورٹس شروع ہوے۔ اور نماز عصر کے لئے وقفہ ہوگیا۔

نماز کے بعد جشن کا پھر پروگرام شروع ہوا۔ عالیجناب مولوی محمد فیض الدین صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا نے کرسی صدارت کو رونق بخشی بوائے اسکوٹس نے اپنے کرتب دکھلائے۔ پھر نماز مغرب کے بعد مدرسہ کے کمسن بچوں نے حمد۔ نعت اور بھجن گائے۔ صدر مدرسہ نے اپنی مبسوط و پر مغز رپورٹ سنائی جس میں مدرسہ کی ہر قسم کی تدریجی ترقی اور اپنے قابل مددگاروں کی کارگزاری پر روشنی ڈالی گئی تھی ختم رپورٹ پر صدر نشین جلسہ نے بہت ہی مدلل و پرجوش تقریر فرمائی اور پبلک کو متوجہ کرتے ہوے فرمایا کہ یہ مدرسہ میرے صوبہ کا ماڈل اسکول ہے یہاں کے صدر اور اساتذہ بہت قابل اور ان کی کارگزاری لائق مبارکباد ہے تقریر صدارت کے بعد طلبا میں بہت دیر تک اسناد۔ انعامات اور تمغہ جات کی تقسیم ہوتی رہی اور پھر تھیٹر کے اسٹیج پر جس کو مولوی غلام جیلانی احمد صاحب ایم اے مدرس انگریزی اور محمد مومن علی صاحب مدرس اردو و انگریزی نے اپنے شاگردوں کیساتھ بڑی محنت وسعی کے ساتھ تیار کیا تھا۔ چار کمسن بچوں نے خوش اخلاقی سے متعلق انگریزی میں مکالمہ کیا پھر مولوی مرزا مہدی علی بیگ صاحب مددگار اور مولوی محمد مولنا صاحب مددگار اور مولوی غلام حسین صاحب فوقی نے اپنی اردو اور فارسی نظمیں پڑھیں جس کی سامعین نے بہت بہت داد دی۔

اس کے بعد اولاً شیکسپیر کا ڈرامہ مرچنٹ آف وینس شروع ہوا جس کو میٹرک کے طلبہ نے نہایت صفائی دکامیابی کے ساتھ ختم کیا اور پھر پانچ کمسن وخوش گلو طلبا نے ساز کا ساتھ دیتے ہوے ترانہ حمد گایا۔ اس کے بعد اردو ڈرامہ "وطن پرست وملک فروش" شروع ہوا اس میں بھی

ایکٹر مدرسہ ہی کے طلبہ تھے اردو انگریزی دونوں ڈراموں کے ایکٹر اپنے موزوں لباس میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ ایکٹ کر رہے تھے کہ پبلک بار بار چیرز دیتی رہی۔ ڈرامہ کے ختم پر محمد مومن علی صاحب نے تھیٹر کی جانب سے تمام حاضرین جلسہ کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوگیا عہدہ داران صاحبان اور معززین بستی اور پبلک ڈرامہ ہی کی توصیف کے تذکرے کرتے ہوئے رخصت ہونے لگی بہرکیف رات کے دس بجے تک تمام میدان بازیگاہ جو ایک کثیر اجتماع سے بھرا ہوا تھا خالی ہوگیا لیکن صدر مدرسہ و مدرسین اپنے خاص یونیفارم میں اور رضاکار طلبا اپنے سینوں پر سنہرے چمکتے ہوئے بیاجیز لگائے پھر بھی مصروف بکار نظر آتے رہے۔ جو صدر مدرسہ و اساتذہ اور استادوں شاگردوں کے پرخلوص اتحاد و محنت کا قابل دید نظارہ تھا۔

مولوی سید ظہور علی صاحب مرحوم

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ بتاریخ ۲۷ دی ۱۳۴۱ف روز مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔اے، بی۔ٹی۔ پرنسپال مدرسہ دارالعلوم بلدہ نے مختصر علالت کے بعد اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم نہایت لائق و متبحر فاضل تھے اور انگریزی زبان میں کامل دستگاہ رکھتے تھے مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی کے نہایت مشہور صدر مدرس تھے اور عرصہ دراز تک صوبہ اورنگ آبادی کی صدر مہتممی تعلیمات کے فرائض انجام دیتے رہے۔ راست بازی اور صداقت شعاری میں فقید المثال تھے مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کی عدم موجودگی بوجہ سفر انگلستان کے زمانہ میں آپ نے صدر مہتممی تعلیمات بلدہ کی منصرمانہ خدمت نہایت محنت اور ہردلعزیزی کے ساتھ انجام دی۔ بڑے خوش مزاج اور خوش خلق تھے۔ ان کے اجلاس سے روتا ہوا آدمی ہنستا ہوا باہر آتا۔ اور ناامیدوں کے دلوں میں نئی امنگ پیدا ہوجاتی۔ اصول کے بڑے پابند تھے ساتھ ہی رحم دل اور ہمدرد تھے ان کے ماتحت اور طلبا کے دلوں میں جو محبت اور جگہ مرحوم کے لئے تھی اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ حق یہ ہے مرحوم نمونہ کے مدرس اور نمونہ کے صدر مدرس تھے۔ آپ نے رسالہ ٹیچر کی ادارت بھی کچھ روز تک خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی انجمن اساتذہ کے پرجوش حامی اور نائب صدر تھے۔ مرحوم کی وفات نے سررشتہ تعلیمات کو ایک پرانے تجربہ کار اور لائق صدر مدرس کی خدمات سے محروم کردیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تنقید و تبصرہ

نو پیشہ مدرس ریاست حیدرآباد میں ابھی تک تمام مدرسین تعلیم المعلمین سے بہرہ اندوز نہیں ہیں اور ان کو مدرسہ میں ضبط قائم رکھنے اور اسباق کو ہر دل عزیز بنانے میں مصائب سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اکثر ان کے اسباق رائیگاں جاتے ہیں۔ اس مبحث پر ضخیم کتابیں ہیں۔ جن کا خرید کر پڑھنا دشواری سے خالی نہیں۔ بہر طرہ یہ ہے کہ مصطلحات علمیہ کی بھرمار رہے جو کم علم مدرسین کو پریشان کردیتی ہیں چارنا چار اپنے ارادہ کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اس دشواری کو محسوس کرکے مولوی عبدالنور صاحب صدیقی و مولوی عبدالشکور صاحب نے امریکہ کے ماہر فن جے ایس۔ ڈیویا صاحب کی چھوٹی سی کتاب وی ینگ ٹیچرس پرائمر کا ترجمہ فرمایا ہے۔ ترجمہ سیدھا سادہا اور اصل کتاب سے بھی زیادہ سلیس ہے۔ قابل مترجمین نے کوشش فرمائی ہے کہ حتی الامکان مصطلحات علمیہ سے پرہیز کیا جائے۔ تاکہ اس کے مطالعہ سے ہر کس وناکس فائدہ اٹھا سکے۔ مدرسین کو زیادہ تر دشواری قیام ضبط و ترتیب سوالات و استعمال تختۂ سیاہ و تیاری اسباق و توضیح اسباق میں پڑتی ہے۔ مصنف ان دشواریوں سے واقف ہے۔ وہ خود عرصہ تک مدرس کے فرائض انجام دے چکا ہے اس کو طرح طرح کے طلبہ سے سابقہ پڑا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کس طرح ایک جماعت کے مختلف المزاج متعلمین پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے تجربات کے لب لباب سے اس مختصر مگر جامع کتاب کو زینت بخشی ہے اور صرف ضروری امور کی توضیح کی ہے۔ معمولی وسطحی امور کے جانب متوجہ نہیں ہوا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے مطالعہ سے جملہ نو پیشہ مدرسین کما حقہٗ متمتع ہوسکتے ہیں۔ پرانے مدرس بھی اپنے کتابی علم و تجربہ کا تقابل کرکے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

عمدہ چکنے کاغذ پر طبع کی گئی ہے تختی $\frac{20 \times 30}{8}$ ہے

مکتبہ ابراہیمیہ یا سید عبدالقادر تاجر کتب حیدرآباد سے طلب کی جاسکتی ہے قیمت سکۂ عثمانیہ ۸ / ر

(وحید)

basis were ably pointed out by Mr. N. S. Subba Rao, M. A. (Cantab.), Director of Public Instruction, Mysore, in the Presidential Address which he delivered at the Seventh Annual Conference of the All-India Federation of the Teachers' Association, held at Bangalore last December. As Mr. Subba Rao is not merely an educationist but an eminent economist, he can claim to speak with authority on the question of vocational and technical education. He says:—

"In Western countries where economic conditions are more developed and the range of occupations is far larger than in India, the problem is one of adjusting the output of schools and colleges to the requirements of industry and commerce. In India the task is a heavier one. The economic life of the country has to be properly surveyed and its own development planned and regulated before the educational system can be adapted to its requirements. As things are, it will be wasteful to scatter technical institutions all over the country without relating them to the actual requirements of industry and commerce. The task calls for co-operation between leaders of industry, students of economics and educationists."



and resulted in the re-appearance of his old complaint—diabetes—to which he succumbed after a brief illness. So great was his love for his school—the Darululoom High School—that he continued to attend to his duties as Principal of that institution even during his illness and did not avail himself of leave until he was removed to hospital. He was 52 years of age at the time of his death and had put in nearly 25 years of service. He leaves behind him a widow and six daughters, to whom we extend our heartfelt sympathy in their bereavement.

Vocational Education in India.

THERE is perhaps no aspect of Indian education which is now-a-days discussed more than vocational education. The importance which this question has assumed in recent years is largely due to the increasing volume of unemployment among the educated classes in the country. It is generally felt that hitherto we have devoted far too much attention to literary education and for too little attention to vocational education. But it is a mistake to imagine that the problem of unemployment can be solved by merely increasing the number of vocational and technical institutions. In this connection, it is instructive to study the principles on which the Central, Industrial and Commercial Schools of England and the Continuation, Trade and Commercial Schools of Germany are organised. The economic conditions in both those countries are well developed, and the system of vocational and technical education is carefully adjusted to those conditions. Secondly there is an efficient system of apprenticeship in England as well as in Germany. Thirdly, in both the countries even full-time vocational and technical schools maintain close touch with employers, so that the boys and girls who leave these schools do not generally experience any difficulty in finding work.

The difficulties that lie in the way of organising vocational and technical education in India on a sound

Editorial Notes.

THE LATE MR. SYED ZAHOOR ALI.

THE Hyderabad Teachers' Association and its organ *The Hyderabad Teacher* have suffered a heavy loss by the sad death of Mr. Syed Zahoor Ali, which occured on the 1st December, 1931. He was the Vice-President of the Association, and during the absence of Mr. Syed Ali Akbar last year, he discharged with conspicuous ability the duties of President as well as of the Chief Editor of *The Hyderabad Teacher*. The success of the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held last year and of the Educational Exhibition, which was organised along with the Conference, was due very largely to his efforts.

We have published elsewhere a brief sketch of the late Mr. Zahoor Ali's character and career from the pen of one who knew him intimately. This issue also contains the full text of the paper on "The Head-Master," which he read at the last conference of the Hyderabad Teachers' Association. This address, written in his own inimitable style, reflects the spirited and practical character of its author and contains many valuable suggestions based on his long experience as a head-master. The late Mr. Zahoor Ali's life was one of loyal and devoted service to the Education Department. His moral purity, plain living and plain speaking, kindness, sympathy and impartiality combined with a keen sense of duty and strong common sense, his love of reading and his versatility and, last but not least, his youthful spirit and sense of humour—all these qualities made him a successful and popular head-master and won for him the respect and affection of all those with whom he came into contact. The unusually hard work which he did last year in order to justify his selection as Acting Divisional Inspector of the Head-Quarters Division told on his health

Saheb?" asked one of the members of the Reception Committee. "Immensely," replied Mr. Zahoor Ali, "Sir, A Syed can easily become one with a Brahmin. If we teachers were to give practical proof of Hindu-Muslim Unity, the Indian problem could be easily solved." A profound thought, indeed!

Once as I was trudging along the road on my way to Darul-uloom High School, I saw him driving in his carriage to the school where he was the Principal. Unfortunately, his carriage met with an accident and he thought that he would be late at school. Down he jumped, and leaving the carriage to the care of his servant, began to walk so briskly that I found it hard to keep pace with him. Precisely at 5 minutes to 10 we arrived at the school. He remarked, "Thus should punctuality be maintained." As far as I knew, his punctuality was remarkable and his assiduity praise-worthy.

The life of a teacher tries character as by fire. It is tested by success but more so by failure. It cannot be said that Mr. Syed Zahoor Ali had no moments of bitterness and disappointment either private or public, but he faced them all bravely.

"Three years more, and I shall retire," said he to me one day. "How on earth can you find an outlet for your tremendous energy and buoyancy?" was my question. He replied, "I shall spend the evening of my life at some hill-station and complete my work on "Moghul Architecture." But alas! That was not to be! He has gone the way which all of us must go when our time comes. It can therefore be said that he is not dead but gone before. May it be our lot to leave behind us to our friends a happy memory as he has done!

May his soul rest in peace!

G. A. CHANDAVARKAR,

Head-Master, Residency Middle School.

latter days he had to contend with the diabetic trouble, which ultimately caused his death on the 1st December, 1931.

Early in life he developed a taste for journalism and contributed several articles to *The Hindustan Review* (Allahabad) and *The Indian Review* (Madras). To work with him in that line was a pleasure and in itself a lesson on journalism. Among his writings, prominent mention should be made of a short life-sketch of the late Right Hon'ble Mr. Ameer Ali which he contributed to *The Indian Review*. For a time he worked as one of the editors of the "Hyderabad Teacher" and wrote very readable notes. Spoken words, they say, are ephemeral, but I am sure that his speech on "An Ideal Head-Master," which he delivered at the last Hyderabad Teachers' Conference will be read with great interest by generations of teachers yet to come. Its style was free from any meritricious adornment, its argument was close-reasoned and logical and its humour lively and serene. In fact, the whole speech embodied his own experiences as a Head Master and was consequently of great practical value. His welcome address which he delivered as Chairman of the Reception Committee at our Teachers' Conference in 1930 was equally forceful and thought-provoking.

When I had the privilege of accompanying him as a delegate to the All-India Teachers' Conference at Madras in 1929, I found him dining with some Hindu delegates one day. It was a source of immense pleasure to me to observe him moving on terms of perfect sociability with the Hindu delegates throughout his stay in Madras. His accommodating spirit and lively conversations in Telugu, which he knew well, drew around him a large number of friends. "How do you like our Madras vegetarian diet and social environments, Moulvie

The Late Mr. Syed Zahoor Ali.

In the unexpected and sad demise of Mr. Syed Zahoor Ali, the Education Department has lost a conscientious officer and his friends and relations a sincere and an affectionate soul. Starting his career twenty-two years ago as a school master, he rose to the responsible position of Divisional Inspector of Schools by sheer dint of labour. He worked as the Headmaster of the Residency Middle School for over eight years, during which period that school attained a high degree of efficiency and popularity mainly owing to his personality, industry and organising capacity. He joined the Education Department as a Graduate in Arts of the Madras University and later took his B. T. degree from the Calcutta University. He was for several years Head Master of the High Schools at Warangal and Gulbarga. Twice he was appointed as the Principal of the Darululoom High School at Hyderabad, Deccan, and when last year Mr. Syed Ali Akbar was deputed to visit England on special duty, he acted as the Divisional Inspector of Schools, Headquarters, during which period he spared no pains to justify his selection for that responsible post. He was essentially a teacher, being naturally endowed with those qualities which are necessary for success in the teaching profession. He was sympathetic and just, but at the same time strict where strictness was necessary. "If stern he was, the love he bore to learning was in fault." During the 25 years of my uninterrupted friendship with him, he always struck me as a genuine friend and an unassuming officer. At times, he was a relentless critic of men and manners.

Besides possessing a robust constitution and a vigorous mind, he was regular in his habits, but in his

present on the opening day of the Conference. Though this number slightly increased on the subsequent two days, yet on no occasion did the number rise above 400. To me, the whole affair smacked of a purely local gathering rather than an All India one. This may have been due to two reasons. One, the absence of Sir C. V. Raman may have kept away a large number of people who would otherwise have availed themselves of the opportunity of hearing a man of international reputation, and the other, perhaps stronger than the first, was the imposition of a fee of Rs 3/- on every non-delegate. A purely professional gathering like this is bound to defeat its own ends if public sympathy and co-operation are not secured freely. It would have been in the fitness of things if the Conference had been thrown open to the public without any restriction whatever. Be that as it may, we met, we talked, and we dispersed to meet again in the next Christmas season.

In conclusion, I have to thank the Hyderabad Teachers' Association for the honour that they did me in sending me as their delegate to the 7th All India Educational Conference.

the same time urged that inspectors should be people sympathetic in their outlook and thoroughly conversant with their work. The fault of most of the inspectors, it was argued, lay in the fact, that they very often played the role of a carping critic, and it was precisely this fact that had made them a dread to teachers. Inspection, if it was to result in good, should always take the form of a heart to heart talk between teachers and inspectors.

On the second day of the Conference, the All-India Educational Exhibition was opened by Sir K. P. Puttanna Chetty at the National High School, Bangalore. In all 125 institutions were represented, out of which only 35 were from outside the Mysore State. Though the number of exhibits was not large enough to call the Exhibition an All-India Educational Exhibition, yet the quality was by no means poor. The subjects under which the exhibits were divided covered almost all the important aspects of education such as:

(1) The New Education (Blind and Kindergarten) (2) Dalton & Project Method, (3) Vocational Education, (4) Physical Education, Scouting & Hobbies, (5) General Education (History & Geography), (6) Child Education, (7) Fine Arts.

The concluding session of the Conference was devoted to resolutions. The first of these was a condolence resolution on the late Mr. Syed Zahoor Ali. The remaining resolutions, though many of them of a controversial nature, were summarily dealt with and passed, because the President was anxious to close the Conference in time. This over, a formal vote of thanks to the Chairman and delegates, three cheers to H. H. the Maharaja of Mysore, followed by tea and a group photograph, brought the Conference to a close.

Now for my general impression of the Conference. I had gone to Bangalore with the expectation that I should see a record gathering of educationists from all over India. But I was keenly disappointed when I saw barely 300 people

as to result in the greatest good to the greatest number. This, the President pointed out, could be achieved by giving our educational system a vocational and a rural bias and making the vernaculars media of instruction. At the same time, it was necessary that the importance of a knowledge of English should not be minimised. The scheme required plan, organisation, and, above all, finance. The purpose of the Conference, the President said in conclusion, was to evolve the first, and to suggest lines for the second, leaving it to the good sense of the administrators and the good will of the community to supply the last.

The President having concluded his illuminating address, the Conference divided itself into sectional meetings on various educational topics such as :—

(a) Theory and Practice of Education.

(b) Child Education.

(c) Education & Changing India.

(d) Womens' Education.

(e) University Education.

(f) New Psychology and Education.

(g) Religious & Moral Instruction.

(h) School Inspection.

The last four topics were, however, discussed in the general sessions of the conference. In the sectional meetings a number of papers pertaining to the subjects enumerated above were read and discussed. But no subject evoked such keen discussion and wide interest as the subject of school inspection. The best speeches of the Conference were heard on this subject. Inspectors as a class were subjected to severe criticisms, and as they were in a small minority, they were not defended satisfactorily. One speaker humorously remarked that it was high time that the race of inspectors became extinct and their annual visitations came to an end. While the consensus of opinion was in favour of maintaining the institution of inspection intact, it was at

The Seventh All India Educational Conference.

BY

SALIM BIN SAYEED, B. A. (HONS.), B. T.,

Head Master, Osmania High School, Darus Shifa, Hyderabad Deccan.

THE 7th All-India Educational Conference met at Bangalore during the last Christmas week. Sir C. V. Raman, the President-elect of the Conference, was prevented by sudden illness from presiding over the deliberations of the Conference, and in his absence, Mr. Subba Rao, Director of Public Instruction, Mysore State, took the chair. After prayers and a message from H. H. the Maharaja of Mysore, Professor Venkatesachar of the Central College, Bangalore, the Chairman of the Reception Committee, rose to speak. In a felicitous speech, he welcomed the delegates to the Conference, and briefly touched upon unemployment among the educated classes, compulsory primary education, and the necessity of vernacularisation in High Schools. The President then delivered his address which, though brief, dealt with the main problems of education which are agitating the minds of educationists all over India. He laid stress upon the importance of the teaching profession, dwelt on the dignity of the teacher, and showed how this could be maintained by professional solidarity. One great need of the country, the President opined, was the training of the youth in habits and thoughts of co-operative fellowship, a fact which President Hoover also stressed when he said "We are passing from a period of extremely individualistic action to one of associational activity." Since education was a preparation for life, our system of education should be so adjusted, having regard to the peculiar conditions of Indiā,

Manual Training in France & Germany.

In France, a law was passed in 1882 making Manual work an ordinary part of the school curriculam. In Germany, different kinds of Manual work were taught; and in 1878, the first school for the training of teachers was opened. The Teachers' Training College of the German Association for Manual instruction at Leipzic, was established under Dr. Gotze, (who did yeoman service to the cause of Manual Training,) with the idea, that it was meant as a direct preparation for the trade which the pupils intend to learn later on.

Manual Training in Great Britain.

Manual work was introduced into all the principal county-council schools of London; and Sloyd was taught in many of them. There were at the end of March, 1908, as many as 210 wood work centres and 12 metal work centres in London; at which, 57,980 children were in attendance. Manual work or Sloyd formed part of the regular curriculum in the schools of Leeds, Bradford, Keighley, Manchester, Sheffield, Glasgow, Edinburgh and Aberdeen.

Sloyd in the United States.

A Swedish system of Sloyd was introduced into the United States of America by Dr. Gustaf Larsson, a pupil and Assistant of Herr Otto Solomon in 1888. By the enlightened munificence of Mrs. Quiney Shaw, a free Sloyd school in Boston was started about 42 years ago. Sloyd has been adopted as a part of the school curriculum in a large number of schools in Massachusetts.

(To be continued.)



turn out good work. I admire their dexterity and I respect their earnestness; but, I say to them that this is not enough. The artizan's skill is in handling *dead* material. What we want is something different from this, it is a man whose thought is in the handling of the *living* material the tissue of childhood"

History of Manual Training.

The first Sloyd school was started at Naas in 1872, and Solomon became its Director. Here he was able to realize some of his educational ideals. His uncle, the large hearted and public spirited philanthropist, August Abrahamson, warmly supported the scheme of his nephew; and his fortune was devoted to the establishment and maintenance of the school on his own estate at Naas, which has become an international institution. August Abrahamson died on the 6th May, 1898.

Sloyd in Sweden and Norway.

Sloyd as a system of Manual Training was organised in Sweden at first in 1870, as an effort to prevent the extinction by machinery of peasants' home-industry during the long winter nights. In 1872, schools were started for the special purpose of teaching Sloyd. In the same year, a school was started Naas, to teach different branches of Sloyd, namely, Carpentry, carving, turning, smithy, basket making, sadlery, stone-cutting, fret work and painting. The first training class for teachers of Sloyd was formed by Otto Solomon in 1874. Sloyd was introduced into Norway in 1879.

Manual Training in America.

Manual Training came into America after the Central Exposition at Philadelphia in 1876, which contained a full exhibit of the method of tool-instruction devised by Victor Della Vos in 1866, for the imperial school of Moscow. His systematic analysis of tools and processes provided a basis for Manual instruction, as it was introduced into secondary schools and especially the Manual Training Schools of America.

touch and sight. (2) The teaching should be voluntary and individual. (3) The instructors should be trained teachers, and not mere craftsmen. (4) Abstract and preparatory exercises should have no place in Sloyd. (5) A proportion of the models should have surfaces, whose outlines are free curves to develop the sense of touch, sight, and form. Love for the beautiful in art is thus fostered, and the aesthetic nature receives a good training. (6) Turning and carving should be used but sparingly. Neither of them should be recommended from the hygienic point of view. Wood-carving does not involve that energetic labour which is necessary for manual work.

The Teacher of Sloyd.

The teacher of Sloyd or educational Manual Training must be able to understand child-life and child-nature and know how to provide wisely for the vigorous use of growing muscles in such a way as to secure a normal physical development as well as mental alertness, pure taste, and right feeling. The teaching should be systematic, progressive, and with the exception of class demonstration, as far as possible, individual. He should select such work for the boy as will give the best physical development through free vigorous movements. The habit of careful and independent thinking should be developed through the personal estimate of his own work. To expect all these, the teacher should have a good special knowledge of his subject. Technical skill is also a necessity, but should never be the chief requisite in the selection of a teacher.

I have the pleasure to quote here the words of Dr. Henderson about the qualifications of the teacher of Manual Training :—

"It is very difficult to find men and women of broad culture, who could have used their hands. It is very easy to find artizans, who are willing to exchange the smaller pay and longer hours of the workshop, for the pleasanter work of the school-room. They believe very sincerely that the only qualification is the ability to

and magazines, upon educational handwork. He was the editor of a series of educational classics, and had translated the works of Comenius, Locke, Rousseau, Saltzman, Pestalozzi, and later James Freeman Clark's "Self Culture" for the benefit of his countrymen.

The Three Methods of Manual Training.

Method may be defined as a regular and a rational procedure to attain a certain end. There are in use three distinct methods of Manual Training (1) The Abstract Exercise Method. It is practised in the old Russian system of Manual Training, and in the workshops of the city and guild of the London Institute.

(2) The Preparatory Exercise Method is generally practised in workshops of the London School Board, and in a few other schools.

(3) The Sloyd Method. This is practised in most schools of America, in all schools of Sweden, and in a large number of other European and Indian schools.

Principles of Sloyd.

There are two kinds of principles governing any method-*General and Special.* Definite method and principles should be employed as the working basis of Sloyd.

General principles:—(1) The instruction should proceed from the easy to the difficult, from the simple to the complex, from the known to the unknown, and from the concrete to the abstract.

(2) As the training progresses, the number of tools and manipulation should be gradually increased. In the beginning, the knife, which is the fundamental tool, should alone be used as far as possible. (3) The models must be arranged in a progressive series. (4) The exercises should result in the making of a useful article, the use of which is appreciated by the child. *Special principles:*—(1) The instruction should be instructive in character, that is, it should be given as far as possible, through the senses of

(1) to instil a taste for, and a love of labour in general;

(2) to train in habits of order, exactness, cleanliness and neatness;

(3) to form habits of attention, patience, industry and perseverance.

The Utilitarian aims are :—(1) to directly give general dexterity in the use of tools (2) to execute exact work.

Sloyd aims at all the physical development of the body without any prejudice to the productiveness of the work. Its very first demand is correct movements while at work. Bad positions and incorrect movements bring on cramps and disproportionate development of the body. Here are a few hints for the guidance of amateurs :—(1) Steady gymnastic position of the body should go with the economical use of bodily strength. (2) The position should be free, easy and natural. (3) The position should be such as to save an increased muscular strength, rather than exhaust it. (4) In positions where power is required in the horizontal direction, the feet should be so placed as to give greater support to the body. (5) The position should be such as to allow the expansion of the chest, the keeping of the back straight, and the holding of the head upright.

The Biography of the originator of Sloyd system.

Otto Solomon was born of Jewish parents at Gothenburg, in Sweden, on the 1st of November, 1849. About fifty years ago Solomon, like his predecessors Pestalozzi, Froebel and Sygnaeus, started an educational movement based upon ideas which spread not only in Sweden, but in almost all the civilized countries of the world. He travelled extensively and had a wide correspondence with some of the most thoughtful and distinguished scholars of his time in many parts of the world. Besides his lectures at Naas on various educational topics in three or four languages, he was the author of several books, monographs

" Sloyd "

Definition of Sloyd.

Sloyd is tool-work so arranged and put into practice, as to stimulate and promote vigorous and intelligent self-activity for a purpose which the worker recognises as good.

In other words it is a system of educational hand-work, so arranged as to make boys have adequate training in processes, precisely graded in difficulty and importance, in order to secure the proper unfolding of the various faculties of the mind, and the highest powers of the brain, head, hand, heart and eye acting in conjunction.

The word Sloyd comes from an old Swedish adjective " slog " meaning " skilful," " handy " or " deft " and from it comes the noun " Slojd " or English Sloyd. It is used to indicate something which the term Manual Training does not indicate, and which the words carpentry, wood-work or shop-work fail to convey. The system of Sloyd is not based upon a definite set of models, but upon universally recognised educational principles, to which all models or methods are adapted, not by its outward expression only, but by its aims and principles.

Sloyd is not the outgrowth of a single mind, or of the experiments made at any one time or place ; but it is the result of the work of wise investigators and practical teachers in many countries. Just as Kindergarten teaching is based on the philosophy of Froebel and Pestalozzi, the aim of Sloyd is to develop the body, mind and character, of a growing boy chiefly by its appeal to many-sided activities.

The Aims of Sloyd.

The aims of Sloyd are both *Formative* and *Utilitarian.* The formative aims in the words of Herr Otto Solomon are :—

(3) Jean Jacques Rousseau (1712-1778) said, "Some well ordered handicraft must be one of the indispensable factors in the education of a child."

(4) J. F. Herbert (1776-1841) says, "Every man should learn to use his hands. The hand holds the place of honour at the side of the power of speech in raising man above beasts."

(5) Prof. William James says, "The most colossal improvement which recent years have seen in secondary education lies in the introduction of the Manual Training Schools, not because they will give us a people more handy and practical for domestic life and better skilled in trades, but because they will give us citizens with an entirely different intellectual fibre.

(6) President Stanley Hall sums up briefly the following physiological reasons for the introduction of Manual Training into secondary schools. "It lessens the interval between thinking and doing ; helps to give control, dexterity, skill and an industrial trend to taste ; interests many not successful in ordinary school ; tends to the better appreciation of good, honest work ; imparts new zest for some studies ; adds somewhat to the average length of the school period ; gives a sense of capacity and effectiveness ; and is a useful preparation for a number of vocations.

(7) Dr. Felix Adler Says, "Manual Training is interesting to the young as history, geography and arithmetic often are not. Precisely those pupils who take the least interest or show the least aptitude for literary studies, are often the most proficient in the workshop and the modelling room. Nature has not left these neglected children without beautiful compensations.

In consideration of the above, Western nations have found out by long experiments and experience, that those faculties on which literary studies have no effect can best be cultivated by well graduated systematic work, generally known in the school curriculum as Sloyd or Manual Training, which, like the Kindergarten, utilises a child's innate desire for activity to the development of its bodily and mental powers by systematic exercise.

leave the High School, are compelled to accept low salaries either in schools and offices, or in other minor services owing to their deficiency in resources, want of the power of observation, originality and inability to sustain heavy responsibility. These conditions are attributed to the purely bookish studies of their school days. Nothing is more disappointing to poor parents, who have spent large sums of hard-earned money for their son's education than to find them, after a long school career, in delicate health and with prospects of earning a living which are less than the wages of a workman.

Every school and every community has at least 30% boys of the type of Clive of England, Sivaji of Maharashtra and Hyder Ali of Mysore, who get sick at the sight of books but who can stand one against ten in anything else. These are the boys who, when properly trained, make the best administrators, engineers, machanics, modellers, leaders, military men and even rulers sometimes. So it is the business of education to assure them a decent and honest living and not to leave them to chance. The development of the intellect alone does not constitute education. The burden of the song of all the educational reformers from early times has been that the education of children should be based on actual life and its relations, and that the harmonious development of human nature, as a whole, is the end of all education.

The following are the opinions of some of the philosophers and educationists who recommend practical training side by side with literary education :—

(1) Michael De Montaigue, (1532-1592) said, "Soul and body, which together make up the man, should be wholly educated."

(2) John Amos Comenius (1592-1671) said, "Children must be made acquainted with the foundation of everything important. All should be sent out to the world to be not only observers, but also workmen."

"Sloyd" or Educational Manual Training.*

BY

M. ABDUL JABBAR,

Manual Training Teacher, City College.

Education is of two kinds, General and Special. General education aims at the harmonious development of all the parts and powers of a human being, and when given under proper conditions, it fits a man for any walk of life. It is called formative education. Special education aims at the training of only particular parts and faculties of a person to enable him just to earn his livelihood by doing some particular kind of work. This is called Utilitarian or bread-earning education, under which come such professions as law, medicine, engineering science, etc., and the value of special education is enhanced in proportion to the strength it receives from general education.

The present system of Indian education, though it possesses many good points, is admittedly defective owing to its impractical nature. Most of the schools and colleges are found to have provision only for literary studies, and the side of professional studies and the practice of trades, and such things as can make the boy fit for his future life are utterly neglected. Industrial education seems to be the burning question of to-day. The reason for this is, no doubt, that since the conditions of life have changed, the idea of a vocational training for our growing generations naturally appeals more to the great mass of the people than the more formal academic training, which the schools are giving. Under the present system most of the boys who

---

* A paper read at the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

before that age. A preparation for school age and formal work is as necessary for the mind as for character. It may be the Government, extending its educational facilities along this line, may do much for the future generation and at the same time make the world a happier place for its children, guarding them from many a danger and helping them to overcome wrongs, habits and sins that often lie in the pathway of childhood.

May I conclude with a short verse of poetry:
"Old and wary and worn and grey,
A woman walked in the Northern town,
And through the crowd as she wound her way
One saw her loiter, and then stoop down
Hiding something away in her old torn gown.

" You are hiding a Jewel," the watcher said;
—Ah! that was her heart had the truth been read-
'What are you hiding?' he cried again;
And her dim eyes filled with a sudden pain,
As under the flickering light of the gas,
She showed him her gleaning: 'Its broken glass,'
She said: 'I have picked it up from the street,
To be out of the road of the children's feet.'

Under the fluttering rages astir
That was a royal heart to best;
Would that the world has more like her,
Clearing the road for the children's feet."

---

it will help to fit them for their future life as true citizens.

It is an inspiration to hear the ablest educators of this country discuss the problems of youth and to know that they are giving their best efforts to the end that the children of to-day may receive the kind of training that will best enable them to assume the duties of citizenship in the future. Children, like other people, respond readily when we work with them for a common purpose. The need of co-operation to an ultimate end is the reason for civilization, and humanity responds to its appeal when all others fail. No child is too young to begin training in that important phase of our social structure and no teaching is as effective as actual experience. The problems of youth are as real as our own ; they may appear simple to us, because of our greater experience but they are not simple to the child.

Then let us appeal for more Kindergartens throughout this city—(separate Kindergartens and not Kindergartens attached to other schools), each having its own play-ground. Doubtless, there is need for one at every other corner of our streets. A woman should be in charge, and as the children from these Kindergartens reach ordinary school age, let them be drafted into the nearest Government school, so that there will be no break in the school life. Such Kindergartens require only two rooms, one for general occupation and another for rest, dining, and other special arrangements. Equipment and playground space would be essential. Perhaps this year is auspicious for commencing such a campaign for two reasons:

1. Firstly because this year Dr. Montessori who has done so much for child welfare is visiting India.

2. Secondly, because our Government has before it a scheme for compulsory education, and how could compulsory education be better started than from the lowest rung, the Kindergarten. Though all will agree that seven years of age is quite young enough for compulsory attendance, this does not mean that nothing should be done for the child

8. To claim only one's share of attention, or of material things.

In the kindergarten the child is helped to depend upon himself, to choose and act for himself, the aim being to make him desire to take care of himself and serve others. Formal exposition is impossible, but the child is constantly meeting situations which call for the practice of self-reliance. Opportunities are given him through talks, pictures, stories songs and poems. This law is especially stressed through talks dealing with the child's daily experiences.

Such topics of discussion could be :—

1. What can he do to help ?

2. Taking care of his toys.

3. Taking care of his clothes both at home and in the Kidergarten.

4. Taking care of play material.

And then the kindergarten life teaches children to be trustworthy, honest, truthful and so develops reliability in boys and girls. A young child soon discovers the meaning of property rights in his association with other children. A friendly discussion of these experiences will begin to establish standards of honesty. It is difficult to teach truth-telling to children until they have been given some understanding of truth-doing. The meaning of honesty is illustrated in kindergarten life by good workmanship, accurate folding in paper, construction work, building to the best of one's ability, what it means to be true to one's word, and what it means to make and keep a promise, or tell of reliable people, such as a sea-captain, an engineer, a doctor, talk over ways in which a child may be trustworthy, in fitness to carry a message in school or at home and readiness to repair damage in so far as a child is capable. A teacher can make it easy for children to tell the truth by guarding them from fear of consequences. So we come to the fact that kindergarten life for children will guard them from harm, will in many cases rectify wrongs that have developed in children before school age, and that

kindergarten has shown that play, properly directed is the effective way through which learning takes place.

Because of the immaturity of development and the lack of social experience, the child has little *self-control*, *little perseverance*, *little grasp of situations*, *little skill* and *few habits*. The only way in which he can develop these qualities is by experiencing them. Therefore it is the function of kindergartens and schools to provide situations in which these will develop. We may define "*practical efficiency*," with reference to the child from four to eight years of age, as those skills and habits which enable him to take reasonable care of himself and to engage happily and whole-heartedly in the normal activities of childhood. By *self-control* in the kindergarten is meant the ability on the part of each child to curb his vagrant impulses and to direct his activities and instinctive tendencies so as to work and play harmoniously with other children. Self-control is developed in the same way as all the other powers of self-expression or self-direction by regular exercise. The child should be led to feel his individual responsibility as early as possible and allowed to direct his powers toward the accomplishment of his own purpose, limited by the law defining the rights of others.

Standards of self-control for little children could be:—

1. To keep from crying at all times and to ask help when needed.

2. To respect the rights of others—to stand and wait—not crowd.

3. To bear with each other—neither fight nor quarrel—nor tell tales.

4. To answer politely—not impulsively.

5. To talk quietly—neither shout nor scream.

6. To wait till another has finished before beginning to talk.

7. To respect and care for material.

being. The timid child is as a stranger in a hostile country; he looks at his playmates and at strange adults as if they were strangers whose nature was incomprehensible and whose actions could not be foretold. The timid child is unprepared to face the problem of a social life in a social world. When the timid child commences kindergarten life the wise teacher can by degrees overcome this weakness by creating an atmosphere of friendliness, and a desire for accomplishing work and giving the child confidence in himself. Two characteristics of little children will here help the teacher in this responsible work of character building and abolishing heredity faults. They are Imagination and Love of Imitation. Through dramatic games the child will live these characteristics until they become an integral part of himself. Story and picture and poem thoughtfully chosen to present some important truth will kindle the child's responsible imagination so that he will eagerly reach out to acquire for himself the traits he so admires. On these we may build as on a rock foundation. In the Kindergarten the responsibility for character training is great. Founded upon the principle that the little child must get into right relationships with his environment, that the surroundings of even a baby influence his unconscious, and therefore later, his more conscious life, the Kindergarten is now hearing present-day psychology affirm that many of the disturbances of adult life have their origin in the non-adjustment of children. In planning school buildings and their landscape setting, we are making a conscious effort to provide not only cheerful surroundings but architectural influences which will set up desirable ideals. We wish to make the building itself an inspiration toward higher thinking and living and we believe that this may be a strong influence for desirable character development. The provision of a well-equipped playground space is an added factor. Children who are healthful and who have available desirable recreational activities are likely to refrain from the undesirable conduct so easily found upon the streets of the city. The

perishing of hunger. The answer was, first and foremost, the child must be saved, therefore his mother must go with him, and the third person would be the old valued guide to show the way. This illustrates the thoughts of civilised mankind regarding the care of the innocent and dependent life.

So as teachers and grown-ups we face this great fact and try to frame lesson, time-table, game, handiwork, rest and joy to suit the welfare of the growing child.

We know that many a child starts life with a weighty handicap due to heredity, environment, circumstances and climate. Probably the biggest handicap is due to heredity. If a person wants to become a doctor, difficult tests and examinations must be passed—the law demands it. If a bridge is to be built across a river or valley, a qualified engineer must be employed—the law demands it. A case in equity must be decided by a qualified Judge—the law demands it. But before persons marry and become fathers and mothers the law demands nothing, not even a medical certificate with the result that many children come into the world handicapped from the first, suffering from bodily ailments, from mental troubles such as fear, laziness and inferiority complexes. Many of these things can be righted by interested teachers and parents, and herein lies the great work of the kindergarten, overcoming, as it does, many of these obstacles and fitly preparing the child for school life and adolescence.

Adjustment to the world in which we all must live is just as much a problem as building a bridge or writing a book. There must be a time of preparation. It requires practice and acquaintance with the material, which in the case of children is friendship, sympathy, speech, common sense, reason and an interest in all the arts and sciences which are the warp and woof of civilization.

When a child is timid it is a sign that his parents have failed to properly instruct him in the art of being a human

Reducing the Danger of Being a Child.*

BY

Miss D. WEBSTER,

Head-Mistress, Preparatory Section, St George's Grammar School, Hyderabad-Deccan.

The heading to this paper was suggested by an article in a Medical Magazine which bore this title, "Reducing the Danger of being a Child," and which dealt with the dangers of child life as viewed from a medical point of view. But there are moral and mental dangers to which the child is exposed through the ignorance and carelessness of parents and teachers.

The child is the all important factor in the progress of the world. You have probably heard of the annual examination set each year by Edison. For the boy who sends in the best paper Edison provides the wherewithal for a higher education and then gives him an important position. In one of the most recent examinations one question was:—

If you were travelling in a desert, in charge of a company of the following people:

1. An elderly famous scientist,
2. His worldly wife,
3. Their baby boy of several years old,
4. A young clever scientist,
5. His fiancè,
6. An old responsible guide,
7. A young guide,

and you only had food enough to enable three persons to reach safety, which three would you send?—the others

---

* A paper read at the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers'. Association.

If he is petty and narrow-minded, the pupils will tend to out-do him in that. If he is able to rise above parochialism and see things in their true light and perspective, he will teach his pupils how to be loyal to their school and kind to their fellows, without being rude and mean to the pupils of other schools. The teachers of different schools ought to arrange to meet socially and at times professionally. If they are obviously friendly, it will be impossible for the teams which they represent on the football field and elsewhere to resort to discourtesy and foul play. Teachers need to keep their fingers, as it were, on the pulse of the student body, and check in good time undersirable attitudes and tendencies. One of the first requisites here is the cordial and intimate participation of teachers in the life of the school. Boys and girls need their help quite as much in their recreations and diversions, their athletics, social functions and journalistic activities, as in algebra and grammar. The modern high school teacher is tempted, sometimes compelled, to content himself with being a philosopher to his pupils rather than a guide and friend. It is lack of constant contact that leads later on to shocking revelations. Teachers who show no personal interest in their pupils can have no claim on their love and loyalty. Old boys cannot be expected to feel a sense of indebtedness to their *alma mater* unless the masters have placed them under obligation by genuine sympathy and friendliness. It is futile and foolish to try to reap where no one has sown. If a wholesome school spirit is to be found amongst the pupils, first of all the teachers must show themselves to be in possession of it

Careful Supervision.

To counteract the tendency to subordinate higher ideals for school triumphs, it will be found worth while to stress the fact that games must be played in a sportsmanlike manner and for their own sake. Rules and regulations are meant to be followed. More supervision should be introduced on the play-grounds. Right ideals must be kept before the pupils, and they should be made to understand that school spirit is only a means to an end. The habit of critical evaluation and unbiassed judgment should be emphasised at all times.

Influence of Traditions.

It must be remarked that the corporate nature of the school life needs to be kept in mind when influence on the pupils' wills is being considered. That life is the great moulding agent, for during school years a child is most influenced by his companions. From them he borrows ways of looking at school matters. He imitates their attitude towards the teachers, towards lessons, towards games; he accepts their standards of school-boys' honour and as a rule he acts upon that rather than upon the teachers' exhortations when the two are not in accord. The teacher can exercise but little influence in direct opposition to the general opinion of the school. School tradition is powerful. If it is wrong all efforts should be directed towards changing it, for without its general concurrence there may be government but there can be little real discipline. School spirit and school tone are valuable servants but dangerous masters. The great task before the secondary school with respect to its "life," is to inform all the activities, study, recreation, athletics, social affairs, with a wholesome morale, so that in them all the will of youth is acting as we would desire it to act in his mature life.

The Teacher's Responsibility.

In all these matters the importance of the teacher cannot be overlooked. A very great deal depends upon him.

country, right or wrong", and the suppression of critical habits and a discriminating attitude. It may limit the pupils' vision, interest and outlook, and have a very cramping effect. The tyranny of the majority which is likely to be set up may strangle individuality for the sake of uniformity, and give no chance to the minority who may be in the right and ahead of the mob. Care should be taken and attempts made to counteract these possible undesirable manifestations of the school spirit, and to see that the effect of the collective suggestion upon individual thought and action is nothing but salutary and praiseworthy.

Broadening Interests.

Precautions need to be taken to see that the means and agencies proposed for creating a school spirit do not give rise to new evils. A cramping loyalty, a parochial outlook and an intolerance of a different view are serious maladies and ought to be prevented as far as possible. This can be done largely by making the devotion more intelligent, and by occasionally breaking down the walls of isolation. The schools of one town may combine to play against those of another. The same thing is possible with debates. By being aligned on one side they have chances of seeing something of the others and of correcting some of their queer notions. This widening of loyalty may be indicated by the use of school colours as well as of district colours, or the emblem of the one against the background of the other and the like. Just as attempts are made to save 'House' loyalty, where the House system exists, from becoming disproportionately prominent, so in the case of the school of a town, district or state, this extending of interests and devotion cannot be neglected with impunity. Opportunities should be provided for the meeting of the pupils of the different schools. Picnics, excursions, scout camps etc., may be utilized for expressing as well as for cultivating a spirit of friendliness between institutions. What we do not know we tend to fear or hate.

the idea and the feeling that the students are members of one body, and further that they increase the number and intensity of the ties of kinship binding them together. Besides, they develop not merely group consciousness but group responsibility. Inter-school sports, tournaments and debates have the effect of making one group stand over against another, thus in a way stressing their loyalties. These activities, needless to say, have intrinsic value as well, but with that we are not concerned here. Activities such as these centring in and around the school and affording immense pleasure, make it possible for the school to be associated with some of the happiest moments of the pupils' lives. Under these circumstances the love and devotion of the students to their school may safely be taken for granted.

Curricular vs. *Extra-Curricular.*

It is not imagined here that class-room activities never exercise such influence. At the same time, it is useless to deny that residential schools and those which encourage extra-curricular activities have a decided advantage over the ordinary day school. Working together day after day cannot but make the students of a class realize that they belong to one institution. But all too often class work is anything but pleasurable and the association with each other is unavoidable and usually taken as a matter of course, whereas living together day in and day out binds the group together as nothing else can, and extra-curricular activities call for spontaneity, all-absorbing interest, and occasion intense pleasure. Happy is the school where work within the class-room partakes of the quality usually associated with work without.

AVOIDING UNDESIRABLE POSSIBILITIES.

The encouragement of exclusive attachment to an institution is liable to lead also to unwholesome consequences. A narrow loyalty can result in the familiar attitude, "My-

in the school, and something about the members of the staff, will make for easy initiation and rapid assimilation. The addition of some extra pages will make it a very useful diary as well, with the out-standing school events and holidays printed therein. School newspapers and magazines also help to create a sense of unity.

School Assembly.

A school assembly or convocation is of great advantage in improving morals. Through weekly or less frequent meetings, interesting talks and programmes, it should be possible to ensure a common body of knowledge regarding the history, traditions and activities of the school. At the beginning of the year a formal assembly could easily be held at which the head of the institution may welcome the newcomers, introduce the members of the staff and sound the note for the work of the year. This would make the pupils, new as well as old, realize that they all belong to one academic community. Another formal convocation may appropriately and profitably be convened at the end of the year. The feeling thus aroused in the student that he is part of a large group in concerted activity helps to increase his pride and spirit.

Visible Signs.

This sense of unity can be strengthened also by various visible signs. Badges, colours, styles and colours of dress, are often used for this purpose. School songs, school note-books etc. contribute towards a similar effect. They mark out the boys who belong to that school from all the rest, and make them feel a sense of kinship to each other. It must be added that while these can become obtrusive and annoying, within reasonable limits they deserve to be commended for more general adoption in India.

Joint Activities.

Unifying activities are not difficult to plan. Dramatic performances, debates, picnics, excursions, scouting, school magazines, exhibitions, assemblies, all tend to drive home

enables the student body to co-operate with the head-master or principal and the staff in meeting the problems of the school, falls within the scope of the "student council". The pupils not only begin to share in some little way in the running of the institution but have a legitimate channel of expression for their grievances and problems. Further, it readily enables the students to realize that the building up of worthwhile traditions and the maintaining of the reputation of the school or college is a joint responsibility. Much can safely be done in our institutions by way of taking the pupils into administrative partnership. And the results will be astonishing. As matters stand, the traditional school is either an autocracy run by the head-master, or a bureaucracy governed by the teachers. It is certainly not providing the necessary training for self-direction and life in a democracy.

Permanence of Staff.

Another factor which is likely to help the growth and maintenance of a deep devotion is a certain degree of permanence for the staff. It must be obvious that if the teachers and head-master keep changing frequently no abiding loyalty is possible. In the same way student migrations run counter to the perpetuation of school traditions. It is difficult for most people—pupils and alumni—to maintain a steadfast attachment to an institution which is constantly changing in control and complexion.

Unifying Factors.

Above all, if the students of an institution are to feel that they are one body and that they and the staff together constitute that school or college, it is very necessary that unifying agencies, activities and experiences should be multiplied. In the first place, the possession of a common stock of knowledge should be made possible. A school or college hand-book dealing with the history of the institution, its aims, ideals and traditions, its aspirations and achievements and its rules and requirements, and including a brief description of the different activities and associations

aware. The more successful the school activities, the more pride will the students have in them. So the achievments and distinctions of the school and its students, past and present, should be given due eminence. The traditions of the school need to be kept alive and stressed. Admiration should be intelligent and informed if it is to last. First develop a school of which its pupils may be proud and then give them opportunities to express their pride.

Pupil Participation in School Affairs.

The students' interest in the school can be increased in various ways. The best way is to give them some part in the managemet of its affairs. The student who gives of his time, thought and energy to his school cares for it the more because of his contribution. The greater the opportunities for student participation, the larger the number of faithful friends that the school will have made. Rowdyism and rebellion will be inconceivable. Many of the problems and responsibilities of the school therefore may well be shared with the pupils. The school must not only offer opportunities for the students to share in its work but should also give them public recognition when they do a fine piece of work. Pupils' attention may occasionally be drawn to those elements in the school which can be and ought to be easily improved. It is foolish for an institution, as for an individual, to pretend that it has no room for improvement. Thus practice of, and thinking about, what constitutes happy living together, will be combined. It is for us to see to it that our pupils find the reward of right action sweeter than that of wrong action, that they get the taste early, and that by much tasting they come to have the desired preference.

Student Self-Government.

A sense of responsibility is greatly assisted by a student representative council. While it is desirable to multiply chances for pupil co-operation in the many activities and affairs of the school, some type of organisation is necessary for providing participation in control. Any plan which

mean, however, that but for this physical and topographical condition the school spirit is impossible of development. It is to be regarded as valuable but not as indispensable.

Happy School Life.

Boys are not likely to cherish the events or incidents that were not pleasant at the time of occurrence. Nor can a strong attachment grow towards an institution with which pleasure and satisfaction have not been associated. So school officers have to see to it that life at school is made happy, that opportunities for all-absorbing activity are amply provided. It is the privilege of the school authorities to direct the school life in such a way that all those with leadership abilities find the places where their particular kind of strength is called into play, the active, practical minded in leading games etc., the artistic in art displays and dramatic performances, the scholarly where scholarship is needed and so on. Excursions and holiday trips not only provide some enjoyable diversion and relief to the monotony of school life, but greatly help to weld the pupils into a body of intimate friends. Beautiful and attractive spots and lawns often invite loving attachment and warmth of feeling. The fact is that the school must seek to befriend the pupils, and in this go more than half way. Not until then will genuine devotion start growing. The chains which bind the schools to its pupils can be no other than the chains of love, and in the forging of these, pleasurable experiences play no small a part.

Pride in the School.

Pride in the school can be stimulated and encouraged. This is the prerequisite of devotion, and the guarantee against indulgence in talk or action likely to bring the institution into disgrace. It is useless to expect children to be proud of their school unless there are some things of which they may rightly be proud, and of which they are made

citizenship is conceivable. If all the members of a community felt a personal responsibility for the well-being of the town or community, we should at once have an ideal condition.

MEANS OF CULTIVATION.

Native Tendencies.

From a psychological point of view, it may be said that school spirit is an expression of the different forms of the social instinct. This instinct is manifested in various kinds of native reactions to persons, such as observing, imitating, competing and is shown also in several rather distinct forms. There is the herd or gregarious tendency. There is sympathy or the impulse to feel as others do. There is love of approbation or the effort to please others, to stand well in a group. There is competitive and co-operative activity. Further, there is the attachment or loyalty to an ideal, a person or an institution. There is altruism which shows itself in regard for the welfare of others and in the subordination of selfish interests. In addition to these, there is the tremendous influence of folkways and *mores*, the effect of corporate suggestion upon individual thought and action. Thus the cultivation of school spirit has ample support in the forces, impulses and tendencies already in existence, and involves only deliberate direction and intelligent manipulation.

Location of School.

Many means can be used to bring about this attachment to one's school. Even such a prosaic thing as the location of the school can play an important part. It is a distinct advantage, for example, to have the building all by itself, preferably an architectural unit, either on an elevation or away from the crowded neighbourhood. This isolation, helped by a compound wall, is in some ways symbolical of the attitude we seek to develop, safe from the disruptive influences of the outside world. This does not

means encouraging one's own weak team in an athletic contest, supporting the school or college magazine, regularly attending debates, lectures etc. It makes itself felt in school activities which may not be so popular.

This "we-feeling" towards the members of the school, head-master, teachers and fellow-pupils, has far-reaching effects. It means respect for authority in the class-room, in the assembly hall and on the playfields. Group consciousness involves wholehearted participation in every school activity. It insures the minimising in school of class, communal and sectarian distinctions. Social coherence helps to isolate an institution from the contagion of undesirable influences and movements. It is certain to prompt pupils to defend their school or college against unjust attacks and frivolous criticisms, and of course never to indulge in such themselves. It will teach pupils to put the welfare of the school as a whole above the interests of the class, society, team and party. Finally, it is the unmistakable forerunner of lasting alumni interest.

To the Pupil.

The pupils gain invaluable training through the subordination of petty and selfish considerations to the common good and the advantage of the school. They acquire the habit of co-operation, team work and "pulling together." There is also the growing preference for the satisfactions of an orderly corporate life. The essential feature is that each one shall feel his personal responsibility for the whole and shall meet it by doing his.

To Society.

Society is ultimately the better for this discipline which the pupils undergo. The cultivation and exercise of school loyalty and *esprit de corps* lead to a keener civic sense and public-mindedness. It makes far active and everwidening interest in public affairs, public property and matters which do not belong to him personally. No better preparation for

It should not be necessary to say much to prove this worthwhileness of a strong loyalty to one's school or college. Unfortunately, however, its importance is rarely appreciated until something goes wrong.

To the School.

So far as the school is concerned, such an attitude is an invaluable asset. School sentiment is a junior edition of public sentiment, and public sentiment is the strongest force in human society. It makes possible and available a public opinion which can enforce conformity to certain accepted and acceptable standards. It obliges the weaker members also to regulate their conduct according to the behaviour, habits or folk ways of the school. It therefore makes co-operative efforts easy and natural; and self-control and discipline readily become matters of common concern. In fact, so powerful is the influence of these established school customs, forms and standards that there comes to be an expectancy and a mental adjustment on the part of the children before they actually become members of the school, and after they have joined the school, its ways, its customs and its standards grip them and begin to fashion them. The individual is made to feel the compelling power of the group standard towards right kinds of conduct.

There is no surer guarantee of a personal responsibility for the well-being of the school. Nothing is more likely to give the students a sense of pride and privilege and a feeling of obligation to hold sacred the fair name of their institution and to pass it down fairer and nobler to the next generation. The stirring up of group loyalty and the arousing of their collective pride is bound to have a "tonic" effect upon the further conduct of the pupils. Concern for all the affairs of the school, its property as well as its reputation, is the result of a feeling that it is their institution, that it exists for them and not for the teacher alone. Good school spirit

was not what it should be. May be that in the sudden surprise visits of the Director of Public Instruction many loopholes have been found. Some of these life's little worries disturb the even tenor of the life of the Head-Master. Otherwise he can be, and is, always happy.

The Cultivation of the "School Spirit."*

BY

Dr. G. S. KRISHNNAYYA, M. A., (MADRAS) M. A., Ph. D. COLUMBIA:

Lately Professor of Education, Mysore University.

"School spirit" is hard to define. It includes more than is conveyed either by "corporate feeling," "school loyalty" or "*esprit de corps.*" It includes all these and something more. While it escapes definition, it is something so real and active in the life of the school that even the occasional visitor will notice its presence or absence among the students. It may perhaps best be described as an attitude of "our-schoolness," *plus* a sense of belonging to the school, *plus* a "we feeling," so far as the constituent members are concerned. Apart from the fact that it is a significant feature of the outstanding institutions of the West, there is much to be gained by its careful cultivation in our schools and colleges. The aim of this article is to indicate the need of encouraging such a school spirit, to describe ways and means of cultivating it, and to suggest precautions that must be taken against possible undesirable manifestations.

* A practical and detailed treatment of the activities mentioned in this article will be found in the author's new book, *Education out of School—A Handbook of Extra-curricular Activities* shortly to be issued by the Oxford University Press, Bombay,

of his thriving and prospering and ultimately reaching the highest position in the State? He can legitimately share the pleasure with the parents of the young man, and mind! without any jealousy. The father is proud of the boy and the Head-Master is equally proud of him. Can a millionaire have this unalloyed pleasure? Certainly not! The Head-Master can be the happiest man in the world and can offer a challenge to the Miller of the Dee with his *chalky* garments instead of the *mealy* cap, provided that he minds his will in the school and keeps it going. There are supreme moments of pleasure when, at the public examinations, the school scores brilliant results which are, say, 70 to 80 %. In some year, when his boy tops the list in the H. S. L. C. or the Osmania Matric Examination, his joy knows no bounds. It is a red letter day in the annals of the school. If the staff co-operate with him in right earnest and work off-time and in holidays, even when plague or other epidemic is raging, their efforts are bound to be crowned with success. Sometimes, some schools establish a record for brilliant results and the Head-Master strains every nerve to maintain this record. When his boys attain distinction in other fields, e. g. win a shield in a football or hockey tournament or get medals in an athletic contest or secure bag prizes in an elocution competition, the Head-Master feels very happy. He is proud of his school and of the boys who have achieved success and the boys, in their turn, are proud of their Head-Master. This is the bright side of the picture.

The Head-Master's life, is, however, not allowed to be an unalloyed pleasure, a round of gaieties. There is a dark side to the picture. Every silver lining has a cloud near it. May be that the results in the public examinations are disappointing or the usual level of excellence has not been reached. May be that the school has not fared well in the annual inspection of the Divisional Inspector. May be that when a distinguished visitor came to the school, the discipline

wages a war against the teachers. When such an *impasse* occurs, the weaker (Mr. Head-Master) goes to the wall !

(5) Don't keep notoriously bad boys in your school. First, make an honest attempt to correct the morals of bad boys. The school, in addition to being a seminary, must also function as a reformatory for bad boys. Until they commit some criminal offence, where are they to go before they are put into the Police reformatory ? So schools must act as a house of correction. If the class teacher, the Head-Master and the parent form a triple alliance and seriously take into their heads to exorcise the devil out of the boy, in ninty-nine cases of a hundred, the evil spirit will go. If even after this, he is incorrigible and persists in his evil ways, let him go to the—. Strike his name off the rolls but do not grant him a Transfer Certificate. If he is retained in the school, he will contaminate the whole flock.

(6) Don't disobey the orders of your superior officer. Let every Head-Master study his idiosyncracies, likes and dislikes, and let him not incur his displeasure. In your correspondence, be very polite. If you differ from your officer in any matter, place your view-point before him in as polite a language as possible and if you have failed to convince him, implicitly obey his orders and let the matter stand there. What every officer wants is work and obedience, and of these two, the latter is the more important ; otherwise serious consequences follow. Never invite trouble. You have enough of it, unasked !

The Head-master, if he is honestly and conscientiously discharging his duty, can be supremely happy, for he has the peculiar satisfaction of finding that his efforts are bearing fruit year after year. Like the gardener that he is, he sees the seeds germinating and plants growing vigorously. He has to water and manure them and protect them from blight and high winds. What more satisfaction and unalloyed pleasure can a Head-Master get when he sees a pupil

incarnation of Saraswathi or the goddess of learning and what a big fissure or cleft is made in the moral race, if, as it sometimes happens, the teacher is really in the right and the Head-Master in the wrong! Nowadays, Assistants are in some cases, as learned as the Head-Master and fortunately learning is not the special preserve or jagir of anybody. So Headmasters, especially ill-posted Head-Masters, beware!

(2) Don't set up impossible ideals or pass orders which are incapable of human achievement. Some Head-Masters especially green ones, in their enthusiasm for work want to achieve the impossible. Above all, the Head-Master should be endowed with strong common sense and should, with little introspection, see whether the proposed order that is going to be passed, will remain a dead letter or can be given effect to. If there is a tangle, if opposition is feared, or if there is a knotty problem to be solved, why don't you decide it at your weekly staff meetings? A work-enhancing and leisure-depriving proposal of the Head-Master, not submitted through the weekly staff meeting, is foredoomed to failure. But let it obtain the assent of the majority of the staff, it is bound to succeed. So Head-Masters! co-operate with the staff.

(3) Don't show preferential treatment to any member of your staff, nor differentiate between the boys of rich and poor parents. If you do, trouble is brewing. Be uniformly strict or be uniformly kind. Then there is no trouble ahead. If there is disparity or inequality, the school becomes a hot-bed of cliques and intrigues. Heaven save us from such a weakling Head-master!

(4) Don't be a slacker, delegating all your powers to one of your Assistants. If you begin signing every draft put up by him, he runs the whole show and you become a puppet in his hands. He enjoys a free ride over you. He feels supremely happy and you seem completely miserable. The whole staff is against such a tyrant and he

Return to the office and see visitors if there are any. Do office work and check exercise books and copy books corrected by the teachers. This is sadly neglected by Head-Masters. If the teacher gets to know that this work is not supervised, he will do it in a slipshod manner. Repeat class to class visits as in the morning session but reverse the order. If you have not walked round the premises in the morning, do it now. Inspect games kit, interview games prefects or monitors (or this may be delegated to the Games Secretary). Watch Drill and Gymnastics occasionally. Return to office. After 4 p. m. go to the playfields. Watch or play games till 5 p. m. and after the boys disperse, leave the school.

N.B. The time for class-to-class visit must every now and then be changed as circumstances require and permit. If the Head-Master suspects that the discipline of a particular class is bad, he may pay additional flying visits and make the teachers feel that he is ubiquitous.

Some Don'ts for Head-Masters.

Since I have done with most of my Do's under the sub-headings of "Qualities" and "Duties," I shall limit myself to some half-a-dozen Don'ts here. Although the negative way of expression is not so forceful as the direct command, yet, in some cases, Don'ts are as dynamic as Do's.

(1) Don't correct or criticise the teachers in the class room before the pupils. This is inadvisable from two standpoints. You wound the susceptibilities of the teacher. You loosen a ring in the disciplinary chain. The class teacher is a link between the Head-Master and the boys and if you take to task a sensitive teacher in the presence of the boys, he may begin to discuss with you and try to prove his point, and assuming hypothetically that you are in the wrong and the teacher is in the right, what an awkward situation is created for the Head-Master who is supposed to be the

and has his being. I wonder whether I have exhausted all the duties with which the Head-Master is saddled.

The Head-Master's daily routine.

It would not be out of place, were I to append the daily routine of a Head-Master for the guidance of Junior Head-Masters and for the information of the audience.

Morning Session. Be in the school half an hour before time. Walk round the school and see whether it is clean and tidy and whether the sanitary arrangements are all right. This early going acts as a check on peons, sweepers, waterman etc., who will not otherwise turn up in time. Interview a visitor or two. First bell-9-45; witness Assembly-parade in the compound; Prayer Song and singing of the Hyderabad National Anthem-10 minutes. Marking of attendance by the Teacher 5 minutues. Boys go in Indian file to the classes. Lessons should begin at 10 a. m. Stand at the gate for some 10 minutes. Fly to each room to see whether the teachers have begun work. Go to the office and dispose of correspondence. See visitors. Make class-to-class visits remaining for a longer or shorter time as circumstances demand. Deal with cases of school discipline. Make note of any important matter in the Log Book for discussing in the Staff Weekly Conference. Allot the last period in the first session for teaching.

Recess. Take breakfast or midday meal or lunch whatever you may call it. Say prayers with the congregation if you are a *Sunni* Musalman (if a non-Sunni Musalman or Hindu, do office work). Make arrangements for games.

Afternoon Session. Call Assembly parade for marking attendance 10 minutes before time—no Prayer Song, no Anthem—Disperse—Begin work at 1-30 or 2 p. m., as the case may be. Watch late comers for 5 or 10 minutes at the gate. Fly again to see whether school work is in full swing.

the management, discipline, tone and equipment of the school.

The Head-Master is also responsible for the cleanliness and sanitation of the school. Cleanliness must be his watchword. He must see that the class rooms, verandahs and fields are swept, the furniture is dusted, and waste paper and sweepings are removed and transferred to the nearest dustbin. Menial servants are apt to be lazy if supervision is slack. Any dereliction of duty must be dealt with forthwith; otherwise dirt will accumulate. The Head-Master should now and then peep into the latrines to see whether the scavenger is attending to his duty and also whether demoralised boys are having a free hand at obscene sketches. The Head-Master has to control peons and other menials attached to the school and see that everybody does his work regularly.

The conducting of examinations, the effecting of promotions, checking whether the curriculum is being finished in time or not, looking to the school building, furniture, apparatus and science laboratory, the supervison of the play grounds, Scout room, Boys' reading room and prayer room, the checking of copy books and exercise books; the granting of interviews to boys and guardians and others; the maintenance of the school library, the management of the school debating society—all these are duties devolving on the Head-Master. He must hold weekly staff meetings to devise ways and means for the improvement of teaching methods, organisation and discipline and solve some knotty problems that crop up during class management. He must organise a Teachers' Association in his school and hold meetings regularly, at least once a month. He must also have a Teachers' Reading Room for which, besides the usual dailies and periodicals, educational journals must be subscribed for. Lastly, it is the duty of the Head-Master to build up a tradition in the school in which he lives, moves,

tional experiments and any unusual events connected with the school. Supervision must not be done in a fixed period or periods but the time should be as varied as possible, so that the teacher is made to realise that the Head-Master is ubiquitous and can turn up any time. This can be accomplished by his making a rapid flight to any class where he suspects slackness. If the Head-Master is on the alert, the teacher cannot afford to be slack. The Head-Master must be a strict observer of punctuality. He must come early and go late. A Head-Master turning up late has no moral justification to question, or call for an explanation from an unpunctual teacher. Much less is he justified in punishing a student who comes late. In the matter of punctuality, the lead should be taken by the Head-Master, and the staff and students will follow in his wake. The Head-Master has another important duty to do. He has to mind the office work. He must check the fee account and remit the amount to the treasury and maintain ledgers and issue progress reports and Transfer Certificates. In regard to office work, the Head-Master cannot afford to be slack because reminders will be coming from the head office to wake him from his lethargy. Some Head-Masters are very fond of office work and think that this alone is their legitimate work Such are gravely mistaken. Office work is only a sidework. The maintenance of discipline, organisation and supervision are more important duties.

Teaching, which was once an important duty of the Head-Master, is now being relegated to the back-ground. Time was when the Head-Master who used to annex to himself the maximum number of periods was considered to be the most successful Head-Master. The angle of vision has changed. This is now considered false economy. A high school Head-Master, who teaches more than a period a day, is neglecting other important work. Opinion is gaining ground that the Head-Master should be totally exempted from teaching work, so that he may solely devote himself to

individual. It is not possible to analyse this quality any more than it is possible by dissecting a man's brains to find wherein resides the soul or the spirit of life. But, that it exists is beyond question."

Duties of the Head Master.

The duties of the Head-Master are manifold and arduous. To enumerate some, he has to frame the Time-Table and set the machinery of the school going. Since in a high school, one or more teachers are often on casual leave, a provisional Time-Table has become a regular institution in big schools. A new Head-Master frets and fumes when many teachers suddenly absent themselves at a time, but an old one coolly sits and makes the best of the situation and keeps the boys somehow engaged. The Head-Master is especially driven dotty when at the fag end of the year, several teachers conspire to exhaust their casual leave. This practice taxes his patience to the breaking point, but if he is tactful he can overcome any situation.

Another duty devolving on the Head-Master is the maintenance of discipline. This very often entails the issuing of notices in a book entitled the Notice Book in which such announcements as holidays, suggestions to teachers etc. appear. A glance at the Notice Book gives an outsider a correct idea of how the school is running or being run. It is an index to the movements and activities of the school. Glance over a dozen notices at random, and you can feel the pulse of the school. The official code requires that we should maintain the punishment book, but in a well disciplined school, its pages are more or less blank.

Supervision is another important duty of the Head-Master. It includes class-to-class visits, watching the lessons, giving hints and suggestions to teachers and entering notes in the Log Book—every Head-Master should maintain this as a record of the daily doings of interest, the results of educa-

is neccessary. The Head-Master must also be magnanimous and noble-minded. He must have a broad outlook. He must have a little bit of introspection and feel for the difficulties of others. He must be sympathetic and advocate the cause of the Assistant-Masters if necessary, and redress their grievances, if they are genuine. He must be cool, collected, and peace-loving and not create scenes himself nor allow scenes to be created. By moral suasion, the most refactory teacher may, in most cases, be overcome and the most wayward and unbridled boy brought under control.

The Head-Master should be a person in whom the sense of morality is highly developed. By action he must give tangible proof of his being not only the master of masters, but master of morality as well. His morality must be catching. He must give a moral tone to the staff. His moral tone should pervade the students. Like a spring, it must percolate through the layer of teachers and then on to the vast mass of students, so that every boy receives the moral baptism unseen to the naked eye but visible to the eye of the heart.

The Head-Master must be a child-psychologist and get to know the likes and dislikes, leanings and proclivities of boys. These are of the highest importance, for not only is instruction made more psychological, but the discipline of the school is improved.

By way of recapitulation, permit me to quote Mr. R. A. Lamb who says " For the making of the head of the school, whether master or mistress, there are required many qualities : knowledge, the art of imparting knowledge, experience, tact, the art of managing children, and so on. But the union of all these qualities, though it may produce a good master or mistress, does not suffice to make one of the very first class. To make the perfect head of the school, there is needed, in addition to all these, a quality which is undefinable and which resides in the personality of the

is more, should, by example, be able to breathe this spirit into the school. The most successful Head-Master is he who can send "duty" waves or messages to his assistants, without the aid of a transmitter or receiver. The atmosphere of the school should be so surcharged with duty waves that the most lethargic new arrival in the staff would be unwittingly galvanised into action. The Head-Master should not countenance inaction in and around the school. Another qualification which the Head-Master should possess is that he must be an experienced man, a superior man of learning, far above his subordinates, comparatively more learned than the most learned in the staff, a man of encyclopaedic knowledge, a walking dictionary and a living reference book. The Head-Master must have tact, orginality, resourcefulness and initiative to solve knotty school problems which face him off and on. He must have great organising powers. He must be a stern disciplinarian and mete out evenhanded justice to assistants as well as boys. He must be impartial. He must be a man of strong will and determination, not fickle-minded, not oscillating between "to-do" or "not to-do". He must have sound judgment, and when once a line of action has been taken, he must not swerve from it. Unless the Head-Master is a man of strong character, the teachers as well as the taught will make him dance, and then the school discipline will be at a discount. A wax-like Head-Master, melting at the fervent but improper appeals of boys, or dancing to the tune of one or more assistants is courting trouble, and will have enough of it if he pursues the same wavering policy. The Head-Master must be sociable as well. He must move in society and must be easily accessible to boys, teachers and guardians of boys alike. He must not be very very familiar with the boys nor very chummy with the staff, for as you know, familiarity breeds contempt. Let the Head-Master love the boys, by all means, but he must, at the same time, see that they treat him with respect and a dash of awe, because, for the proper maintenance of discipline, some amount of dread

It is often asked what should be the qualities or attributes of a Head-Master. The Head-Master should be an embodiment of the perfect man. As there are artist's models, there are Head-Master's models also. To give a pen picture of the Head-Master's model is not impossible, but whether it exists in actual flesh and blood is a moot question. It is as rare as the dodo. However, we shall take a survey of what the Head-Master should be like. First and foremost, he must have a striking personality. A Head-Master without a personality is like the play of Hamlet without the Prince of Denmark or, to use an Indian parallel, a marriage procession without a bridegroom. Like the ideal bridegroom, he may be an arresting personality, good to look at. He must have no defects or deformities. A one-eyed or squint-eyed Head-Master, a short sighted Head-Master, a partially deaf Head-Master, a lame or crippled Head-Master or a stammering Head-Master can have no personality, and, if appointed, creates awkward situations, for the impish nature of boys cannot long lie dormant, and occasionally gives vent to mimicry. A naturally defective Head-Master cannot brook to see himself rehearsed near the out-houses, in the dormitories, or on the playgrounds. He must not be very short or undersized. A pigmy 4' 5" Head-Master never creates a favourable impression on the boys. He is submerged in the boy-crowd and remains unnoticed. He does not come into the limelight. A Head-Master should be a towering personality. He must, Mt. Everest-like, tower high over the Goodwin Austins, Kinchinchangas, Dhavalagiris, and Nangparbats of the High section staff, longitudinally as well as intellectually, not to speak of the out-Himalyan hillocks of the preparatory section. Personality is a wide comprehensive term baffling definition, and includes many traits of man, from charming manners to strength of character. Next to personality, the Head-Master should have a high sense of duty ingrained in him. In fact, he should be an *avatar* of duty or duty personified, and what

The qualities of the Head-Master.

persuasive eloquence, he may sway the staff and students to his side. He must be a picture of health, so that he may be active and energetic and full of go and vitality. Nobody likes a pale sickly or seedy and warty Head-Master, crawling with a snail's space. The Head-Master must be a bundle of nerves, more active than the most active member of the staff. By exercise and clean life he must maintain and preserve his health. To these god-given gifts may be supplemented human experience—his own as well as that of others—which includes the chiselling and polishing given in training colleges. Before entering the portals of a training college, I had my doubts and misgivings regarding the efficacy of the training imparted in training colleges. I had an idea that a teacher of 10 years' standing was as good as a trained teacher. My theory was exploded the moment I joined a training college. There was first the arresting environment of the college. The actual "doing" of lessons under the nose of the supervising lecturer and the ordeal of being exposed to the fire of a criticism lesson are sensations which linger in one's memory for life. Anyhow, every trained graduate cannot but admit, in his heart of hearts, that he is more methodical and more exact and has a broader educational outlook after he leaves the precincts of the training college than he was when he entered there. To my mind, the factor of being "born" belongs to heredity and the factor of being "made" to environment. Just as heredity and environment determine a man's life, in the teacher's career also, both these count and are inseparable. There are cases in which the "born" element may be much more strikingly developed, and others in which the "made" element blossoms in all its fragrance. It is quite possible that, by dint of steady application and dogged will, a "made" Head-Master may excel a "born" Head-Master. Yet I stick to my view that the "born" *cum* "made" Head-Master is the best mosaic that will appeal to the aesthetic taste of the modern world.

The Head-Master, like the versatile actor, has to play many roles—that of the teacher, organiser and disciplinarian. He has to handle his own subject. He has to keep himself abreast of the times and be conversant with the latest educational theories and methods. He can never cry halt, for, as with human nature, there is always flux and change. The sky of educational methods is always changing more often for the better and less often for the worse. The Head-Master cannot be a fogey and a fogey should not be a Head-Master. The Head-Master must be always learning, experimenting, and following inductive and deductive methods. The conscientious Head-Master has enough to do and mind and can even create work to raise the tone and efficiency of his school. For example, in his class-to-class visits, instead of making them a sham and a show, he may closely watch the lessons of teachers and give points to inexperienced or untrained teachers and so guide and direct them that they begin to take a genuine interest in their work and rather welcome criticism than resent it. Here is an unexplored field for the Head-Master. Since the Head-Master has to maintain the discipline of the school, he is more or less occupied in issuing orders. He has to look to a hundred and one details of administration. Is not all this work? So the charge of idleness or lethargy cannot be laid at the door of the Head-Master who is true to his salt and his profession.

Is a Head Master "born" or "made"?

My answer to this question is that he is both. Inasmuch as he is endowed with certain innate gifts and characteristics, he is "born"; in view of the fact that he gets trained and profits by his own experience and that of others, he is "made". He must have sterling virtues such as love for duty, strength and purity of character, tact, resourcefulness, patience and impartiality. He must possess an imposing personality which, god-given as it is, constitute a very valuable asset to a Head-Master. If he is gifted with

THE HEADMASTER

A paper read at the Fifth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association

By

The Late Mr. SYED ZAHUR ALI, B. A., B. T.

A common fallacy refuted.

THERE is an erroneous idea or fallacy current among the non-educational circles that the moment an assistant teacher is elevated to the proud position of a Head-Master, his days of drudgery are over, and that he may spend the rest of his service in well-earned rest and take an informal holiday, having precious little to do, save walking round the classes and supervising whether the staff is working or not; sitting in the rotating office chair and signing the office papers; interviewing boys, teachers, and parents or guardians of boys; and lastly, commanding the menial staff of the school. Nothing can be further from the truth and facts. A drone of a Head-Master was never a success, was never popular and never won the public esteem; and if, as an assistant he played the role of a working bee and improved each shining hour, as a Head-Master, he must toil more and improve each shining minute, gathering the honey of new methods of teaching and organisation from the school flowers, that is, children who are committed to his care. In virtue of his being the highest paid man in the school, he should be the most hardworking man in it. Whereas, as a class-teacher, he had, under him about 30 boys, as the teacher of teachers he has, under his charge, ten times or twenty times the number. And do not increased numbers bring on increased responsibilities? Moreover, he has to deal with a number of teachers with different temperaments.

ERRATA.

Page 69	last but one line	for constitute	*read* constitutes
,, 72	line 14	for orginality	,, originality
,, ,,	,, 32	for very very	,, very
,, 76	,, 19	for supervison	,, supervision
,, 77	,, 15	for minutues	,, minutes
,, 79	,, 11	for ashieve	,, achieve
,, 81	,, 10	for will	,, mill
,, ,,	,, 24	omit bag	
,, 108	,, 22	for Naas	,, at Naas
,, ,,	,, 24	for sadlery	,, Saddlery
,, 109	,, 3	for curriculam	,, curriculum

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA No. 47.

Vol. VI OCTOBER—DECEMBER, 1931. No. 2.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M.A.,
Director of Public Instruction.

THE
HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

1. S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)
2. F. C. PHILIP, M. A.

SECUNDERABAD-DECCAN.
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1932

Annual Subscription Rs. 3.

جلد (٦) شمارہ (٣)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اردو حصہ (۱۲؎) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ذیل رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ ۸ر	ے،
نصف صفحہ	صہ،	عـا ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	عـا ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۴۱ف م جنوری ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

جلد ۶ شمارہ (۳)

افتتاحیہ

مدارس وسطانیہ میں فنی تعلیم

مقصد تعلیم کے ارتقاء مدارج پر نظر کی جائے تو پتہ چلے گا کہ جیسے جیسے زمانے کی ضروریات بدلتی گئیں ویسے مقصد تعلیم میں بھی تبدیلی ہوتی گئی چنانچہ اب جو مطمح نظر تعلیم کا ہے وہ پچاس برس پیشتر نہ تھا۔ اور جو پچاس برس پیشتر تھا۔ وہ اس سے قبل نہ تھا اسی طرح ہر ملک کے لئے ایک ہی مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ملکی اقتصادی اور سماجی حالات اور ضرورتیں اس کے تعیین میں کارفرما رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ مثلاً امریکہ میں زندگی کے کسی خاص شعبہ پر زور دیا جاتا ہے تو انگلستان میں کسی دوسرے مشاغل زندگی کو اہمیت حاصل ہے۔ جرمنی کے نظام تعلیم کو لیا جائے وہ اپنی نوع اور ترقی کی صلاحیت کے اعتبار سے اپنے ہمسایہ حکومتوں کے نظام تعلیم سے نمایاں اور ممتاز ہے۔ مگر ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم کا جو کچھ بھی مقصد رہا ہو اور اس کے تعیین میں ماہرین تعلیم نے جس قدر بھی دماغ پاشی کی ہو ایک چیز صاف اور واضح ہے کہ عوام نے ہمیشہ تعلیم کے نتائج کو اقتصادی اعتبار سے دیکھا۔ مطلب یہ کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر کسی روزگار سے لگ سکتی اور چار پیسے کما سکتی ہے یا نہیں تعلیم کا یہ "کھاؤ کماؤ" مقصد عوام کا نصب العین ہے۔ ان کی نظر میں کوئی نظام تعلیم اگر اس کسوٹی پر ٹھیک اترتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ غیر مفید اور محض تضیع وقت ہے۔ بالکل یہی حال فنی تعلیم اور دستی مشاغل کا ہے نصاب نامہ کی ترتیب کے وقت ماہرین کے پیش نظر فنی تعلیم کے جو کچھ بھی فوائد اور علمائے نفسیات کے جس قدر بھی بیش بہا اصول اور نظریے رہے ہوں اس سے ناخواندہ یا نیم خواندہ عوام کو کوئی سروکار نہیں کیونکہ فنی تعلیم ان کی اولاد کو مالی حیثیت سے مستغنی کرنے میں نہ صرف قاصر بلکہ ناکام رہی ہے۔ دوسرا طبقہ ان آدمیوں کا ہے جو طلبہ کو انشاء پردازی اور ریاضی میں طاق دیکھنا چاہتا ہے! ان کی رائے میں ادبیات اور ریاضیات کے سوا ہر دوسری چیز کی تعلیم میں وقت ضائع جاتا ہے واضح رہے کہ نصاب نامے کے ترتیب دینے والوں کا کبھی بھی یہ خیال نہ تھا کہ فنی تعلیم کے رواج دینے سے طلبہ اپنی آیندہ زندگی میں مالی اعتبار سے فارغ البال و مستغنی ہو جائیں گے مرتب کرنے والوں کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ نصاب میں ایسا تنوع رکھا جائے جس سے طلبہ کے دماغی نشوونما میں مدد ملے اور ان میں ایسے میلانات اور رجحانات پیدا ہو سکیں جن کی مدد سے طلبہ اپنے استعداد اور صلاحیت کے مطابق کشمکش حیات میں حصہ لے سکیں۔ بالفاظ دیگر مدارس ثانویہ میں فنی تعلیم کی غرض و غایت یہ ہے کہ طلبہ کی دماغی نشوونما مکمل طریقہ پر ہو۔ طلبہ کے عملی مشاغل اور ان کے دماغی قوای میں ربط ہے یہی وجہ ہے کہ زمانہ طفولیت میں لڑکے کبھی نچلا نہیں بیٹھتے ہمیشہ نوچ کھسوٹ اور چیر پھاڑ سے کام لیتے اور اپنے کھلونے وغیرہ توڑتے پھوڑتے رہتے ہیں اس سے ان کی دماغی قوت میں ترقی ہوتی ہے اور حصول علم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان حرکات سے طلبہ کو باز رکھنا اصول تعلیم کے منافی اور ان کے حق میں مضر ہے طفولیت کے دور سے گذرنے کے بعد بھی یہی لڑکپن کی حرکتیں دوسری صورت میں باقی رہتی ہیں جن کی تکمیل فنی تعلیم یا دستی مشاغل کے ذریعہ سے بخوبی ہو سکتی ہے اس کے ماسوا فنی تعلیم کی مدد سے لڑکا تھوڑا بہت اندازہ کر لیتا ہے کہ آگے چل کر کون پیشہ اختیار کروں۔ وہ معمولی سے معمولی پیشہ کو بھی وقعت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے فنی تعلیم کے رواج دینے سے مدرسے کے اوقات میں یکسانیت دور ہو کر خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور ایک دلچسپ مشغلہ طلبہ کے ہاتھ لگ جائے گا جس کی مدد سے وہ فرصت کا وقت اپنے گھر میں بہتر طریقے سے گذار سکیں گے یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر فنی تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے عوام کا یہ خیال درست نہیں کہ موجودہ فنی تعلیم آیندہ زندگی میں طلبہ کو مالی اعتبار سے بے نیاز کر دے گی۔

رپورٹ کمیٹی آل انڈیا

ابتدائی جبری تعلیم

انجمن وفاق مدرسین کے سالانہ جلسہ منعقدہ بمبئی ۱۹۲۶ء میں اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیم تمام دیہی اور شہری رقبوں میں لازمی کردی جائے اور جہاں ابتدائی تعلیم لازمی نہیں ہے۔ مقامی حکومتوں سے اس بارے میں استدعا کی جائے۔

اس کے دوسرے سال مدراس کے اجلاس منعقدہ ڈسمبر ۱۹۲۶ء میں سربراور دہ اشخاص کی کمیٹی مقرر کرتے ہوئے یہ تحریک پاس ہوئی کہ گورنمنٹ ہندوستان میں ابتدائی جبری تعلیم ۵ سال سے ۱۲ سال کے سن کے طلبہ کے لئے فی الفور رائج کردے۔

اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے مسٹر کے۔ ام سندرراؤ رادھا چاری آپ نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ڈیڑھ سو سال برطانوی حکمرانی پر یہ افسوس ناک تبصرہ ہے کہ اب ماہرین فن حکومت سے مطالبہ کررہے ہیں کہ تحتانی تعلیم جبری کردی جائے۔ جو بہت عرصہ پیشتر جبری ہوجانی چاہئے تھی مغربی ممالک میں ثانوی تعلیم جبری ہوچکی ہے۔ ہندوستان کی چیخ پکار بہت بعد از وقت ہے۔ رعایا کی استدعا محض اس قدر ہے کہ حکومت اپنے ابتدائی فرائض انجام دے جس سے افسوس ناک عدم توجہی ترقی جارہی ہے۔ اگر اقوام عالم کا مطمح نظر جمہوریت ہی ہے تو یقیناً ابتدائی تعلیم کسی ملک کے مستقبل کی تشکیل میں بے حد ضروری ہے۔

یہ تحریک بڑی شد و مد کے ساتھ پیش ہوئی کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض ارکین کمیٹی کو یورپ جانا پڑا، جس کی وجہ سے کام بروقت نہ ہوسکا اور ۲ سال کے بعد رپورٹ مرتب ہوئی جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے۔

مختصر تاریخ تحتانی تعلیم کی اہمیت کو گورنمنٹ نے ۱۸۵۴ء میں محسوس کیا جب کہ ورناکولر مدارس کو امداد دینے کا طریقہ رائج ہوا۔ اس کے ۵ سال بعد گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لئے خاص لگان عائد کیا جائے۔ جو دیسی زبان کے مدارس کی امداد کے لئے مختص ہو۔

عام تعلیم کی جانب بہت کم توجہ کی گئی اور اس معاملہ میں پبلک کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا باوجودیکہ ثانوی تعلیم کو وقتاً فوقتاً ترقی دی گئی۔ مگر تحتانی تعلیم سے وہی غفلت رہی دراں حالیکہ متعدد تعلیمی کمیشنوں نے سفارش کی جسے گورنمنٹ کی تائید بھی حاصل رہے۔

۱۹۱۱ء میں اس تحریک کو مزید تائید اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے مجلس مقننہ میں تحتانی تعلیم کا مسودہ پیش کیا اس وقت سے تحتانی تعلیم کا قانون برٹش انڈیا اور ہندوستان کے دیگر حصص میں اس مقصد کی اشاعت اور ترقی کیلئے وقتاً فوقتاً پاس ہوا بعض دیسی ریاستیں اس معاملہ میں برٹش انڈیا سے کہیں آگے تھیں چنانچہ بڑودہ کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء بڑودہ کی نشاۃ ثانیہ کا سال ہے کیونکہ اسی سال ملک کے طول و عرض میں جبری مفت تعلیم عام کر دی گئی۔

تحتانی تعلیم کے قانون کی نوعیت کچھ اس قسم کے نقص لئے ہوئے تھی۔ کہ تعلیم کو عام کرنے میں مانع ہوئی۔ انتظامی اور مالی مشکلات نے بھی جبری تعلیم کے نفاذ کو ناممکن بنا دیا۔ اس طرح یہ خطرناک قومی پستی عام جہالت کی صورت میں سارے ملک پر ڈیڑھ صدی تک چھائی رہی۔ نہیں معلوم کب تک اس مالی پستی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور فرزندان ملک تعلیم کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوئے بغیر کب تک خودرو گھاس کی طرح نشوونما پاتے رہیں گے۔ غرض کہ جہل کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے ملک پر چھایا ہوا ہے۔ اور ہر طرف بے علمی کا دور دورہ ہے جس کا لازمی نتیجہ جسمانی اور اخلاقی پستی اقتصادی اور سماجی پستی ہر جگہ عام ہے

وفاق ہند میں جیسے جیسے حقوق ملتے جائیں گے، رائے عامہ کو وقعت حاصل ہوتے جائے گی اور رائے دہندگان کے اثر و اقتدار میں بشرطیکہ انہیں شہریت کے حقوق اچھی طرح انجام دینے ہوں معتد بہ اضافہ ہونا چاہئیے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب تک کہ تیزی کے ساتھ رائے دہندگان میں روشن خیالی پیدا نہ ہو اور تحتانی تعلیم فوراً جبری اور عام نہ کر دی جائے تو یہ چیز آخر کیسے حاصل ہوگی؟ اس سلسلہ میں ہم ایک ممتاز انگریز ماہر تعلیم کی رائے درج کرتے ہیں۔

"سوشلزم کے نہ رکنے والے سیلاب میں دیسی ریاستوں کا بچاؤ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ابتدائی مدارس کو صحیح اصول پر چلایا جائے اور عوام کی تربیت پر قابو حاصل کر کے انھیں زندگی کے صحیح راستے پر لگا دیا جائے۔"

ریاست بیکانیر کے ناظم تعلیمات مسٹر ام۔ ام ورما لکھتے ہیں کہ جبری تعلیم کا قانون ناقص ہے پبلک کو خاصی آزادی حاصل ہے قانون لازمی اور جبری ہونا چاہئیے تا کہ تھوڑے عرصہ میں ملک کے طول و عرض میں عمومیت کے ساتھ تعلیم رائج ہو جائے۔ گورنمنٹ اخراجات کا ۵۰ فیصد حصہ دے اور یہ رقم مقامی حکام کی تحویل اور اختیار میں رہے تعلیمی ٹکس بھی عائد ہونا چاہئیے جسے نہایت خندہ

پیشانی کے ساتھ پبلک برداشت کرے۔

ٹکس کے ضمن میں۔ مس۔ آر بی۔ پال سینٹ جانس انگلش ہائی اسکول برما لکھتی ہیں کہ گورنمنٹ سے شد و مد کے ساتھ استدعا کی جائے کہ انکم ٹکس کا ⅓ حصہ جبری تعلیم کے لئے مختص کر دے۔

جبری تعلیم کے نفاذ کی فوری ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہماری رائے میں اس کی ضرورت ہے کہ تحتانی تعلیم مفت کر دی جائے۔ اور ضروری چیزیں نادار طلبہ کو مفت ملیں۔

ضروری قانون نافذ کیا جائے تاکہ ناگہانی مشکلات کا جو آگے چل کر پیدا ہوں گی' انسداد ہو جائے ذمہ دار حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ اس قومی تعمیر کے شعبہ کے لئے روپیہ کا بھی انتظام کرے۔ مقامی حکومتوں پر اس ذمہ داری کو منتقل کرتے ہوئے۔ ضرورت ہے کہ مالی حالت کو بھی اطمینان بخش کر دیا جائے۔

اس معاملہ میں گورنمنٹ کی بے اعتنائی پر تنقید کرتے ہوئے ہم اپنے وزرائے تعلیمات کی عدم توجہی پر بھی افسوس کرتے ہیں ہمارا یہ مقصد نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کو کسی طرح کم کیا جائے مگر ہمیں یہ کہتے ہیں۔ تامل بھی نہیں کہ اعلیٰ اور ثانوی تعلیم پر جن کا تعلق معدودے چند طلبہ سے ہے زیادہ توجہ دی گئی۔ اور لکھو کھا افراد کی تعلیم میں سرد مہری سے کام لیا گیا۔ اس معاملہ میں پبلک کی یاس انگیز عدم توجہی بھی قابل درگذر نہیں اعلیٰ تعلیم پر بلاتفریق مذہب و ملت بے غل و غش روپیہ بطور امداد ملتا ہے۔ مگر تحتانی تعلیم جیسے مبارک مقصد پر کوئی آنہ بھی رقم نہیں دیتا۔ جس کا کم سے کم ذکر ہی کیا جاسکے

نگرانی

تحتانی تعلیم بالکلیہ پبلک کے ہاتھ میں رہے۔ بلحاظ زبان ایسے بورڈ قائم کئے جائیں جو پوری نگرانی رکھیں اور ان کا انتخاب ہر تیسرے سال ہوا کرے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر پٹیل اسسٹنٹ کمشنر تعلیمات بڑودہ لکھتے ہیں کہ ریاست کی طرف سے تجربہ کیا گیا اور تحتانی تعلیم لوکل بورڈ کی نگرانی میں رکھی گئی۔ مگر اس میں سخت ناکامی ہوئی۔ لہذا ضرورت ہے کہ تحتانی تعلیم کافی مدت تک گورنمنٹ کی نگرانی میں رہے۔

عمارت مدارس

تاوقتیکہ کافی رقم کا انتظام نہ ہو مدارس کی عمارت کا مسئلہ یوں حل کیا جاسکتا ہے کہ ہر گاؤں یا قصبہ عمارت مدرسہ کے اخراجات برداشت کرے۔ قصبہ کا زمیندار زمین مفت دے اور دیہاتیوں کی امداد سے عمارت تعمیر کرائے۔ اس کے اخراجات کا تناسب یہ رہے کہ گورنمنٹ دو حصہ لوکل بورڈ دو حصہ اور مقامی پبلک ایک حصہ دے۔ اہل دہ کو یہ سمجھا دیا جائے کہ خیرات کا بہترین مصرف یہ ہے کہ روپیہ تعلیم میں صرف ہو قیمتی فرنیچر کی فوراً ہی ضرورت نہیں' کام شروع کرنے کے لئے چٹائی سے کام لیا جاسکتا ہے۔

مدرسین کی ٹریننگ اور معاوضہ باوجودیکہ برٹش انڈیا کے بعض صوبوں اور دیسی ریاستوں مثلاً بڑودہ ٹرونکور کوچن اور میسور میں ابتدائی مدارس تیزی کے ساتھ قائم ہو رہے ہیں مگر کوئی منظم کوششیں مدرسین کی بہتر ٹریننگ اور ان کے معقول معاوضہ کے لئے نہیں کی جا رہی ہیں۔ اس طرح بلحاظ کیفیت تحتانی تعلیم میں انحطاط کا سلسلہ جاری ہے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ لہذا ضرورت ہے کہ مدرسین کی ٹریننگ کے لئے سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ اور تربیت گاہوں میں ضرورت کے لحاظ سے اضافہ ہو نیز تحتانیہ مدارس بہت اچھے تربیت یافتہ اور اہل مدرس کی نگرانی میں ہوں۔

مولوی سید ظہور علی صاحب مرحوم منصرم صدر مہتمم تعلیمات نے یہ رائے دی کہ "تحتانیہ مدارس کے مدرسین میٹرک ٹرینڈ ہوں۔ اور مڈل ٹرینڈ سے تو کسی طرح کم نہیں۔ وہ پوری تنخواہ پر ٹریننگ کے لئے بھیجے جائیں اور سفر خرچ آمد و رفت کا دیا جائے۔ ہر ضلع میں تحتانیہ مدارس کے مدرسین کی ایک کانفرنس ہو تاکہ ان کی معلومات تازہ رہیں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو گرما کی چھٹی میں ریفرشر کورس کا انتظام ہو۔"

مدارس تحتانیہ کے مدرسین کی تنخواہیں۔ ان کے کام کی اہمیت اور ذمہ داری کے لحاظ سے بہت کم ہیں۔ تاوقتیکہ ان کی قوت لایموت اور ان کے متعلقین کا معقول انتظام نہ ہو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہر طالب علم کا فرداً فرداً خیال کریں گے بے سود ہے۔ تحتانی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جماعت صغیر کے لئے استانیاں مقرر کی جائیں۔ تربیت یافتہ استانیوں کی ضرورت نہ صرف طالبات بلکہ طلبہ کے لئے بھی ہے۔ صنف نازک کو طبعاً سزائے جسمانی سے نفرت ہوتی ہے۔ اس لئے طلبہ اُن کی شفقانہ نگرانی میں زیادہ مستفید ہو سکیں گے۔ اس لحاظ سے تعلیم نسواں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بحالت موجودہ ہندوستانی بیواؤں کی زندگی محض بے کار اور رائگاں جا رہی ہیں۔ ان کی خدمات کو حاصل کرنے کا ذریعہ تعلیم سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

طبی معائنہ یہ مسئلہ بھی افسران متعلقہ کو متوجہ کئے ہوئے ہے۔ مگر کوئی باقاعدہ کوشش نہیں ہوئی طبی معائنہ سال میں ایک دو مرتبہ کر کے اولیائے طلبہ کو اطلاعی کارڈ بھیج دینے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا معائنہ کئی مرتبہ ہوں۔ اور علاج کیا جانا ضروری ہے مختلف مقامات پر شفاخانے طلبہ کے لئے کھولے جائیں ہلت آفیسر اور ڈاکٹروں وغیرہ کی سب کمیٹی ہر مہینے مقرر کی جائے۔ غریب طلبہ کے لئے جنھیں پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کوئی ہلکی غذا کا انتظام وقفہ میں ہونا چاہئے۔

معائنہ مدارس تحتانیہ مدارس کے معقول معائنہ اور نگرانی کی سخت ضرورت ہے کم لیاقت اور کم تنخواہ یاب عملہ سے تحتانیہ مدارس کا معائنہ فوراً مسدود کیا جائے۔ فی الوقت سب انسپکٹر سے اوپر کوئی عہدہ دار تحتانیہ مدارس کے معائنہ کو کسر شان سمجھتا ہے۔ ہماری رائے میں بہترین افراد تحتانیہ مدارس کے معائنہ کے لئے مختص کئے جائیں۔

دیہی کتب خانہ گشتی کتب خانہ اور بے بی سینما ہر قصبہ میں بھیجی جائیں۔ تاکہ ناخواندہ اشخاص میں ان کے ذریعہ سے روشن خیالی پیدا کی جاسکے۔ جو دلچسپی ان کے ذریعہ سے پیدا ہوگی اور جو فوائد دیسی زبان سے حاصل ہوں گے۔ اس سے تمام مخالفت اور مغائرت دُور ہوجائے گی۔

جبری تعلیم کی انتہائی عُمر جبری تعلیم کی انتہائی عمر وہی ہونا چاہئے جو کارخانوں میں کم سے کم رکھی گئی ہے یعنے بارہ سال بمبئی کی مجلس مقننہ میں ایک بل پیش کیا گیا ہے، جس کی رو سے قانون تعلیم تحتانیہ میں حسبہٗ ترمیم کی جا رہی ہے۔

میجک لینٹرن ہر مقامی حکومت کا یہ خوش گوار اور مبارک فریضہ ہونا چاہئے کہ ہر قریہ میں طلسمی فانوس کا مفت انتظام کرے۔ یہ کام ایسا ہی نیک ہونا چاہئے جیسے کہ مدرسہ کا قائم کرنا سوشل سرویس لیگ، پُسرنس سوسائٹی اور وائی ام سی۔ اے جیسی انجمنیں اس کام کو اور وسعت دیں۔

خانگی کمپنیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے فائدہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھیں کہ سینما کے ذریعہ عوام کی تعلیم ہو۔ اگر بولتے فلم اور سینما دیہات کے لئے زیادہ قیمتی متصور ہوں تو طلسمی فانوس سے اچھی طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے اخراجات بھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اور نہ اس کے لئے عملہ کی ضرورت ہے۔ قصبہ کے مدرس سے یہ کام بآسانی لیا جاسکتا ہے۔

طالبات کی تعلیم ہماری لڑکیاں تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کی شادی جلد کردی جاتی ہے اور وہ ایسے سن میں مائیں بن جاتی ہیں جب کہ انھیں مدارس میں زیر تعلیم ہونا چاہئے تھا۔ اُن کے جہل سے قطع نظر نہ اُن کو سینا آتا ہے، نہ گانا ہی جانتی ہیں۔ اور نہ ڈرائینگ سے واقف ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ امور خانہ داری سے واقف ہوئے اور زیور علم سے آراستہ ہوئے بغیر صاحب خانہ بنادی جاتی ہیں۔ ایسی ماؤں سے جو جہل کی تاریکی میں گھری ہوئی ہوں، کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کرسکیں گی۔

اوقات مدرسہ

ہارٹوگ کمیٹی نے موسمی ضروریات کے اعتبار سے اوقات میں ردوبدل پسند نہیں کیا کمیٹی کی رائے میں چھوٹے بچوں کے لئے دن کا وقت گذارنے کے لئے اگر کوئی بہتر جگہ ہوسکتی ہے تو وہ عمارت مدرسہ ہے۔ ایسے ابتدائی مدارس جس میں ایک ہی مدرس کام کرے کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ مگر چونکہ ۶۰ فی صد مدارس اسی قسم کے ہیں۔ لہذا ہم اس طریقہ کو فی الحال مسدود نہیں کر سکتے ہیں۔

مدت تعلیم اور نصاب

تحتانی تعلیم کے نصاب نامہ میں جن مضامین کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ صرف تین یعنے لکھنا پڑھنا اور حساب ہیں ایک حد تک جغرافیہ اور تاریخ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ ابتدائی سائنس کی تعلیم حالانکہ نصاب نامہ کا ایک جزو ہے باقاعدہ نہیں ہوتی یہی مضمون ڈرائنگ اور زراعت کا بھی یہی حال ہے۔ غرض کہ موجودہ نصاب بہت ہی پرانا ہے گھریلو صنعتوں اور عملی شعبوں سے سخت بے رخی سے کام لیا جا رہا ہے طلبہ کو فقط پڑھنا لکھنا اور حساب سکھایا جاتا ہے، یعنے تعلیم محض کتابی ہوتی ہے جس کا تعلق محض حافظہ سے ہے حواس کی تربیت مشاہدہ اور تخیل کی ترقی یکسر نظر انداز کی جا رہی ہے۔ تحتانی تعلیم کی مدت بجائے ۴ سال کے ۷ سال ہونی چاہیئے۔

ذیل میں تحتانی تعلیم کے نصاب کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس میں ضروری ردوبدل مقامی ضروریات کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔

(۱) سیاست مدن اور اخلاق — (۲) حساب — (۳) تاریخ — (۴) موسیقی — (۵) تربیت جسمانی (بشمول جمناسٹک) — (۶) ڈرائنگ اور پینٹنگ — (۷) باغبانی اور زراعت — (۸) دستی مشاغل اور مقامی گھریلو صنعتیں — (۹) تربیت اخلاق یا امور خانہ داری اور سائنس — (۱۰) دیسی زبان — (۱۱) جغرافیہ — (۱۲) ابتدائی سائنس —

نصاب نامہ خاصہ لچکدار ہو تاکہ مقامی حالات کے لحاظ سے حسب حال ضروری تفصیل کا انتخاب ہوسکے درسی کتب بچوں کے نقطہ نظر سے لکھی جائیں جو ان کے فہم و استعداد کے مطابق ہو۔

تحتانی تعلیم کا جبری نفاذ

باوجودیکہ جبری نفاذ کی ضرورت ہر جگہ تسلیم کر لی گئی ہے مگر ابھی پوری طرح جبری نفاذ عمل میں نہیں آیا۔ سب سے زیادہ کامیابی پنجاب میں ہوئی بعض ریاستوں نے بہت کافی پیش قدمی کی ہے۔ مگر اب بھی بہت پیچھے ہیں کوئی اسکیم جبری تعلیم کی کامیاب نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ سرمایہ وافر نہ ہو اس کا انتظام ایک حد تک حکومت کرے اور کچھ ٹیکس کے ذریعہ ہو۔ اس کے علاوہ مقامی ذرائع سے کہ سرمایہ فراہم کیا جائے

عبدالنور صدیقی

ذیلی جلسے

اس عنوان کے تحت حیدرآباد ٹیچر کی پچھلی اشاعت میں وفاق مدرسین ہند کی سالانہ کانفرنس منعقدہ بنگلور کے اہم مضامین اور مباحث کا خلاصہ پیش کیا جاچکا ہے باقی مضامین کا لب لباب قارئین حیدرآباد ٹیچر کی دلچسپی کی خاطر اس اشاعت میں بھی پیش کیا جاتا ہے سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو حیدرآباد ٹیچر جلد ۶ شمارہ ۲۔

فطرت اطفال اور اُن کی ضرورتیں

مس ام اے۔ رابنس بنگلور نے بحوالہ جی اسٹینلی ہال کہا کہ موجودہ زندگی کی ہماہمی میں اگر ہمیں اپنی تہذیب و شائستگی دکلچر) کو آگے چلانا ہو تو بجز اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ طفلی کے صحیح اور فطری ضروریات کا علم حاصل کیا جائے۔ یہ ہم پر لازم ہے کہ دَورِ طفلی کو سمجھیں، اس کی ضروریات کو معین کریں پھر ویسا انتظام عمل میں لائیں۔

فطرت اطفال بے حد پر فریب ہے۔ ہر لڑکا ایک ایسا فرد ہے جس میں استعداد اور صلاحیت ہے، خواہشات ہیں تمنائیں ہیں اور انکا اپنا ذوق ہے۔ اگر جماعت میں ۵ لڑکے ہوں تو کوئی ایک بھی کسی ایک اصول یا قاعدہ کے تحت کام نہیں کرے گا۔ جو شخص اس کا دعوی کرے کہ میں نفس اطفال کے ہیر پھیر سے واقف ہوں تو یہ دعوی غلط ہوگا بخلاف اس کے فطرت اطفال نے سب کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔

ایسی حالت میں فطرت اطفال کو سمجھنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ طریقہ یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا اپنے کو بچوں کی سطح پر لے آئے۔ بچوں کی جبلت ان کے تقاضائے فطری کو پورا کرتی ہے۔ وہ کب کھائیں کب سوئیں اور کب کھیلیں ان کی زندگی کی تین اہم چیزیں ہیں جس کی تکمیل جبلت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ بڑوں کی جانب سے ان کے نظام العمل میں مداخلت ہو تو وہ اس کو کم و بیش محسوس کرتے اور بڑوں سے سرکشی بھی کرنے لگتے ہیں وہ مداخلت بیجا سے بچنے کی خواہش میں حیلہ سے کام لینا شروع کردیتے ہیں بغرض کہ بچے کیا ہیں چھلاوا ہیں کبھی ہنس پڑے تو کبھی رو دئیے۔ اور بھی بہت سی باتیں ان کے متعلق کہی جاسکتی ہیں۔ اگر یہی دو باتیں اور ان سے جو پیچیدگیاں پیدا

ہوتی ہیں پیش نظر رہیں اور ان کے معاملات کو ہمدردی، سمجھ اور خندہ پیشانی سے دیکھا جائے تو دورِ طفلی کی بہت ہی اہم ضروریات پوری ہوں گی۔

تربیت اطفال اس رجگناوہن صاحب سید اپیٹ نے اس عنوان کے تحت اپنے خیالات یوں ظاہر کئے کہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ نہ صرف اولیائے طلبہ بلکہ ماہرین فن کو بھی متوجہ کئے ہوئے ہے تعلیم اصل میں بمصداق "اطلبو العلم من المہد الی اللحد" گہوارے سے شروع ہوتی ہے۔ اب تک بزرگ خاندان بچوں کی تعلیم کا خیال رکھتے تھے مگر اب ایسی ہستیوں کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے۔ ماں اور باپ گو دل سے اپنی اولاد کو چاہتے ہیں مگر انہیں اس قدر وقت نہیں ملتا کہ اپنے بچوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے وقت دے سکیں

چھوٹے بچوں کی تعلیم کا مسئلہ اب ایسا نہیں رہا کہ ہر کس و ناکس بلا معلومات حاصل کئے رائے زنی کر سکے کیونکہ علمی حیثیت سے اس خصوص میں کافی تحقیق ہو چکی ہے معمولی خاندان کے بچوں کی نگرانی دوسروں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ ان کے لئے نرسری اسکول نعمت غیر مترقبہ ہوں گے اگر طفولیت کے دور میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کی گئی تو نرسری اسکول سے آگے تحتانیہ مدارس میں بھی تعلیم جاری رکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ اس طرح تحتانی تعلیم میں بلحاظ کیفیت اور کمیت ترقی ہوگی۔

چھوٹے بچوں کی تعلیم کے بعض مثالیں گھروں میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً لوریاں اور قصے وغیرہ ضرورت ہے کہ ایسی قصوں اور لوریوں کو جمع کر کے منظم کر دیا جائے۔ ۵ سال سے کم عمر کے طلبہ کے لئے شفقی جماعتیں ٹریننگ اسکول اور کالجوں میں قائم کی جائیں تاکہ مشاہدہ اور تجربہ کا کافی موقع مل سکے۔ نرسری کلاسوں کو، جو صحیح اصول پر چلائے جا رہے ہوں تسلیم کیا جائے اور جو لوگ سوشل سرویس وغیرہ میں کام کر رہے ہوں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

طالبات کے لئے تعلیم خانہ داری چونکہ ہندوستانی تہذیب قصبات اور دیہات کی معاشرت کا نتیجہ ہے اور ہندوستان کی آبادی بھی زیادہ تر دیہی ہے اس لئے ہمارا تعلیمی مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔ اہل شہر کی ضروریات کے مقابلہ میں اہل دہ کی ضروریات کو نصاب نامہ میں ترجیح دی جائے۔ نظام تعلیم کی ترتیب میں بچوں کے لئے زراعتی پہلو پر اور لڑکیوں کے لئے امور خانہ داری پر زور دیا جائے ہماری موجودہ پریشانیاں اور مصائب، ہمارا دکھ درد، بچوں کی کثرت اموات اور وضع حمل کے سلسلہ میں غریب ماؤں کی قبل از وقت موت وغیرہ یہ سب روشن خیالی اور تعلیم خانہ داری کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ہر لڑکی کو خواہ اس کا تعلق اعلیٰ طبقہ سے

یا ادنیٰ سے امور خانہ داری کی تعلیم حاصل کرنا چاہئے طالبات کے موجودہ نصاب میں امور خانہ داری جیسے لازمی جز کا اضافہ ہو۔ جو پکوان دھلائی رنگائی، سوزن کاری، خیاطی، صفائی مکان وغیرہ پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ نگہد اشت اطفال گھر کا حساب کتاب، تیمارداری اور جسمانی صفائی وغیرہ جیسے اہم مضامین کا بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ چونکہ ننانوے فیصد طالبات ثانوی اور فوقانی تعلیم کے بعد بے جا رسم ورواج کے باعث تعلیم کو خیرباد کہتی ہیں اور امور خانہ داری ہی ان کی زندگی کا مشغلہ ہے۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ طالبات کی عملی تربیت کا انتظام جلد سے جلد کر دیا جائے۔ تاکہ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ وہ اس قابل بھی ہو جائیں۔ کہ آیندہ زندگی میں اپنے جسمانی دماغی، اخلاقی اور عملی قوائے خوابیدہ کو جگا کر کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ ایسے لائحہ عمل پر زور دینے کی ضرورت ایسے زمانہ میں تحصیل حاصل ہے جب کہ قومیت کے تشکیل کے ذرائع زیر غور ہیں۔ قومی ترقی کی رفتار کو دھیما کر کے نہ حکومت اور نہ مصلحان قوم اس اہم مسئلہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں (منہج کمار پا میسور)

شباب کے خواب

خواب محض اتفاقی یا بے نتیجہ چیز نہیں ہے۔ وہ دیکھنے والے کی شخصیت کا ایک جزو ہے فرویڈ کا اختلاف یہ ہے کہ لاشعوری کیفیت اگر بالکلیہ نہیں تو ایک حد تک ضرور دبے ہوئے۔ شہوانی خواہشات اور رجحانات پر مشتمل ہے اس طرح خواب کی ترکیب شہوانی ہوی۔ نفسیات کے دوسرے ماہر اس نظریہ کو نہیں مانتے ہیں۔

خواب قوم کے افکار وخیالات کو ظاہر کرتے ہیں (جنگ) وہ ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ مکڈوگل کا خیال ہے کہ بیداری کے خیالات کو نیند کی حالت میں دیکھنے کا نام خواب ہے۔ خواب کا تجزیہ کرنے والے ماہر اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں۔

نوجوانوں کے خواب سے خوف، عدم تیقن اور فکر ظاہر ہوتی ہے بہتیرے نوجوانوں کے خواب سے جب کہ وہ نئے دور میں قدم رکھتے ہیں، دہشت ظاہر ہوتی ہے ہوا میں اڑنے کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ اور ان سے تخیل کی نگری میں بھاگ نکلنے کی کوشش بھی ظاہر ہوتی ہے ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ بڑے بڈھے جو معاملات کو سمجھتے ہوں شفقانہ انداز میں نوجوانوں کی رہبری کریں۔ اس کے لئے تھوڑی بہت علمی تحقیق اور معلومات کی ضرورت ہے۔ خواب کی شہوانی ترکیب سن بلوغ کے بعد کے زمانہ میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے (وی۔ ستھیو دہاڑواڑ)

تعلیم نسواں کے نصاب کی دوگونہ نوعیت

کچھ عرصہ پیشتر شادی کے لئے ہر جگہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ تھی۔ اب تعلیم یافتہ لڑکیوں کی خواہش کرتے ہوئے

(*) ...... BIFURCATION کا مفہوم ادا کر دیا گیا ہے)

لوگ ڈرتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے دو قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ آیندہ زندگی میں وہ ناکام نہ رہیں۔ تقریباً ½ لڑکیوں کے لئے خانہ داری کی تعلیم و تربیت ضروری ہے جن لڑکیوں کی مالی اور دماغی حالت نیز دوسرے حالات موافق ہوں وہ لڑکوں کی طرح آگے تعلیم جاری رکھیں بصورت ثانی ضروری تعلیم کے ساتھ امور خانہ داری میں بھیں طاق کردیا جائے۔ اس لئے دو قسم کے نصاب کی ضرورت طالبات کے لئے شدید ہے۔

تعلیم ریاضی کا اعلیٰ مقصد ریاضی کی تعلیم جیسی کہ ہمارے مدارس اور کالجوں میں ہورہی ہے اسکا مقصد فائدہ رسانی یا جلب منفعت ہے ریاضی کا مقصد جب تک وسیع اور تہذیب و شائستگی (کلچر) کا حامل نہ ہو فائدہ بخش نہ ہوگا۔ ریاضی کی تعلیم سے انتہائی عدل و انصاف کی صنعت جس میں کوئی لگاؤ ذاتیات کا نہو، بہتر اور موثر طریقہ پر پیدا ہوتی ہے۔ ریاضی کا مدرس اپنے شاگردوں کو بتائے کہ ریاضی دان کا ذہن کیسے کام کرتا ہے، اس کے تخیلات کی کیا نوعیت ہوتی ہے اور جمالیاتی احساس کیسا ہوتا ہے۔ اس کے شاگرد گیلیلو کے قول کو سمجھیں کہ قدرت کا عظیم الشان کارنامہ ریاضی کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ یہ محسوس کریں کہ ریاضی ہی ایسا فن ہے جو ہمیں غور و فکر کرنا سکھاتا ہے۔ اور یہی فن حصول علم میں مشعل ہدایت کا کام دیتا ہے جدید تحقیقات اور انکشافات سے کافی طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ کائنات کی داغ و بیل ڈالنے والا سب سے بڑا ریاضی دان ہے۔ ریاضی کی کوئی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ طلبہ میں یہ ذوق پیدا نہ ہو کہ تاریخ ریاضی کے مطالعہ سے بلند خیالی پیدا ہوتی ہے۔

(مسٹر کرشنا سوامی)

تعلیم ڈرائنگ ہندوستانی مدارس میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ڈرائنگ کا ایک ایسا دلچسپ اور مفید نصاب تیار کیا جائے جس سے صحیح معنوں میں ترقی ہو اور طلبہ میں اس کے سیکھنے سے مسرت اور جوش پیدا ہو۔

(۱) ڈرائنگ سکھلانے کا یہ مقصد ہے کہ طلبہ کو کاغذ پر مختلف شکلیں پیش کرنا آجائے اس کی ضرورت انھیں آیندہ زندگی میں ہوگی۔

(۲) صحیح مشاہدہ کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ نقاشی کی مشق میں ہاتھ کی مہارت کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ مشاہدہ کی۔

(۳) تعلیم ڈرائنگ کا بڑا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اپنی اختراعی قوت کے اظہار کا موقع

ہندوستانی مدارس میں تعلیم ڈرائنگ کی اس حیثیت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

(مس۔اے۔اس۔ہلیر مدراس)

تحتانی تعلیم کا مقصد اور اس کے طریقہ

تحتانی تعلیم کا مقصد صاف طور سے معین ہونا چاہئے جس سے ہر لڑکا مفید شہری بن سکے۔ اس کی سیرت اچھی ہو اور وہ بآسانی تحریر یا تقریر کے ذریعہ تبادلہ خیالات کر سکے۔ اپنی تندرستی کا اسے خیال ہو اور سیر و تفریح کی قدر و قیمت جانے۔ اس کے علاوہ وہ عملی انسان ہو تحتانی تعلیم کا وسیع مقصد یہ ہوگا کہ طلبہ کی شخصیت کو با مقصد بنائے یہ نہیں کہ وہ بے مقصد خود کار automatism آلہ بنا رہے۔

ہندوستانی مدارس میں جو ناقص طریقے رائج ہیں اُن کی اصلاح کے لئے مندرجہ ذیل مشورے دئے جاتے ہیں۔

۱۔ طلبہ کے فطری رجحانات کے مطابق کام کیا جائے۔

۲۔ ہر لڑکے کی شخصیت کی وقعت کی جائے۔

۳۔ ہر لڑکے کو اس کا موقع دیا جائے کہ مدرسہ کے کام میں وہ اپنا کوئی مقصد یا نصب العین تجویز کرے۔

۴۔ طلبہ کی مدد کی جائے کہ وہ مدرسہ ہی سے زندگی کے کاروبار میں عملی حصہ لینا شروع کردیں

۵۔ تلاش حق، مطالعہ اور آزادی کے معاملہ میں ان کی رہبری ہو۔

۶۔ وہ زمانہ آگیا کہ جور اُستاد بہ زمہر پدر کے مقولہ پر کام کیا جائے۔ جماعت میں استاد کے مشفقانہ برتاؤ کی ضرورت ہے۔

۷۔ طریقہ تعلیم وغیرہ کے لئے مدرسین کو با قاعدہ علمی تحقیقات کا موقع دیا جائے۔

ڈاکٹر میسن اول کاٹ۔ ویلور۔

عبدالنور صدیقی

بڑودہ کے کتب خانے

از نیوٹن موہن دت ۔ اف ۔ ال ۔ اے کیوریٹر اسٹیٹ لائبریریز

طبقہ تحتانیہ کی تعلیم کے ہر پہلو سے وہی شخص کما حقہٗ واقف ہو سکتا ہے جو کتب خانہ کا دلدادہ اور مطالعہ کا عادی ہو حصول علم (لکھنا پڑھنا) کے لئے عوام کا خیال یہ ہے کہ قوائے ذہنی کام میں لائے جائیں۔ چنانچہ جس نتیجہ پر وہ پہنچے ہیں۔ یہ ہے کہ حصول علم کا ذریعہ کتب ہیں ایک تہذیب یافتہ حکومت غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ جب حصول علم کے لئے کافی ذخیرہ موجود ہے اور نیز ہر شخص جو کتب کے مطالعہ سے اپنی ذات اور ابنائے جنس کو مستفید کرنا چاہے۔ وہ بلا کسی مزید وقت کے مستفید کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس امر کی کوشش کرے کہ اس کے برادران وطن علم سے بہرہ ور ہوں تو اس پر لازم ہوگا کہ ذخیرہ کتب کو کام میں لائے۔ ورنہ اس کا فعل جرم نہیں تو صریح غلطی ضرور ہوگی۔

موجودہ تعلیم کا نصب العین کتب خانوں کی ترقی کا مسئلہ اپنے اندر خاص اہمیت رکھتا ہے تعلیم کے نظر کرتے ایک زبردست کام کی تکمیل کرے گا اور اس کا حل کہیں زیادہ فائدہ بخش ہوگا بہ لحاظ ان فوائد کے جو بحالت موجودہ کتب خانہ کے استعمال سے حاصل ہو رہے ہیں تعلیم یافتہ حضرات اس امر کی سعی بلیغ کر رہے ہیں کہ تعلیم حقیقی معنی میں موجودہ حالت سے کہیں بہتر ہو۔

مدرس کی ضروریات اگر ایک مدرس بلحاظ قوت گویائی صرف ایک بولتا ہوا گراما فون نہیں ہے بلکہ طلبہ کی علمی زندگی پر حقیقی طور پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے تو اس کا فرلضیہ ہوگا کہ اپنی زندگی کی چار دیواری میں مثل ایک مشعل کے روشن رہے اور اپنے اقوال و افعال سے عوام میں تالیف قلوب کرتا رہے۔ اس اہم کام کی تکمیل کے لئے اس کو ایک عمدہ کتب خانہ کی ضرورت ہے جہاں وہ کتب تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر سکے اور ان کو مشعل ہدایت بنائے۔ یہ کتب نصاب تعلیم سے جدا تو ہوں مگر بچوں کی دلچسپی سے خالی نہ ہوں۔

ہز ہائینس مہاراجہ بہادر گائیکواڑ نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو آپ نے

پہلے اپنے ملک اور اپنی عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر تعلیم کو لازمی کیا۔ اس روشن ضمیر والی ریاست نے ملک کے بعض مخصوص حصوں میں جبری تعلیم کی بنا رڈالی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی سال میں سارے ملک میں تعلیم عام ہوگئی۔ پھر یہ معلوم کرکے کہ نونہالان ملک کا کثیر حصہ ہنوز تعلیم سے بے بہرہ ہے جس کے سبب ان کی عمر و دولت ضائع ہو رہی ہے تو فکر دامن گیر ہوئی کہ اس مسئلہ کے حل کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ چنانچہ سفر امریکہ (من ابتدائے ۱۹۰۶ء لغایتہ ۱۹۱۰ء) کے زمانہ میں آپ نے اس مسئلہ کا حل دریافت فرمالیا۔ تعلیمی دلچسپی کی خاطر آپ نے حکم دیا کہ ملک میں کتب خانوں کو رواج دیا جائے اور مغربی ممالک کی طرح علمی ذوق و شوق کے لئے منظر عام پر لائے جائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں سرکاری امداد سے قصبوں اور دیہات میں عامتہ الناس کے لئے کتب خانے کھولے گئے۔

ملکی کتب خانوں کا رواج حکومت کی امداد و اعانت کی بدولت پانچ سال کے قلیل عرصہ میں کتب خانوں کی تعداد ۴۲ سے ۷۴۴ تک پہنچ گئی جن کا تعلق راست حکومت سے ہے۔ سال گذشتہ ان کا سرمایہ ۵۵۰۵۵ روپئے تھا اس کے علاوہ ۳۲،۲۰۰ روپیہ کتب خانوں کو بطور امداد ملتا ہے۔

ملکی شاخ کتب خانہ اندرون ملک کتب خانوں کی شاخیں گشتی کتب خانہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان گشتی کتب خانوں میں کتب کی تعداد ۸۰،۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے جن کے منجملہ سال گذشتہ ۶۷،۵ کتب اضلاع کے مختلف حصص میں تقسیم کی گئیں۔ ان گشتی کتب خانوں کے لئے لکڑی کے صندوق نہایت مضبوط بنے ہوئے ہوتے ہیں جن میں ۱۵ سے لے کر ۴۰ تک کتب رکھی جاتی ہیں۔ ان کی تقسیم ہر کتب خانے۔ مدرسہ۔ کارخانے۔ اور دوسرے مطالعہ گھروں میں بہ توسط مہتمم کتب خانہ کی جاتی ہے۔ جو اپنے مرکزی علاقہ کا ہر طرح ذمہ دار ہوتا ہے بعض کتب مثلاً متعلقہ زراعت یا اناث وغیرہ یا دوسری خاص کتب مصنفہ ٹیگور یا اور کتابیں کسی خاص حصہ ملک کی مخصوص ضروریات پوری کرنے کے لئے ہوں تقسیم کی جاتی ہیں۔

ہدایتی سکشن دوسرا حصہ ہدایتی سکشن کا ہے جس کا کام یہ ہے کہ مختلف اضلاع میں سینی میٹو گراف اور میجک لینٹرن کے ذریعہ غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی کرے ابھی حال کا ذکر ہے کہ یہ جماعت سیانیٹری کمشنر کے تحت کر دی گئی ہے اور اس کا کام یہ قرار پایا ہے کہ خاص تجاویز کے تحت قصبوں کے حکام کے ساتھ اتحاد عمل کرکے سر رشتہ حفظان

جات کی تجاویز کو کامیاب بنائے

دیہات اور قریوں کے کتب خانے

ملکی کتب خانوں کی شاخوں کا انتظام اور مناسب تقسیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے جب کسی حلقہ میں ایک سو یا تین سو یا سات سو رقم جمع ہو جاتی ہے تو اس محصلہ رقم کے برابر حکومت اس کی امداد کرتی ہے اور اس قدر رقم کمیٹی کے ارکان کی جانب سے بطور اعانت دی جاتی ہے بعض مواقع پر محکمۂ صفائی کی طرف سے بھی ایسی رقومات جمع کرکے کتب خانوں کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ اگر کسی کتب خانہ کو مطالعہ گھر کی ضرورت پڑتی ہے تو اس صورت میں مشخصہ رقم کا تیسرا حصہ ادا کیا جاتا ہے اور باقی رقم حکومت اور کمیٹی کے خزانے میں جمع کردی جاتی ہے جس کے بعد مقامی کمیٹی نئے قریہ کیلئے ۲۵ روپیوں میں ان کتب کا ذخیرہ خرید سکتی ہے جو ایک سو روپیہ کی مالیت سے کسی طرح کم نہیں ہوتا اور مابقی رقم کی پابجائی حکومت کی جانب سے ہوا کرتی ہے

دیہی کتب خانوں کے انتظامات

حکومت کی جانب سے اس قدر فیاضی کے بعد عوام بہ رضا و رغبت تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ ریاست کے موجودہ ۵۴ قصبوں اور ۶۹۸ قریوں میں عوام کے لئے کتب خانے قائم کئے گئے ہیں۔ جن میں کتب کی مجموعی تعداد ۶۰،۷،۲،۰و۵ ہے اور گشتی کتب خانوں میں تعداد کتب ۲۷۹و۶ او ۳ تک پہنچ گئی ہے۔ ان کتب خانوں میں مطالعہ کنندگان کی تعداد ۸۰۷و۶۲ ہے۔ ۱۹۶ ایسے دار المطالعے قائم کئے گئے ہیں جن میں صرف رسالے اور اخبار ہی آتے ہیں۔ ان کتب خانوں کا انتظام ایک کمیٹی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جس کا انتخاب چندہ دہندگان کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔ یہ کمیٹی حسب قواعد مقررہ چندہ جمع کرتی اور فارمس کی خانہ پری کے بعد باضابطہ روئیداد مرتب کرکے صدر مرکز پر روانہ کرتی ہے کمیٹی مذکور صرف اپنی حدود کی حد تک کام نہیں کرتی بلکہ دیگر کتب خانوں کی متعلقہ کمیٹیوں کی بھی ممکنہ امداد کرتی اور عوام میں علمی اور عملی ترغیب و تشویق پیدا کرتی ہے۔ ملکی اخبار جو شایع ہوتے ہیں ان میں نئی تالیف یا تصنیف کردہ کتب کی فہرستیں چھپتی ہیں۔ جن میں نئے قواعد وضوابط بھی درج ہوتے ہیں۔ چنانچہ حالیہ شایع شدہ فہرست میں ۸۰۰۰ بہترین گجراتی کتب کا اندراج ہے۔ یہ کتب ان طلبہ کی تالیف یا تصنیف ہیں جنہوں نے امتحانی مقابلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

دوسرا اہم کام جو اس کمیٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ اتحاد پیدا کرنا ہے چنانچہ اسی

اتحاد کا نتیجہ چندہ کی فراہمی ہے جو ملک کے عرض و طول میں وصول کیا جاتا ہے نیز کارکنان و معتمدین کتب خانہ موسم بارش میں اور دوسرے موقعوں پر جملہ کار پردازان کتب خانہ کے ساتھ شہر بڑودہ میں جمع ہو کر تبادلہ خیالات اور اہم معاملات پر غور کرتے ہیں۔

سررشتہ تعلیمات نے حال میں ایک مختصر نصاب بدیں خیال تیار کیا کہ ملک و قوم کی اعانت کرنے والے اور اپنے مدارس میں اعزازی حیثیت سے کتب خانے کے کام انجام دینے والے اس کی مدد سے اپنے حلقہ میں مفید ثابت ہوں اور مفوضہ کام عمدگی سے انجام دیں۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک جلسہ مع نمائش تعلیمی منجانب صدر انجمن کتب خانہ منعقد ہوا جس کے پانچ سال تک سالانہ جلسے برابر ہوتے رہے جو ملک کی ترقی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے نتیجہ یہ نکلا کہ دیگر انجمنیں بھی کافی تعداد میں کتب خرید نے لگیں اور ان کے سرپرستوں اور اراکین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب بیرونی علاقوں سے بھی انھیں امداد مل رہی ہے۔

مزید کارروائیاں موجودہ ترقی کو دیکھ کر ہز ہائینس مہاراجہ بہادر کا خیال ہے کہ ہر قصبہ میں ایک عام کتب خانہ ہر تحتانیہ مدرسہ میں قائم کیا جائے تاکہ ذکور و اناث مساوی طور پر استفادہ کریں اور یہ کتب خانہ روزانہ بارہ گھنٹے کھلے رہیں اور تقریباً ۲۰۰ اخبار ان کے نام جاری کئے جائیں۔ بازی گاہ اطفال روزانہ پانچ یا چھ گھنٹوں تک کھلی رہیں البتہ خاص تعطیلات اور اتوار کے موقعہ پر انہیں بند رکھا جائے ان کتب خانوں کے لئے ۹۲،۴۴۹ کتب مہیا کی گئی ہیں جن میں انگریزی زبان کی ۲،۰۰۰ ۵ اور باقی گجراتی اور مرہٹی کی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ۱۴،۷ ۱۳ اور کتب ۵۲۲ ۴۹ مطالعہ کنندگاں میں بغرض مطالعہ تقسیم کی گئیں جس پر ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ان مطالعہ کنندگان میں ۹۲۸ ا مدارس اور کالج کے طلبہ اور طالبات ہیں جو اپنے لائق اساتذہ کی رہنمائی سے اہم مضامین کتب سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مطالعہ کنندگان کو انتخاب کتب کا کافی موقع دیا جاتا ہے۔ شہر بڑودہ کے قابل اساتذہ نے عملی طور پر حصہ لے کر ملک کے ہونہار طلبہ کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ میٹرک سے اوپر کی جماعتوں کے طلبہ انگریزی ناولوں کا مطالعہ زیادہ کرتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے بلکہ حالیہ اور مروجہ زبان انگریزی سے بخوبی آشنا ہو گئے ہیں اس لئے کہ ایسی دلچسپ کتب کا مطالعہ ان کے اخلاق پر نصابی کتب سے کہیں بڑھ کر اثر انداز ہوا اور ان کے خیالات کو کافی وسعت بخشا ہے ان کتب خانوں میں مذکورہ کتب کے علاوہ لغات

اور سوانح حیات عام معلومات کی خاطر فراہم کی گئی ہیں۔ تاکہ اساتذہ ان کی مدد سے نہ صرف مدارس و کالجوں کے طلبہ کی رہنمائی کر سکیں بلکہ پیشہ وروں کی بھی۔ اراکین انجمن کتب خانہ سے استفسار کرنے پر وہ اپنی ترقی کا راز ظاہر کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ غیر معمولی ترقی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ نئے اخبار اور رسالے جو جاری ہوتے ہیں ان کی تقسیم کا نہایت معقول انتظام کیا گیا ہے۔

کتب خانہ اناث کتب خانہ ماہلا (Mahila) جو بڑودہ میں خاص کر عورتوں کے لئے قائم کیا گیا ہے پُر شوق مرجع عام ہے جہاں روزانہ متعدد اخبار آتے ہیں اور جہاں سال گذشتہ صدر مرکز سے بغرض مطالعہ ۲۲۰۰۰ کتب مستعار طلب کی گئی تھیں

بازی گاہ طالبات یہ ایک وسیع اور ہوا دار ہال ہے جو خوشنما تصاویر اور نقشوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں انگریزی اور ملکی زبان کی عمدہ کتب موجود رہتی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ مختلف سامان کھیل و تماشہ باجے اور پیشہ وروں کے آلات چوبی و آہنی وغیرہ موجود رہتے ہیں۔ تقریباً ۶۰ یا ۷۰ طالبات روزانہ اس بازی گاہ سے فائدہ اٹھاتی ہیں یہاں کی مہتممہ ایک تعلیم یافتہ ملکی عورت ہے جو اپنے دیرینہ تجربہ کی بنا پر موزوں و منتخب اشیاء و کتب کا ذخیرہ رکھتی ہے تاکہ کم سن و مختلف عمروں کی لڑکیاں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں مبتدی حروف تہجی اور الفاظ بنانا تصاویر نقشوں اور دیگر ذرایع سے سیکھتی ہیں۔ انہیں شوق دلانے کے لئے چھوٹی اور خوشنما اشیاء و کتب دکھلائی جاتی ہیں۔ تاکہ ان میں حصول علم و ہنر کی رغبت پیدا ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ اور طالبات کا علمی شوق برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور وہ مدرسہ یا کالج چھوڑنے کے بعد بھی اپنے مطالعہ کے سلسلے کو کتب خانہ میں ہو یا گھر پر برابر جاری رکھتے ہیں۔

تصنیف و تالیف یہ انجمن تصنیف و تالیف کا کام بھی نہایت عمدگی سے کر رہی ہے چنانچہ ہزارہا سنسکرت کتب جمع کی گئی ہیں۔ اور تالیف وغیرہ کا سلسلہ بسرپرستی ڈاکٹر بی بھٹاچاریہ پی ایچ۔ ڈی۔ جن کے تحت کئی قابل افراد ہیں، جاری ہے۔

انجمن کی مصروفیتیں صدر مرکزی انجمن کتب خانہ نے اپنا کام صرف ریاست بڑودہ کی حد تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وہ سارے ہندوستان میں اس قسم کے کتب خانوں کو رواج دینا چاہتی ہے اس کا خیال ہے کہ سارے ہند میں جہاں کہیں تعلیمی نمایش و کتب خانہ

کا افتتاح ہوا اس سے اتحاد پیدا کرے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں برٹش امپائر اگزبیش جو شہر ویمبلی میں منعقد ہوی تھی۔ اس میں ریاست بڑودہ نے نمایندگی کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۹ء میں شہر روما میں جو بین الاقوامی کتب خانہ کا افتتاح' آل ورلڈ کانفرنس آف لائبریریز کے نام سے ہوا تھا۔ اس میں بھی اس نے شرکت کی۔

رزاق منور

(مدرسہ وسطانیہ اردو شریف)

اردو مضمون نویسی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مدارس میں انگریزی مضمون نویسی کی طرح اردو مضمون نویسی کی تعلیم عمدہ اور باقاعدہ طریقہ پر نہیں دی جاتی۔ اس لئے امتحان کے موقع پر اکثر طلبہ پریشان نظر آتے ہیں اور نہایت معمولی مضمون بھی نہیں لکھ سکتے لہذا صدر مدرس صاحبان کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کے لئے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ اگر مدارس میں ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو قوی امید ہے کہ بہت جلد یہ کمزوری دور ہوگی اور طلبہ اپنا مافی الضمیر بہ آسانی ادا کرنے کے قابل ہو جائینگے

۱۔ مضمون نگار بنانے کے لئے طلبہ کو ان امور پر کاربند رکھنا ضروری ہے۔

ا۔ بہترین مستند اور مسلم الثبوت مصنفین و مولفین کی علمی اور ادبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرانا۔

ب۔ لائق اور خوش بیان مقررین کی تقاریر سنانا۔

ج۔ اور اپنے طرز تحریر کی کافی مشق کرانا۔

۲۔ مضامین لکھاتے وقت حسب ذیل امور ضرور پیش نظر رہیں۔

ا۔ مضمون نگاری کے مطلب و مفہوم اور فوائد کو طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے۔

ب۔ اقسام مضامین و حصص مضمون بخوبی تبلائے جائیں۔

ج۔ طرز مضمون نگاری ذہن نشین کرنے کے لئے الفاظ کی بندش اور ان کا صحیح استعمال۔

خوبی عبارت اور تقسیم فقرات وجملات اور تسلسل مضمون قائم رکھنے کے طریقے تبلائے جائیں۔

د۔ ہر عنوان پر مضمون لکھانے سے قبل طلبہ کے خیالات معلوم کئے جائیں بعد ازاں اساتذہ صاحبان اپنے بلند تر خیالات سے طلبہ کو مستفید فرمائیں۔

۵۔ ہر قسم مضمون اور جزوی ضرورت کے لئے چند مضامین بطور نمونہ لکھائے جائیں۔

(۳) اولاً محسوس (Concrete) اور ثانیاً مجرد (abstract) عنوانات پر مضامین لکھائے جائیں۔

۴۔ مضمون نگاری کے لئے قواعد کے اہم نکات مثلاً "نے" کے استعمال کے قواعد اور الفاظ کی تذکیر و تانیث اور روزمرہ و محاورہ کے رموز تبلائے جائیں۔

۵۔ وقت نامہ (Time table) میں مضمون نگاری کے لئے ہر جماعت میں ہفتہ میں کم سے کم ایک روز دیا جائے۔

۶۔ مضمون نگاری کے وقت تختہ سیاہ کا استعمال اس طرح کیا جائے۔

ا۔ طلبائے جماعت سے مجموعی طور پر عنوان زیر بحث پر خیالات فراہم کر کے تختہ سیاہ پر اشارے لکھے جائیں۔

ب۔ اشاروں کے ذریعہ مضمون کا ایک خاکہ تیار کیا جائے۔

ج۔ اس خاکہ سے مضمون تیار کر کے دکھایا جائے۔

د۔ لکھے ہوئے مضامین کی تصحیح کے بعد طلبہ کی خاص خاص غلطیاں تختہ سیاہ پر تبلا کر طلبہ ہی کی مدد سے اصلاح کی جائے اور آئندہ ایسی غلطیوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔

۷۔ ثانوی جماعتوں کی مضمون نگاری کے لئے حسب ذیل عنوان تجویز کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے دوسرے مضامین لکھانا یا اُن عنوانات میں سے حسب ضرورت انتخاب کر لینا اساتذہ صاحبان کی صوابدید پر منحصر ہے مگر اس قدر مضامین ضرور لکھائے جائیں جس سے کافی مشق ہو جائے گی۔ کیونکہ مشق و مہارت ہی کامیاب مضمون نگاری کا راز ہے۔

مضامین مجوزہ یہ ہیں

۱۔ خطوط رسان۔ (۲) غلامی کے نقصانات۔ (۳) استقلال کی عظمت۔ (۴) تہذیب شائستگی۔ (۵) اوقات فرصت کیسے گذارے جائیں۔ (۶) تعطیل کیونکر گذاری جائے۔ (۷) گھر کے

باہر کھیلوں کی اہمیت ۔ (۸) کسی باغ وغیرہ کی سیر۔ (۹) سالانہ تقسیم انعامات کی اہمیت (۱۰) اپنے ہمراہ موسم گرما گزارنے کے لئے ایک دوست کو دعوت۔ (۱۱) اس کا جواب ۔ (۱۲) تبادلہ موسم کی حکمت (۱۳) جانوروں پر مہربانی (۱۴) صحت جسمانی اور حفظان صحت ۔ (۱۵) انتظام و ضبط کے فضائل (۱۶) عادت (۱۷) العاب کا انتخاب (۱۸) تحفۂ سالگرہ کے ملنے کا اظہار۔

(۱۹) فرائض شناسی (۲۰) خوش اطواری (۲۱) سچائی ۔ (۲۲) کسی نظم کا بیان (۲۳) بیکاری کے نقصانات (۲۴) ملازمت کی خرابیاں (۲۵) صنعت و حرفت کی اہمیت (۲۶) شہری زندگی کے فوائد و نقصانات ۔ (۲۷) انتخاب کتب (۲۸) ذوق کتب بینی (۲۹) تاریخ کے فوائد ۔

(۳۰) تعلیم جغرافیہ کے فوائد ۔ (۳۱) کسی شہر کا بیان (۳۲) مسلمان یا ہندوؤں کی متبرک تقاریب کا بیان (۳۳) کسی تعلیم گاہ کا بیان (۳۴) زندہ دلی ۔ (۳۵) خود غرضی ۔ (۳۶) جلسۂ تقسیم اسناد

(۳۷) گھریلو زندگی (۳۸) پسندیدہ جانور ۔ (۳۹) اطاعت گذاری ۔ (۴۰) ترکاریوں کا بیان

(۴۱) سینما کے فوائد و نقصانات ۔ (۴۲) ناول بینی کے فوائد و نقصانات ۔ (۴۳) کسی تاریخی مقام کا معائنہ (۴۴) تعلیمی سفر کے فوائد ۔ (۴۵) طالب علمانہ زندگی (۴۶) علم کی پیاس ۔

(۴۷) تحریک کشافہ کے فوائد (۴۸) تعصب کے نقصانات (۴۹) اخبار بینی ۔ (۵۰) چاندنی رات (۵۱) قوس قزح ۔ (۵۲) صبح کا سماں (۵۳) حب الوطنی ۔ (۵۴) قومی خدمت

(۵۵) ہمدردی ۔ (۵۶) تاریخی ہیرو ۔ (۵۷) سویرے جاگنا ۔ (۵۸) کتب خانہ آصفیہ ۔

(۵۹) مادری زبان میں تعلیم دینے کے فوائد ۔ (۶۰) برکات عہد عثمانی ۔

عبدالسلام ذکی (عثمانیہ)

۲۲

والدین کی کانفرنس

اساتذہ کی حیثیت سے اگر ہم بچوں کی تعلیم کو اہم سمجھتے ہیں تو پہلے اس کا احساس ہمیں خود کرنا چاہیے اور پھر والدین کو اس کا اچھی طرح احساس کرا دینا چاہیئے۔ والدین کی کانفرنس میں ہمیں ان سے اپیل کرنی چاہیئے تعلیم کی اہمیت کے احساس سے قطع نظر بچوں کے متعلق دوسرے بہت سے ایسے امور ہیں جن کے متعلق والدین کو مطلع کرنا اور ان کا مشورہ لینا بہت ضروری ہوجاتا ہے اس لئے ایسی کانفرنس کا انعقاد یا مدرسہ میں "روز والدین" منانے سے ہمارا یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے، تعلیمی پستی کے موجودہ دور میں ہمارے ملک میں اس بات کی بہت ضرورت ہے، تعلیم کی آیندہ تنظیم میں اساتذہ کو پورا پورا بار اٹھانے کے واسطے تیار ہوجانا چاہیئے۔ اور اس کے واسطے اگر اساتذہ والدین کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھائیں تو بہت مفید ہوگا۔ والدین کی کانفرنس میں اساتذہ اپنی ذمہ داری اور فرائض کی اہمیت سے جو بچوں کی تعلیم کے باعث پیدا ہوگئی ہے والدین کو باخبر کریں گے۔ پیشہ مدرسی کی تقدیس کا احساس کرائیں گے اور نیز اساتذہ کی مادی اور رقمی امداد کی جانب توجہ دلائیں گے کہ اس کی اساتذہ کو بہت زیادہ حاجت ہے۔ تعلیمی حکمت عملی کی آیندہ تشکیل کا انحصار زیادہ تر والدین کے کندھوں پر ہے کہ والدین تعلیمی اداروں کے اراکین، مجلس اعلیٰ اور کونسلوں کے ممبر مجلس صفائی۔ لوکل فنڈ۔ بلدیہ، باب حکومت اور دیگر انجمنوں کے ممبر ہیں۔ اساتذہ کی حمایت اور جانب داری کرنا، ان کی طرف سے لڑنا اور مدرس کی قابل وقعت حیثیت کو پھر قائم کرنا جو کسی زمانہ میں اسے حاصل تھی۔ والدین کا خوش گوار فریضہ ہونا چاہیئے۔ تغیر کے آثار نمایاں ہیں۔ انقلاب ہوا چاہتا ہے آسمان سے سیاہ بادل صاف ہوگئے۔ اور یہ کچھ دن کی بات ہے کہ اساتذہ کی دلی تمنا بر آئے۔ اس لئے اساتذہ کو چاہیئے کہ زمانہ کا ساتھ دیں۔ تعلیمی جد وجہد میں وہ تغیر و تبدیلی کے اسباب پیدا کریں، "روز والدین" کے انعقاد سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور ملک کو بھی فائدہ پہونچائیں۔

اس مضمون میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ "روز والدین" کی تنظیم کن اصولوں پر او

کس طرح کی جائے اور والدین سے مدرسہ میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے متعلق کس طرح اپیل کی جائے۔ ہمیں تین باتوں کی اشاعت کرنی چاہیئے۔

۱۔ بچوں کی تعلیم۔
۲۔ مدرسہ اور گھر کی تربیت
۳۔ تعلیم بالغان۔

اس کانفرنس یا "روزِ والدین" کے انعقاد کا مناسب موقع سال تعلیمی کے آغاز کا وقت ہے جب والدین اپنے بچوں کے داخلہ کے واسطے یا ان کی ترقی کے بارے میں کہنے سننے آتے ہیں۔ چونکہ اکثر والدین ناخواندہ ہوتے ہیں۔ اور مکان پر اپنے بچوں کو امداد نہیں پہونچا سکتے لہذا ان کو نیک مشورہ دینا اور ایک حد تک خود ان کی تفہیم کرنا ہمارے فرائض کا اہم جزو ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں تعلیم بالغان کی تجویز کا خاکہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اعلان جلسہ

ہم سب کو طالب علموں کی استعداد کی کمی اور طریق تعلیم کے نقص کا احساس ہے، ہم مانتے ہیں کہ انتظام اور طریق کار میں خرابیاں ہیں۔ مگر سب سے اہم اور بنیادی اصلاح جس کی ضرورت ہے بچپن ہی سے بچہ کی تعلیم کا آغاز ہے یہ تربیت لازمی و لابدی ہے۔ اساتذہ خود بھی بغیر والدین کے اتحاد باہمی کے کوئی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کانفرنس کی غرض و غایت اساتذہ اور والدین میں اتحاد پیدا کرنا ہے کہ یہ بچوں کی عمدہ تعلیم کے واسطے لازمی ہے۔ تمام والدین اور دیگر حضرات جو بچوں کی تعلیم میں دلچسپی رکھتے ہیں، مستورات اور بیبیاں جن کو تعلیم نسواں سے دلچسپی ہے۔ نیز دیگر اصحاب شوق سے شریک جلسہ ہو سکتے ہیں، تشریف فرمائی نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور بانیان جلسہ ممنون احسان ہوں گے۔

نوٹ۔ مدرسہ میں بچوں کے کام اور آلات تعلیمی کی نمائش ہوگی۔

یہ اعلان مقامی زبان میں ہونا چاہیئے۔ اور مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کے ذریعہ والدین تک پہونچا دیا جائے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کے انعقاد کی تشہیر بستی میں اور قرب و جوار میں ہر ممکن طریقہ پر کی جائے۔

آغاز

ہم مدرسین کے لئے یہ امر بہت ہی خوشی کا باعث ہے کہ ہم اپنے سامنے آج یہاں والدین کا کثیر مجمع دیکھ رہے ہیں۔ آپ حضرات اس مدرسہ میں مدرسین کے ناچیز خیالات سننے اور ان کے صلاح ومشورہ پر غور کرنے کے واسطے زحمت فرما کر تشریف لائے ہیں۔ یہاں آپ کی موجودگی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ جس شوق سے آپ آئے ہیں۔ اسی شوق سے آپ مدرس کی آواز پر لبیک کہیں گے کہ یہ آواز اصل میں اس بچہ کی آواز ہے جو کل کے روز قوم کا ایک فرد ہوگا۔ آپ کی یہاں تشریف آوری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وقت ضرورت مدرسین کی امداد واعانت سے آپ دریغ نہیں فرماتے، بلکہ ہر ممکنہ سعی فرماتے ہیں۔ شرکت جلسہ کے باعث آپ نے اپنے ذاتی اور سرکاری کاموں میں کچھ نہ کچھ ہرج کیا ہے مگر اس سے آپ نے بچہ کی، مدرسہ کی مدرسین کی اور پوری قوم کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، نیز خاص طور پر پیشہ معلمی کی عزت وتوقیر میں بہت اضافہ فرمایا ہے۔ وہ مشورے جو آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے چاہے کیسے ہی معمولی کیوں نہ ہوں ہمیں یقین ہے کہ آپ ضرور ان کو اسی جوش سے سماعت فرمائیں گے جس جوش سے وہ آپ کی خدمت میں عرض کئے جائیں گے۔ مدرسین کی مشکلات حل کرنے میں آپ حتی الامکان کوشش فرمائیں گے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے آپ پر کسی مزید ذمہ واری کا بار ڈالا جائے۔ اور اپنی ذمہ داری کو کم کیا جائے۔ مدرسین کی تقریروں سے آپ پر خود واضح ہوجائے گا کہ موجودہ حالات کے تحت ان کی ذمہ واریوں میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہے، تین نہایت اہم مسائل ہیں جن پر آپ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے۔ اول بچہ کی تعلیم کا مسئلہ دوم مدرسہ کی تعلیم اور گھر کی تربیت اور سوم ناخواندہ بالغان کی تعلیم بچوں کی تعلیم کے عنوان کے تحت ہم کو تعلیم کی ضرورت اور اس کے لئے آلات وغیرہ پر غور کرنا ہوگا۔

یہاں صرف ایسی چند ضروری باتیں درج کی جاتی ہیں۔ جن کے متعلق والدین کو غور کرنا چاہئے یا جن پر اساتذہ کو ان سے گفتگو کرنی چاہئے۔ اور جو پرچہ کی شکل میں والدین کو تقسیم کردیا جائے۔

پرچہ نمبر (۱) بچہ کی تعلیم

ایک قومی مسئلہ ہے۔

بچہ کے جسم اور روح دونوں ہیں۔

بچہ نسل انسانی کا تخم ہے۔

پھر وہ اس کے جسم کی پرورش ہی کیوں کی جائے اس کے دماغ کو بھی کیوں نہ تقویت پہونچائی جائے۔

فطرت بہترین معلم ہے۔

ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو تعلیم کے واسطے بہتر ہو علم کے دروازے کھولو۔ علم کے متعدد دروازے ہیں۔

(۱) ادراک

جنبش و حرکت اظہار مطلب اور کھیل کود میں آزادی۔

سامان کی ضرورت

خاندان کے واسطے سامان ضروری ہے۔

جو رقم سامان میں لگائی جائے۔ برباد نہیں ہوتی سامان سے تحصیل علم کا موقع ملتا ہے۔

سامان کے ذریعہ اوراک، رگ و پٹھے اور اعضا میں تقویت پہونچتی ہے۔

بچوں کا حق ہے کہ والدین مناسب تعلیم دلائیں۔ والدین اس حق اور مطالبہ کو نہایت لطف و عنایت قبول کریں۔

(۲) نقل کرنے کی قوت

"پیدایش کے بعد سے بچہ والدین کی نقل کرتا ہے اور کئی سال نمو اور بالیدگی کا انحصار بالکل اسی پر ہوتا ہے"۔

مہاتما گاندھی

والدین کو چاہیے کہ اچھی مثال قائم کریں۔

غلیظ باتیں نہ کریں۔

سب سے ہمدردی کا اظہار کریں۔

سب بچوں سے محبت کرو۔

اچھی اور پاک عادتیں ڈالو۔

انسان حیوان درخت اور پودے سب سے مہربانی کا برتاؤ کرو۔

کھلی ہوا میں ورزش اور تازہ ہوا میں چہل قدمی۔

۳۔ عادتیں۔

(۱) صفائی۔ (۲) باقاعدگی۔ (۳) سادگی۔ (۴) اعتدال۔ (۵) خوش مزاجی (۶) غلطی کا

اعتراف کرنا۔ (۷) سچ بولنا (۸) بزرگوں کی اطاعت۔ (۹) سب کی محبت۔ (۱۰) کام کا شوق (۱۱) فطرت کے حسن کا احساس (۱۲) خدا کی محبت و عبادت (۱۳) روز کا معمول۔ (۱۴) لین دین۔ (۱۵) جرأت۔ (۱۶) اپنی مدد آپ کرنا۔ (۱۷) استقلال۔

جو بات تیز فہمی اور سمجھ سے حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ استقلال کے ساتھ محنت کی جائے تو بڑی حد تک حاصل ہو سکتی ہے۔

۴۔ عادت پختہ کرنے کے ذرایع

(۱) مثال (۲) اچھے مشورے۔ بچے کی طبیعت اثر پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے خراب تحریک سے باز رہنا چاہیئے۔ (۳) ہمت افزائی۔ (۴) دلچسپی۔ دلچسپی پیدا کرنا خود دلچسپی لینا۔ (۵) دہرانا بار بار مشق کرنے اور کسی چیز کو دہرانے سے وہ چیز مکمل طور پر آجاتی ہے (۶) قدردانی۔ (۷) سزا میں حد درجہ تخفیف۔ (۸) ناواجب خوف دلانے یا حد سے زیادہ تعریف کرنے سے باز رہو۔ (۹) لالچ دلانے سے باز رہو۔ (۱۰) جب مناسب ہو بحث بھی کرو۔ (۱۱) مذہبی پابندی نماز پڑھنا وغیرہ (۱۲) تھوڑی تکلیف یا معمولی چوٹ کا احساس نہ کرنا۔

۵۔ تجسس

عجیب چیزوں کا جمع کرنا؛ تصویر کی کتابیں درختوں کی پتیاں اور ٹپہ کے ٹکٹ جمع کرکے البم بنانا۔ پودے لگانا۔ پرندے، اور جانور پالنا۔

(۶) حافظہ

بچوں کے گیت مذہبی دعائیں۔ قصے۔

۷۔ صحت

دوڑنا۔ چلنا، اچھل کود کرنا وغیرہ۔

خاص خاص مشقیں ایسے طلبہ کے لئے لازمی خیال کی گئی ہیں جو کوزہ پشت ہوں یا پیٹ آگے نکال کر چلتے ہوں کیا باقاعدہ اور متواتر مشق کی جائے تو یہ خامی دور نہیں ہو سکتی کھڑے ہونے، بیٹھنے، لکھنے۔ پڑھنے وغیرہ کا درست اور صحیح طریقہ سکھانا چاہیئے۔

۸۔ کیا یہ کوئی نئی بات ہے؟

نہیں ہرگز نہیں۔ ہمارے آباو اجداد سب اس کی مشق کرتے ہیں۔ وہ اصول سے واقف نہ ہوں عملاً واقف ضرور تھے۔ مگر ہمیں ان باتوں کی فرصت نہیں" مستورات کہتی ہیں

ہمیں حد سے زیادہ کام ہے۔ مگر یہ لوگ اس سے واقف نہیں کہ وقت پر ذرا سی بات بہت سی مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ کسی کے بچہ پیدا ہوتا ہے تو بڑی بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں اسے پالنے اور پرورش کرنے میں بھی طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کی جاتی ہیں۔ مگر کیا یہ ہمارا اولین فرض نہیں ہونا چاہئے کہ اسے تعلیم بھی دلائیں والدین کو ذیل کی باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

(۱) میرے بچہ کے لئے اس چیز کا فائدہ کیا ہے؟

(۲) میں اپنے بچہ کے لئے اس میز کو کیسے کام میں لاؤں؟

(۳) فلاں خیال بچہ تک پہونچانے کا بہترین اور آسان طریقہ کیا ہے؟

"ہم کو یہ وہم ہے کہ بچہ اپنی عمر کے پانچ سال میں کچھ نہیں سیکھتا" (مہاتما گاندھی)

اس لئے، تعلیم کا آغاز بچپنے سے ہی ہونا چاہئے۔

آزادی اور رہبری اپنے اپنے موقع پر ہو ضبط جب ضروری ہو بہت احتیاط کے ساتھ قائم کیا جائے۔

۹۔ قومی مسئلہ

تعلیم کی موجودہ خرابی کا احساس اساتذہ اور والدین دونوں کو ہے۔

(۱) اساتذہ کو چاہئے اس خرابی کا حل سوچیں اور والدین کو چاہئے اساتذہ کی امداد سے دریغ نہ کریں۔

(۲) والدین کو چاہئے کہ تعلیم کی قدر کریں اور حصول علم کے طریقے معلوم کریں۔

(۳) والدین کو یہ بھی چاہئے کہ جو اہم خدمت اور بڑی امانت اساتذہ کے سپرد کی گئی ہے اس کا خیال رکھیں اور اساتذہ کے بے انتہا ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں۔

(۴) بچوں کی تعلیم اگر باقاعدہ طور پر جاری رکھی جائے تو ابتدائی مدارس کا نصاب تعلیم بہت کچھ گھٹ جاتا ہے۔

(۵) اساتذہ کو اس سے بڑی مدد ملے گی۔

(۶) تعلیم صرف دماغ ہی کو مصروف رکھنا نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں اور دل کو بھی کام کام میں لگائے رکھنے کا نام تعلیم ہے۔

(۷) والدین کو چاہئے اس پر بھی سنجیدگی سے غور کریں کہ لبا اوقات والدین کو نہیے

بچوں کی خاطر کھانے پینے اور سونے کو خیر باد کہدینا پڑتا ہے اس لئے بچہ کا غور سے مطالعہ کرو اس کی فطرت معلوم کرو۔ اپنے طریقے خاص حالات کے مطابق و موافق بنالو۔

(۸)۔ لکھنا پڑھنا اور حساب کرنا بچوں کو گیت، کہانی اور کھیل کود کے ذریعہ سکھایا جاسکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں کیا یہ لازم نہیں کہ شیر خوار بچوں کے مدارس اور "بالک گھر" کی جانب توجہ کی جائے۔

(۹)۔ جو لوگ اس جانب توجہ کریں ان کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ "آؤ ہم اپنی زندگی بچوں کے ساتھ اور بچوں کی خاطر وقف کردیں"

دوسری اشیار جو بچوں کی تعلیم میں درکار ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فہرست اشیار	پرچہ نمبر ۲۔
۲۔ اشیار کا طریقہ استعمال	پرچہ نمبر ۳
۳۔ حمد مناجات نظمیں اور قصے کہانیاں۔	؍؍ ؍؍ ۴
۴۔ تفصیل کار ـــ عمل اور اندراج کا	؍؍ ؍؍ ۵
۵۔ مکان پر تربیت کے لئے ضروری اشیار	؍؍ ؍؍ ۶
۶۔ اچھی اور نیک عادتوں کا تختہ	؍؍ ؍؍ ۷
۷۔ کتب برائے مطالعہ	؍؍ ؍؍ ۸

(۰)

ان معلومات کے قطع نظر جن عنوانات کے تحت پرچہ جات اور رسائل سے بہم پہونچائی جائیں گی۔ بعض دوسری صورتیں بھی والدین کے غور و فکر کے واسطے پیش کی جاسکتی ہیں۔

بیش قیمت آلات تعلیمی کی فہرست بنا کر والدین کو پریشان کرنا مقصود نہیں ذرا سی ہمت کی جائے تو

شکل نمبر

o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o	o

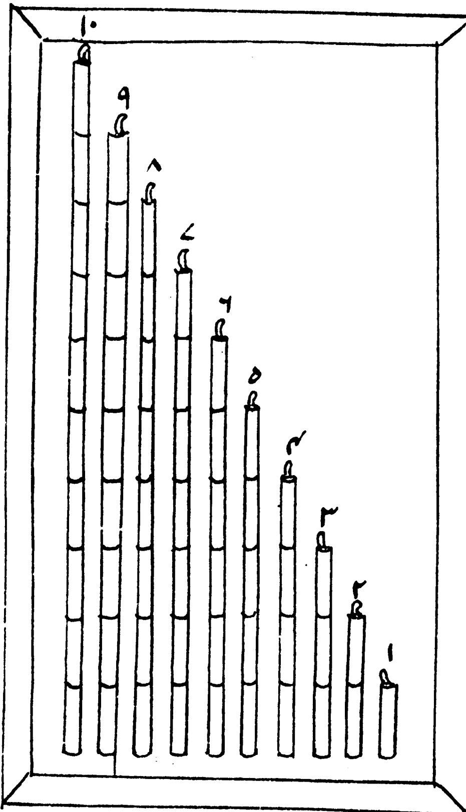
بعض چیزیں آسانی سے بن سکتی ہیں۔ دو سادہ آلات جو نہایت ارزان ہیں نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں۔ شکل نمبر ا بچوں کو اعداد سکھانے کا تختہ ہے بنانے کا طریقہ اور قیمت درج ذیل ہے

(۱) مقوہ یا کاغذ ۲۰ × ۱۰

(۲) یا ایک کے اوپر ایک کاغذ لگاؤ۔ اور جیسا کہ نمونہ میں بنایا گیا ہے سوراخ کر دو اس کے نیچے رنگین کاغذ لگا دو۔

۳۔ یا دو دھنے کی لکڑی استعمال کرو ایک قسم کی نئے (سروا یا سرکنڈا) دریاؤں اور نہروں کے کنارے بکثرت پایا جاتا ہے۔ دو دو انچ لمبے ٹکڑے کاٹ لو اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے تاگہ میں باندھ لو اور ایک تختہ میں کیلے ٹھوک کر ان کے ذریعہ لٹکا دو جیسا کہ خاکہ میں بتایا گیا ہے۔

شکل نمبر ۲



آلات تعلیمی کا استعمال

بچوں کو آزادی سے کھیلنے دو جو جی میں آئے کرتے رہیں۔ پھر تختہ پر دانہ اور بیج چننا سکھاؤ سوراخوں میں دانے ڈالکر ان کو گننا سکھاؤ۔ اس طرح سو تک گنتی اور جمع تفریق ضرب تقسیم کے قاعدہ آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ دانوں کا چوکھٹا بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کسی پرانی تصویر یا سلیٹ کا چوکھٹا لو۔

(۲) تار کے دس ٹکڑے چوکھٹے کے مساوی سب برابر برابر کاٹ لو۔
(۳) رنگ برنگ کے سو دانے لو۔ اور یہ چوکھٹا اس طرح بناؤ کہ جو بچہ استعمال کرے وہ آسانی سے ساتھ تار الگ کرے۔ اور دانے ڈالکر پھر ٹھیک کرلے یہ ترکیب اس وجہ سے بھی سہل ہے کہ اگر استعمال میں کوئی دانہ ٹوٹ جائے تو پھر اس کی جگہ دوسرا ڈال لیا جائے

آلات تعلیمی کے فوائد

(۱) اگر یہ تسلیم ہے کہ بچہ کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے نہیں بلکہ بچپن سے شروع ہوجانی چاہئے تو ان آلات کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔
۲۔ یہ نہایت ارزان اور ساتھ ہی تعلیمی اغراض کے لئے بہت کارآمد ہیں۔
۳۔ استاد یا والدین کی ذرا بھی مدد ہو تو بچہ اپنے آپ تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ اُسے چیزوں کے چھونے اور خود برتنے اور استعمال کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ ان آلات سے دیہاتوں میں بھی عملی اور ٹھوس تعلیم ممکن ہے
الف۔ بچہ دانوں کو سوراخوں میں ڈالے نتیجہ معلوم کرے۔ اور چاہے تو کاغذ پر لکھے
ب۔ یہ سلسلہ دوسرے دن بھی جاری رہے۔ اور پھر ایک مرتبہ دیکھ لے کہ نتیجہ وہی ہے جو کل نکلا تھا۔
ج۔ اس طرح خود ہی ٹیبل بنائے اور یاد کرے۔
(۴) سب سے بڑا مقصد بچوں کی قوت حافظ کو تقویت پہونچانا ہے اس لئے آج کل مدارس کے بچوں میں حافظہ کی قوت بہت کمزور ہوتی ہے۔
۵۔ بچوں کی کثیر تعداد سال اول کے ختم پر مدرسہ ترک کردیتی ہے۔
یہ طریقے جو اوپر بیان کئے گئے اگر ان کے مطابق تعلیم دیجائے تو اول تو بچہ کو دلچسپی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو والدین اپنے بچوں کو کھیل میں ان آلات کا استعمال کرتے ہوئے دیکھیں گے ان کے دلوں پر گہرا نقش پڑ جائے گا۔ یہ سب باتیں تعلیمی فضا کو بہتر بنانے اور بچوں کو تعلیمی سہولت بہم پہونچانے میں بہت ممد و معاون ہوں گی۔
اس لئے سامان اور تعلیمی آلات کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں ہم خاص و عام سب لوگ جو چاہیں تجربے کرسکتے ہیں۔ اور موقع محل کے لحاظ سے مناسب آلات وضع و ایجاد کرسکتے ہیں۔ اس طرح تعلیم اطفال جیسے زبردست قومی مسئلہ کی اہمیت اور ابتدائی تعلیم سے

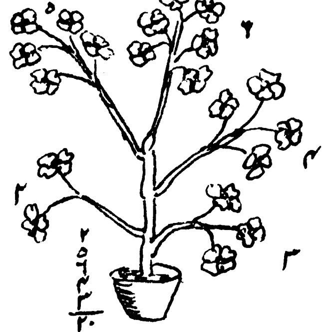
اس کے راست تعلق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ذیل کے خاکہ جات سے ثابت ہوگا کہ اعداد گننے اور جمع کرنے کا تعلق خاص آلات تعلیمی کے بغیر بھی آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پھول پتیاں گول اور چوکور اینٹیں استعمال کی جائیں تو بہت کارآمد ہونگی۔ بعض دفعہ چہل قدمی کے وقت ان باتوں پر بچوں سے گفتگو کرنی چاہئے کیا اس طرح کھیل کھیل میں ان کی تعلیم نہیں ہوتی؟ اس پر غور فکر کرنی چاہئے جو لوگ تعلیم اطفال میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کو یہ سب باتیں فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ مقوہ لکڑی کے ٹکڑے، کپڑے کی کترن رنگین کاغذ اور ایسی ہی دوسری چیزیں بہت کارآمد ہیں۔ اس لئے مندرجہ ذیل اشیا جمع کی جائیں تو مفید ہوں گی۔

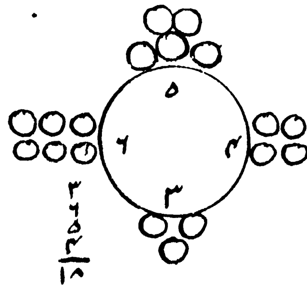
(۱) دیاسلائی کی پرانی ڈبیاں۔

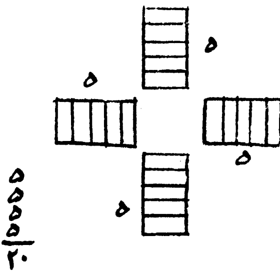
(۲) صابون کے ڈبے۔

(۳) پرانے مقوے جس سے چیزیں بندھ کر آتی ہیں۔









(۴) مقوے کے پرانے ڈبے۔

(۵) جلاہوں کا مقوہ

(۶) ادویات کی شیشیوں کے محفوظ رکھنے میں جو پٹھا اور مقوہ استعمال ہوتا ہے

یہ لکھتے وقت میرے ذہن میں غریب امیر اور اوسط درجے کے لوگوں کے بچے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ بات یہاں صادق آتی ہے۔ دوسری جگہ شاید ہی چسپاں ہوتی ہو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم نے کوئی بڑی اختراع یا ایجاد کی ہے ہاں اس بات سے دلی اطمینان ہوتا ہے کہ ہم نے آلات تعلیمی کی قیمت سے بچنے کی کوشش کی ہے اور یہ چیز ہر نیک خیال مدرس اور بہت سے والدین کے لئے سنگ راہ ثابت ہوتی ہے تعلیم اطفال کی تربیت و تنظیم اور با اصول طریقوں پر رائج کرنے کے واسطے کمر ہمت چست کر لینی چاہیئے۔ اس میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کی حاجت نہیں بلکہ گرد و پیش کی چیزوں سے بھی موجودہ صورت حال میں انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے اور اساس تعلیم نہایت مستحکم کی جا سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اساتذہ جو دست کاری اور دستی مشاغل کی خاص تعلیم جو تربیت حاصل کر چکے ہیں اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو آلات تعلیمی بہت ارزاں قیمت پر فروخت ہونے لگیں گے۔ اس سے ان کو اور ان کے بچوں کو منفعت حاصل ہوگی بلکہ ہزار ہا والدین کو عظیم الشان فائدہ ہوگا اور تمام ملک ان کا ممنون احسان ہوگا۔ امید کہ اس آواز پر صدائے لبیک بلند ہوگی نجاری کے متعلق جدید اور فنی معلومات کی وجہ سے آلات تعلیمی کے اختراع میں انہیں بہت سہولت ہے تعلیم اطفال کی اہمیت اور مسئلہ تعلیم سے اس کے تعلق کی بابت جس قدر واقفیت ان اساتذہ کو ہوگی اس قدر توجہ آلات تعلیمی بنانے کے لئے کی جائے گی۔ اس لئے در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔

اچھی عادتوں کا نقشہ

پرچہ نمبر ۲

میری رائے میں ایک نقشہ اچھی عادتوں کا دیوار پر آویزاں کر دینا چاہیئے جس پر ہماری نگاہ پڑتی رہے۔ اور بچوں کو یاد دلاتے رہیں بلکہ بغیر بتائے خود بھی بچہ انہیں دیکھے اور اپنی اصلاح کا دھیان رکھے۔ اس طرح بچہ اچھی عادتیں اختیار کرے گا۔ اور ہماری توقعات کے مطابق کام کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ متواتر مشق کئے بغیر کسی کام کی عادت نہیں پڑتی مگر اس تختہ سے ترغیب و تحریص ضرور ہوگی۔

۱۔ صبح سویرے اٹھو۔
۲۔ اپنا بستر خود ٹھیک کرو۔
۳۔ ضرورت سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھوؤ۔ دانت اور آنکھیں خوب صاف کرو۔
۴۔ خدا کی عبادت کرو۔
۵۔ جو میسر آئے صبر و شکر کے ساتھ کھاؤ۔
۶۔ کھیلو کودو لکھو پڑھو۔
۷۔ نہاؤ۔ ہمیشہ صاف ستھرے رہو۔
۸۔ کھاؤ مگر غذا ادھر ادھر مت گراؤ۔
۹۔ "اور" "اور" کا تقاضہ حرص و لالچ کی علامت ہے۔
۱۰۔ بڑوں کا کہنا مانو۔
۱۱۔ چیزوں کی خوبی پر غور کرو۔ ان کو حفاظت سے رکھو۔ توڑنا پھوڑنا گناہ ہے۔
۱۲۔ اپنی غلطی کا اقرار کرلو۔
۱۳۔ ذرا سا جھگڑا بڑا ہو جاتا ہے۔
۱۴۔ اپنے کام کا خیال رکھو والدین کے کام میں مدد دو۔
۱۵۔ فقیروں پر رحم کھاؤ۔ ان کو خیرات دو۔
۱۶۔ عبادت کے اوقات کی پابندی کرو۔
۱۷۔ ان باتوں پر عمل کرے تو خدا تم سے خوش ہوگا۔

نوٹ ۔ ان سب باتوں پر ایک ہی دن میں عمل کرنا بچہ کے واسطے ممکن نہیں۔ مگر خدا سے التجا کرتے ہیں بچہ کو بڑی قوت حاصل ہوتی ہے" ان باتوں پر عمل کرنے سے خدا تم سے خوش ہوگا۔ بچہ کو حیات تازہ بخشتا ہے اور اس کے اعمال و افعال میں بھروسہ پیدا ہوتا ہے۔

عبدالجبار سبحانی
مددگار فوقانیہ عثمانیہ
نامپلی

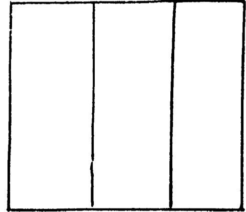
سادہ کسر سکھانے کے طریقے

عام زبان میں کسی چیز کی کسر سے مراد اس چیز کا ایک حصہ یا جزو ہوتی ہے لیکن ریاضی میں عموماً اعداد استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اعداد کے لحاظ سے اس کی تعریف یہ ہوگی کہ کسی عدد کے کسر سے مراد اسی عدد کا ایک حصہ ہے مثلاً $\frac{1}{2}$ ، $\frac{1}{4}$ ، $\frac{2}{3}$ وغیرہ۔ ان اعداد کو عام زبان میں نصف، چوتھائی، دو تہائی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنے اگر ہم کسی شئے کو مختلف اور مساوی حصوں میں تقسیم کریں تو ان حصوں میں سے ہر ایک حصہ اس اصلی شئے کے کسر کہلائے گا۔ اور اسی طریقہ سے اگر ہم کسی ایک عدد کو مختلف اعداد پر مساوی طور سے تقسیم کریں تو ان میں سے بھی ہر ایک عدد اس عدد کا ضعف یا حصہ کہلائے گا۔ ان مختلف حصوں کو جس طریقے سے چاہیں لے سکتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے ہر ایک حصہ علحدہ علحدہ یا چند یا سب بہ یک وقت بھی لئے جا سکتے ہیں۔ فرض کرو کہ ہم ایک نارنگی میں سے چند قاش لینا چاہیں۔ اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس نارنگی میں ۱۲ قاش ہیں تو اس لحاظ سے ہم جتنے بھی قاش چاہیں یعنے ایک، دو، تین یا ۱۲ کے ۱۲ قاش لے سکتے ہیں۔ مثلاً ان ۱۲ قاشوں میں سے صرف ۷ قاش لے گئیں تو اس حصہ کو جو ہم نے لیا ہے ریاضی میں حسب ذیل طریقہ سے لکھا جاتا ہے۔ $\frac{7}{12}$ ، اس سے وہی منشا ظاہر ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنے ایک چیز ۱۲ حصوں پر مشتمل تھی۔ اس میں سے ۷ حصے لئے گئے۔ اس علامت کو ریاضی میں کسر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں تین چیزیں ضروری ہیں۔ (۱) بڑا عدد۔ (۲) عرضی خط۔ (۳) بڑے عدد کا حصہ یا جزو۔

بڑا عدد۔ یہ ایک عدد ہوتا ہے۔ جس کے حصے کرنا مطلوب ہو۔ اس بڑے عدد کے اوپر ایک خط کھینچ دیا جاتا ہے۔ جسے عرضی خط کہتے ہیں۔ (۳) اس خط کے اوپر وہ ہندسہ یا عدد لکھا جاتا ہے۔ جو اس بڑے عدد میں سے لیا گیا ہے۔ اب اس کامل ترتیب کو کسر کہتے ہیں مثلاً $\frac{7}{12}$ اس میں ۱۲ بڑا عدد ہے، ۷ اس کے حصے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان جو خط واقع ہے اسے عرضی خط کہتے ہیں۔

نوٹ۔ طلبہ کو زیادہ ذہن نشین کرانے کے لئے اس قسم کی مختلف مثالیں زبانی حل کروائی جائیں

ایک آنہ کو ۱۲ مساوی حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ہر ایک حصہ پائی کہلاتا ہے
اس کے ایک حصہ یعنے پائی کو $\frac{1}{12}$ کی علامت سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے یہی مطلب نکلتا ہے
کہ ایک شئے ۱۲ حصوں پر مشتمل تھی، اس میں کا ایک حصہ لیا گیا ہے۔ اس قدر طویل عبارت کو حساب کی
مفید و مختصر علامت $\frac{1}{12}$ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طریقے سے اور اشیا میں بھی اپنی علامتوں سے
کام لیا جاتا ہے یعنے اگر ہمیں۔ ایک روپیے کے چوتھائی حصے یا ایک سیر کے چھٹے حصے کا اظہار کرنا
مقصود ہو تو ریاضی میں $\frac{1}{4}$ روپیہ اور $\frac{1}{6}$ سیر کی علامتوں سے ظاہر کر دیں گے۔ ان علامتوں کا
بھی وہی مطلب ہے جو عبارت کا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک روپیہ کے ۴ حصے اور ایک سیر کے
چھ مساوی حصے کئے گئے اور ان میں سے ایک ایک حصہ لیا گیا۔



شکل نمبر (۱) مربع شکل ہے۔ اگر اس شکل کو تین مساوی حصوں میں
تقسیم کیا جائے تو ان حصوں میں سے ہر ایک حصہ کل مربع کا $\frac{1}{3}$
ہوگا اس لئے اس شکل کے ہر ایک حصہ کو $\frac{1}{3}$ سے ظاہر کرتے ہیں
اب اس لحاظ سے اس شکل سے ہم ایک حصہ یا دو حصے یا تینوں
حصے لے سکتے ہیں۔ اگر ایک حصہ لیں تو اس سے یہ مطلب ہوگا کہ
ہم نے کل کا $\frac{1}{3}$ لیا، اور اگر دو حصے لیں تو دو حصے ایسے لئے جن میں سے ہر ایک $\frac{1}{3}$ ہے یعنے ہم نے
$\frac{1}{3}+\frac{1}{3}$ یعنے $\frac{2}{3}$ لیا، اگر تینوں حصے لے لیں تو ہم نے $\frac{1}{3}+\frac{1}{3}+\frac{1}{3}$ یعنے تین ایسے حصے لئے جن
میں سے ہر ایک کل کا $\frac{1}{3}$ تھا، جس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم نے کل شکل حاصل کر لی۔

اسی مطلب کو ریاضی کی علامتوں میں $\frac{1}{3}+\frac{1}{3}+\frac{1}{3}=\frac{3}{3}=1$ سے ظاہر کرتے ہیں۔
ان اعداد کو جو عرضی خط کے نیچے لکھے جاتے ہیں۔ نسب نما کہتے ہیں۔ اور جو اس خط کے
اوپر ہوں وہ شمار کنندہ کہلاتے ہیں مثلاً $\frac{1}{4}$ میں ۴ نسب نما اور ۱ شمار کنندہ ہے۔ ایسے علامتوں کے پڑھنے میں شمار کنندہ
عدد پہلے اس کے بعد عرضی خط (بٹے)، اور بعد میں نسب نما پڑھتے ہیں۔ مثلاً $\frac{3}{4}$ کو تین بٹے چار پڑھتے ہیں۔

کسرات کو آپس میں جمع یا تفریق بھی کیا جاتا ہے لیکن ان ہی کسرات کو آپس میں جمع یا
تفریق کرتے ہیں جو ایک ہی مقدار کی ہوں۔ مقدار سے جو مطلب ہے وہ ذرا تفصیلی طور پر بعد میں بتایا جائیگا
اب فی الحال یہ ذہن نشین کر لینا کافی ہوگا کہ ایک ہی نسب نما کے کسروں کی جمع یا تفریق اسی طرح
کرنی چاہئے جیسی کہ سادہ اعداد کی۔ مثلاً۔

$\frac{5}{9}+\frac{4}{9}$، $\frac{7}{11}+\frac{4}{11}$، $\frac{12}{12}-\frac{5}{12}$ وغیرہ

اسی قسم کے سوالات طلبہ سے حل کروائے جائیں۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ نسب نما مشترک نہ لکھا جائے۔ مثلاً

$$\frac{8 - 8 + 6}{12}$$

یہ طریقہ طلبہ کے لئے مضرت رساں ثابت ہوگا۔

جب مختلف کسروں کے نسب نما ایک ہی ہوں تو ایسی صورت میں جمع یا تفریق کا عمل صرف ان کے شمارکنندوں کے ساتھ ہی ہوگا۔ مثلاً۔

$$\frac{2}{3} + \frac{1}{3} + \frac{1}{3} - \frac{2}{3} = \frac{2}{3}$$

اس عمل سے ظاہر ہے کہ ایک ہی نسب نما کے کسروں میں ہم نے جمع و تفریق کا عمل محض ان کے شمارکنندوں ہی کی حد تک رکھا اور اس کے حاصل کے نیچے انہی نسب نماؤں سے ایک نسب نما لکھدیا۔ حسب بالا مثال کو ایک ہی مقدار کی کسریں کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نسب نما ایک ہی یعنے ہم مقدار ہیں۔ اور ایسی کسریں کہ جن کے نسب نما ایک ہی مقدار کے نہیں ہوتے ان کے لئے یہ امر کارگر نہ ہوگا۔ بلکہ ان مختلف مقادیر کے کسروں کو ایک ہی مقدار میں تبدیل کرکے عمل کرنا ہوگا۔ اس چیز کو ہم شکل نمبر(۱) سے واضح کریں گے۔ یہ ایک مربع شکل ہے اس کے عین وسط میں سے۔ ایک سیدھا عمودی (الف۔ ب) خط کھینچا گیا ہے جو اس شکل کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور دوسرا آڑا (افقی خط ج د) کھینچا گیا ہے۔ جو اس شکل کے چار مساوی حصے کرتا ہے۔ اس شکل کو کھینچکر طلبہ سے دریافت کیا جائے کہ خانہ نمبر۴ اس کل مربع کا کونسا حصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خانہ مذکور کل مربع کا $\frac{1}{4}$ یا پاؤ ہے۔ کیونکہ یہ دونوں خطوط مل کر اس مربع کو چار مساوی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جن میں سے ایک حصہ خانہ (۴) بھی ہے اس لئے خانہ نمبر ۴ ان چار حصوں میں کا ایک حصہ یعنے $\frac{1}{4}$ ہے۔ یہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عمودی خط اب سے اس مربع کے دو مساوی حصے ہوگئے جو خانہ (۲ و ۴) اور خانہ (۱ و ۳) تھے۔

شکل نمبر ۱

نمبر(۱) نمبر(۲)

نمبر۳ نمبر۴

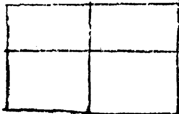
لیکن پھر افقی خط ج د کھینچنے سے ان دو حصوں کے اور دو مساوی حصے ہوگئے یعنے ان نصف حصوں کے بھی نصف کئے گئے (یعنی ان کا بھی نصف کیا گیا) اور ہم کا بھی جس سے خانہ ۳ و ۴ حاصل ہوئے خانہ

۲ و ۳ علی الترتیب خانہ ل و م کے نصف ہیں۔ خانہ ل خود نصف ہے کل مربع کا یعنے خانہ ل $\frac{1}{2}$ ہے کل مربع کا اور خانہ م $\frac{1}{2}$ ہے کل مربع کا اور اس طریقہ سے خانہ ۴ نصف ہے م کا اور ہم جانتے ہیں۔ کہ خانہ نمبر ۴ کل مربع کا $\frac{1}{4}$ ہے اس لئے اگر ہم م میں سے (جو خود نصف ہے کل مربع کا) اس خانہ ۴ کو نکال دیں تو باقی خانہ (۲ بھی کل مربع کا $\frac{1}{4}$ ہوگا۔ اس عبارت کو ریاضی میں $\frac{1}{2} - \frac{1}{4} = \frac{1}{4}$ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھا دینا کافی ہوگا کہ کسی عدد یا شئے کے نصف میں اس کی دو چوتھائیاں شریک ہوتی ہیں۔ اب ہم نے جو اوپر کی مثال میں سے $\frac{1}{4}$ خارج کر دیا ہے۔ تو اس کا عمل حسب ذیل طریقہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتا ہے یعنے نصف مساوی ہے دو چوتھائیوں کے مجموعہ کے ($\frac{1}{4} + \frac{1}{4}$) اس میں سے ایک چوتھائی ($\frac{1}{4}$) خارج کر دیا گیا۔ یعنی ($\frac{1}{4} + \frac{1}{4} - \frac{1}{4} = \frac{1}{4}$) یعنی باایک چوتھائی حصہ باقی رہے گا۔ اب اس نصف کو جس کو ($\frac{1}{4} + \frac{1}{4}$) سے ظاہر کیا گیا ہے اس کو $\frac{1}{2}$ سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا عمل اب اس طرح ہوگا $\frac{1}{2} - \frac{1}{4} = \frac{1}{4}$)

$\frac{1}{2}$، $\frac{1}{4}$ سے واضح ہے کہ ان کسروں کے نسب نما ایک ہی نہیں بلکہ مختلف ہیں۔ اس لئے ایسے کسروں کو جمع یا تفریق کرنے میں ان کسروں کے نسب نماؤں کو ایک ہی عام صورت میں۔ (جن کی مقدار وہی ہو) تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ $\frac{1}{2}$ مساوی ہوتا ہے۔ دو چوتھائیوں یعنے $\frac{2}{4}$ کے کیونکہ کسی عدد کے ۴ حصے کئے گئے اور اس کے نصف سے لئے گئے تو یہ مساوی ہوگا۔ $\frac{2}{4}$ کے اسی طریقہ سے اور بھی متعدد کسرات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً $\frac{3}{6}$، $\frac{4}{8}$، $\frac{5}{10}$ وغیرہ وغیرہ۔

ایسے کسرات سے ظاہر ہے کہ ان کے نسب نما ان کے شمار کنندوں کے دوگنے ہوتے ہیں۔ شکل ۳ میں مربع کے ۶ مساوی حصے کئے گئے ہیں۔

شکل ۳



اس لئے اس میں کا ہر ایک حصہ اس مربع کا $\frac{1}{6}$ ہوگا۔ چونکہ افقی خط اس مربع کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے اس لئے اس نصف حصہ کو کل مربع کا $\frac{1}{2}$ یا $\frac{3}{6}$ کہیں گے۔ کیونکہ کل مربع میں ۶ حصے ہیں۔ اور اس کے نصف میں تین حصے ہیں اس لئے اس نصف حصہ کو کل مربع کا $\frac{1}{2}$ یا $\frac{3}{6}$ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس نصف حصہ میں سے (کہ جو تین مساوی حصوں پر منقسم ہے) ایک حصہ خارج کر دیا جائے تو باقی $\frac{2}{6}$ رہیگا کیونکہ اس مربع کا نصف حصہ = $\frac{3}{6}$ اس $\frac{3}{6}$ میں سے $\frac{1}{6}$ تفریق کر دیا گیا۔ یعنی $\frac{3}{6} - \frac{1}{6} = \frac{2}{6}$ باقی بچے گا۔ ریاضی میں

اختصار کی خاطر حسب ذیل طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی $\frac{1}{2} - \frac{1}{6} = \frac{2}{6}$

کسروں کی جمع یا تفریق میں جن کے نسب نما مختلف ہوں ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ ایسے کسروں کو ایک ہی مقدار کی کسروں میں یعنے جن کے نسب نما بھی ایک ہی ہوں تبدیل کر لینا مناسب ہوگا۔ مثلاً

$\frac{1}{2} + \frac{1}{4}$، $\frac{1}{3} + \frac{1}{6}$، $\frac{1}{6} - \frac{1}{12}$، $\frac{1}{4} + \frac{1}{8} - \frac{1}{12}$۔

نوٹ۔ طلبا کو ایسے سوالات پر کافی مشق ہونی چاہیے۔ اور یہ بات کافی طور پر ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ $\frac{1}{3} + \frac{1}{6}$، $\frac{2}{9}$ یا $\frac{2}{18}$ کے ہرگز ہرگز مساوی نہیں ہوتے۔

جمع یا تفریق کا عمل ایک ہی قسم کی چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہم دس سنگتروں میں سے ۴ سنگترے لے سکتے ہیں یا اس میں اور دو سنگترے بھی ملا سکتے ہیں لیکن ہم کسی صورت میں بھی ان دس سنگتروں میں سے ۴ آم یا اور کوئی تعداد غیر جنس کی نہیں نکال سکتے یا اور واضح طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک گلہ میں ۱۰۰ بھیڑیں ہیں ان میں سے ہم جتنی چاہیں نکال سکتے ہیں یا ان میں جتنی چاہیں اضافہ کر سکتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ اس گلہ میں سے ۲ یا ۴ شیر تفریق کیجئے تو کیا یہ ممکن ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ جس جنس کی اشیاء ہونگی اسی جنس کی شئے اس میں جمع یا اس میں سے تفریق کیجا سکے گی۔ یہی حال کسروں کا بھی ہے مثلاً $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{6}$ کو اگر جمع کرنے کو دیا جائے تو ان تمام کسرات کو ایک ہی مقدار کی کسروں میں منتقل کر لینا ہوگا۔ ان کی عام صورت یہ ہوگی۔ $\frac{4}{12}$، $\frac{3}{12}$، $\frac{2}{12}$، ان کسروں میں سب کے نسب نما ایک ہی مقدار کے ہیں۔ اب ان کسروں کا حاصل جمع وہی ہے جو $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{6}$ X کا ہے۔ اس لئے $\frac{4}{12} + \frac{3}{12} + \frac{2}{12} = \frac{9}{12}$ ایسے کسروں میں وہی عمل ہوگا جو آگے بیان کیا جا چکا ہے اسمیں نسب نما ۱۲ اس لئے بنایا گیا ہے کہ ۳، ۴، ۶ سے صحیح اعداد سے تقسیم ہونیوالا چھوٹے سے چھوٹا عدد صرف ۱۲ ہی ہو سکتا ہے یوں تو ۳، ۴، ۶ سے تقسیم ہونے والے اور بھی کئی اعداد ہو سکتے ہیں۔

مثلاً ۲۴، ۴۸، وغیرہ مگر ایسے اعداد میں سے وہی عدد لیا جاتا ہے۔ جو سب سے چھوٹا ہو کیونکہ بڑا عدد لینے سے پھر دوبارہ اس کو مختصر کرنا پڑے گا۔ اور اس کے اختصار سے وہی چیز حاصل ہوگی۔ جو چھوٹے سے چھوٹے عدد سے حاصل ہوتی ہے مثال کے طور پر ہم ذیل کے کسروں پر غور کریں گے۔

$\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{6}$ کو جمع کرنے سے ہمیں $\frac{9}{12}$ حاصل ہوا تھا جب کہ ۱۲ کو چھوٹا عدد فرض کر لیا گیا تھا۔ اب ہم ۲۴ لے کر دیکھیں گے اگر ۲۴ لیں تو کسر کی شکل حسب ذیل ہو گی۔

$$\frac{8}{24} + \frac{6}{24} + \frac{4}{24} = \frac{18}{24}$$

اب اس کو مختصر کرنے سے وہی $\frac{9}{12}$ حاصل ہوتا ہے جو ۱۲ کو فرض کر کے حل کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ ایک ایسا عدد جو مختلف علیحدہ اعداد سے تقسیم ہو سکے ان اعداد کا مشترک ذو اضعاف کہلاتا ہے خصوصاً ایسے کسروں کو سوال میں ایسا عدد جو چھوٹے سے چھوٹا ہو لیا جاتا ہے، جس کو مشترک ذو اضعاف اقل کہتے ہیں۔

مشترک ذو اضعاف اقل معلوم کرنے کا آسان طریقہ حسب ذیل ہوگا۔ مثلاً ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۱۶، ۲۴، کا ذو اضعاف اقل مطلوب ہو تو ہمیں سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ اعداد جو چار سے پورے پورے تقسیم ہو جائیں وہ یقیناً ۲ سے بھی تقسیم ہوں گے۔

مثلاً ۱۲، ۱۶، ۲۰، وغیرہ یہ اعداد چونکہ ۴ سے تقسیم ہو سکتے ہیں اس لئے یہ ۲ سے بھی تقسیم ہو جائیں گے اور علیٰ ہٰذا جو عدد ۶ سے تقسیم ہو وہ ۳ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسے سوالات میں سہولت کی خاطر ان اعداد کو جو دوسرے کے وفق ہوں خارج کر دینے سے کوئی ہرج نہ ہوگا۔ ان کو خارج کر دینے کے بعد بقیہ اعداد کا مشترک ذو اضعاف اقل نکالنا چاہیئے جب سوال بالا میں خارج ہونے والے اعداد ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ہیں بقیہ اعداد ۱۶، اور ۲۴ ہیں۔ اور یہ اعداد ایسے ہیں کہ ان کا مشترک ذو اضعاف اقل وہی ہوگا جو ان تمام خارج شدہ اعداد کا ہے یعنی حاصل شدہ مشترک ذو اضعاف اقل ان تمام خارج شدہ اعداد سے بھی پوری طرح تقسیم ہوگا۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان کا ذو اضعاف اقل کیا ہوگا۔ آیا ان کے ایسے اجزا بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں یا نہیں جو آپس میں مشترک ہوں یا کوئی ایسا عدد معلوم کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ پورا پورا تقسیم ہو سکے۔

۲، ۴، ۸، یہ اعداد ایسے ہیں کہ اگر ان سے ان اعداد (۱۶، ۲۴) کو تقسیم کیا جائے تو پوری پوری طرح تقسیم ہو جائیں گے۔ اگر ہم ۱۶۔ اور ۲۴ کو ۸ سے تقسیم کریں تو ہمیں علی الترتیب ۲ اور ۳ حاصل ہوں گے۔

۲ × ۸ = ۱۶ اور ۳ × ۸ = ۲۴ ۔

اس مساوات سے ظاہر ہے کہ ۸ ایک ایسا عدد ہے جو دونوں میں مشترک ہے
یعنی ۱۶ کے دو اجزائے ضربی حاصل ہوئے ۔ ایک ۸ اور دوسرا ۲۔ اسی طریقہ سے ۲۴
کے بھی دو اجزائے ضربی پہلا ۸ اور دوسرا ۳ ہوئے ان اجزائے ضربی میں ظاہر ہے کہ
۸ دونوں میں مشترک ہے۔ اس مشترک کو نکال کر پہلے سے ۲۔ اور دوسرے سے ۳ لئے گئے
اب ان تینوں کو آپس میں ضرب دینے سے حاصل ضرب مطلوبہ مشترک ذو اضعاف اقل ہوگا۔

اس لئے مطلوبہ مشترک ذو اضعاف اقل = ۸ × ۲ × ۳ = ۴۸ ۔

یہ ایسا چھوٹے سے چھوٹا عدد ہے جو ان تمام اعداد میں سے ہر ایک پر پورا تقسیم ہو سکتا
ہے جب کبھی مختلف اعداد کا مشترک ذو اضعاف نکالنا مقصود ہو تو یہی کہا جاتا ہے کہ ان
اعداد کا مشترک جز ضربی لے لیا جاتا ہے اور بقیہ ایسے اعداد لیتے ہیں۔ جو آپس میں مشترک نہ
ہوں اس کے بعد ان کو آپس میں ضرب دے لیتے ہیں۔ ان کا حاصل ضرب مطلوبہ مشترک
ذو اضعاف اقل ہوگا۔ مثال کے طور پر ۶، ۱۵، ۲۱، ۲۷ کا مشترک ذو اضعاف اقل نکالنا
ہو تو حسب ذیل عمل کریں گے یعنے ان کے اجزائے ضربی علی الترتیب معلوم کریں گے جو
مساوی ہیں ۲ × ۳، ۳ × ۵، ۳ × ۷، ۳ × ۳ × ۳

اس میں سے مشترک عدد نکال لیا گیا جو ۳ ہے بقیہ اعداد ۲، ۵، ۷، ۳ × ۳ بچے
اس لئے مطلوبہ مشترک ذو اضعاف اقل ان سب کا حاصل ضرب ہو جائے گا۔ یعنی۔

۳ × ۲ × ۵ × ۷ × ۳ × ۳ = ۳ × ۲ × ۵ × ۷ × ۹ = ۱۸۹۰

اکثر دفعہ ایسے سوالات کا عمل حسب ذیل طریقہ سے بھی ہوتا ہے مثلاً
۴، ۱۸، ۲۷، ۳۰ کا مشترک ذو اضعاف اقل مطلوب ہو تو ان کے بھی مشترک اجزائے
ضربی معلوم کر لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں صرف ۲ ہی ایسا عدد ہے جو سب میں مشترک
ہے اس لئے ان اعداد کو ۲ سے تقسیم کر دینا چاہئے۔

۲ | ۴، ۱۸، ۲۷، ۳۰
  | ۲، ۹، ۲۷، ۱۵

ظاہر ہے کہ اب ان میں ۹ وفق ہے ۲۷ کا یعنی جو عدد ۲۷ سے تقسیم ہو سکتا ہے وہ ۹
سے بھی ضرور تقسیم ہوگا اس لئے ۹ کو خارج کر دیا گیا۔ خارج کرنے کے بعد بقیہ اعداد ۲، ۲۷،

۱۵ بچ رہیں گے ان کا مشترک جزو ضربی ۳ ہوگا۔ اس لئے ۳ سے تقسیم کرنے سے عمل حسب ذیل ہوگا۔

$$3 \,\underline{|\; 6،\; 15،\; 27}$$
$$2،\; 5،\; 9$$

اس سے واضح ہے کہ ان اعداد کے مشترک اجزائے ضربی ۲ و ۳ تھے۔ اور دوسرے اجزاء ۲، ۹، ۵ ہیں۔ اس لئے مطلوبہ مشترک ذو اضعاف اقل

$2 \times 3 \times 2 \times 5 \times 9 = 540$ ہوگا۔

یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ طلبا غیر ضروری اعداد کے خارج کرنے سے محفوظ رہیں۔ ورنہ سوال غلط ہوجائے گا۔

اس کے بعد ہمیں طلبا سے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ $\frac{?}{12}$ کو $\frac{1}{2}$ سمجھیں جیسا کہ $\frac{1}{2} = \frac{6}{12}$ کے ہم دیکھ چکے ہیں کہ $\frac{1}{2} = \frac{6}{12}$ اگر ہم اس نئے نسب نما کو پہلے کے نما سے تقسیم کردیں تو حاصل وہی آئے گا۔ جو اس نئے کسر کا شمار کنندہ ہے۔

اور $\frac{2}{3} = \frac{4}{6}$ میں بھی وہی شکل ہے لیکن کچھ فرق بھی ضرور ہے۔ وہ یہ کہ پہلی کسر کا شمار کنندہ ایک نہیں بلکہ ۲ ہے۔

اگر ہمارے پاس $\frac{1}{2}$ ہو اور ہم یہ چاہیں کہ ۶ کے ساتھ ہم مقدار کسر (نسب نما میں) حاصل کریں تو ہم ۶ کو ۳ سے تقسیم کریں گے اور ہمارا شمار کنندہ اس نئی کسر کا وہی عدد ہوگا۔ جو ۶ کو ۳ پر تقسیم کرنے سے حاصل ہوا یعنی ۲۔ اس لئے نئی کسر = $\frac{2}{6}$

ان تمام امور کو مدنظر رکھکر ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ جب کسی کسر کا شمار کنندہ معلوم کرنا ہو جبکہ اس کا نسب نما دیدیا جائے اور ایک دوسری ہم مقدار کسر کے مساوی ہو تو ہم اس نئے نسب نما کو پہلے کے نسب نما سے تقسیم کریں گے۔ اور حاصل کو اس پہلے کے شمار کنندہ سے ضرب دیں گے۔ حاصل ضرب اس نئے کسر کا شمار کنندہ ہوگا۔ مثلاً

ایک کسر ایسی معلوم کرو کہ جس کا نسب نما ۲۴ ہو اور وہ کسر مساوی ہو $\frac{3}{4}$ کے ایسی صورت میں ہم ۲۴ کو ۴ سے تقسیم کریں گے جس سے ہمیں ۶ حاصل ہوگا۔ اب اس ۶ سے پہلے کے شمار کنندہ یعنی ۳ کو ضرب دیں گے تو $6 \times 3 = 18$ حاصل ہوگا جو نئی کسر کا شمار کنندہ ہوگا۔ اور نسب نما مساوی ہے ۲۴ اس لئے کسر = $\frac{18}{24}$

اب ہم ہر طریقے کے کسروں کو حسب بالا طریقوں سے جمع یا تفریق کر سکتے ہیں مثلاً

$\frac{7}{10} + \frac{6}{8} + \frac{12}{25} + \frac{14}{16}$ کو جمع کرو۔

اس میں سب سے پہلے ہمیں نسب نماؤں کا مشترک ذو اضعاف اقل نکالنا ہوگا۔

مشترک ذو اضعاف اقل نسب نماؤں کا = $5 \,|\, \underline{10،\ 8،\ 25،\ 16}$

$2،\ 8،\ 5،\ 16$

اس لئے $5 \times 5 \times 16 = 400$

اب اس عدد کو ۱۰ سے تقسیم کرکے حاصل کو ۷ سے ضرب دیں گے اور اسی طریقہ سے سب کو مثلاً

$\frac{7}{28}$ سے $\frac{7 \times 40}{400} = \frac{280}{400}$

$\frac{6}{8}$ سے $\frac{6 \times 50}{400} = \frac{300}{400}$

$\frac{12}{25}$ سے $\frac{12 \times 16}{400} = \frac{192}{400}$

$\frac{14}{16}$ سے $\frac{14 \times 25}{400} = \frac{350}{400}$

اب چونکہ ان تمام کسروں میں نسب نما ایک ہی ہے اس لئے ان کے جمع کرنے کے لئے صرف ان کے شمار کنندوں کا جمع کر لینا کافی ہوگا یعنی:-

$280 + 300 + 192 + 350 = \frac{1122}{400}$

تفریق کا عمل بھی بالکل اسی طریقہ سے ہوگا اسی قسم کے کافی سوالات (چند جمع اور چند تفریق کے) طلبہ سے حل کروائے جائیں۔ یہ مدرس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کتاب میں سے حل کروائیں یا خود ساختہ سوالات دیں جبتک کہ طلبا اس پر کافی مہارت نہ حاصل کرلیں اس سے آگے بڑھنا محض تضیع اوقات طلبہ و مدرس ہے (خود)

وجیہ الدین
مدرسہ سلطانیہ شاہ گنج حیدرآباد

شذرات

عالیجناب مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شیروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور حیدر آباد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ حیدر آباد کا بچہ بچہ صاحب ممدوح سے واقف ہے۔ اشاعت اسلام اور تعلیم نسواں کے جلسہ کی صدارت بمقام جالندھر فرماتے ہوے جو گراں بہا خیالات کا اظہار فرمایا، اس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے یقین ہے کہ نواب صاحب ممدوح کے ارشادات مشعل ہدایت کا کام دیں گے۔

تعلیم نسواں مذہبی نقطہ نظر سے

ملک کے جس گوشہ کی طرف آپ کان لگائیں گے تعلیم نسواں کا غلغلہ ملکہ شور سامعہ نواز ہوگا۔ اس بلند آہنگی میں جو دوسرا سُر ملا ہوا ہوگا وہ پردہ کی مذمت اور اس پر لعنت ہوگی۔ اس شور کو سن کر ایک اجنبی خوش ہوگا۔ کہ ہماری قوم تعلیم نسواں کے لئے کس قدر بیتاب ہے لیکن جب آپ اس میدان میں آئیں گے جہاں اقوال کی جانچ افعال سے ہوتی ہے دعوے دلیل سے جانچے جاتے ہیں۔ تو آپ کو جلد محسوس ہو جائے گا کہ وہ دور کے ڈھول تھے جو آپ نے سنے تھے ملک کے عرض و طول میں شاید ایک ہی مدرسہ نظر آئے وہ بھی ایسا کہ ابتدائی درجہ میں ہے، ان درس گاہوں کے منتہمیں سے آپ جب درد دل دریافت کریں گے تو پائیں گے کہ کس مپرسی کے شکوہ کے سوا ان کے پاس دوسرا مفہوم نہیں قوم کی بے پروائی سے مجبور ہو کر سرکاری مدد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سرکاری امداد وہ پابندیاں ساتھ لاتی ہے جو سلطنت کے مصالح اور ملک کے حالات کے لحاظ سے وضع کی گئی ہیں۔ اور جن کا نتیجہ وہ تعلیم ہے جس کا نقشہ ابھی آپ کی نظر سے گذرا ہے۔

اب اصل سوال پر غور کرنا چاہئے کیا یہی وہ بے معنی تعلیم ہے جس کو ہمیں طبقہ نسواں میں رائج کرنا چاہئے؟ دوسرا سوال مردوں نے اس تعلیم سے علمی و عملی کیا فلاح پائی ہے جو مستورات کو حاصل ہوگی۔

ان سوالوں کا جواب ایک اور صرف ایک ہے وہ یہ ہے کہ اس تعلیم کی بدولت طبقۂ نسواں شرافت اور مذہب کی پیدا کردہ ان صفات کو کھو بیٹھے گا جو صدیوں کی روایت اور پابندی کے بعد ان میں آج بھی مردوں سے زیادہ تاباں و درخشاں ہیں وہ کیا ہیں۔ حیا و عفت مذہب کی عظمت، عزیزوں کی محبت، ایثار یعنے اپنی راحت و مسرت دولت خلاصۂ کل یہ کہ اپنی ہستی کو دوسروں کی بہبود و بہتری پر قربان کر دینا، اس کی خاطر مٹا دینا ضبط نفس یعنے دنیا کے شور و شر سے متاثر ہو کر بیخود نہ ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان انمول جواہر کو کھو کر جو اوصاف طبقہ موصوفہ حاصل کرے گا وہ پوت اور کانچ کی خوش نمائی تو ضرور دکھا سکیں گی اصل قدر و قیمت سے عاری ہوں گی۔

ہمارے دوستوں کا سارا زور تخیل و کلام پردہ کی عظمت پر صرف ہو رہا ہے میں کہتا ہوں کہ پردہ ایک ذریعہ ہے ان صفات کے قائم رکھنے کا جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ اگر پردہ نے ان صفات کو قائم رکھا تو تم نہیں کہہ سکتے کہ وہ طبقہ مستورات کے لئے مضر تھا۔ اب اگر ان اوصاف کو محفوظ رکھکر پردہ اٹھا سکتے ہو بے تکلف دور کر دو لیکن دعوی حفاظت کرنے سے پہلے اپنی قوت حفاظت کا اندازہ کر لو تم خود اپنی حفاظت کیا کر رہے ہو۔ دعوی ہے آزادی کا، پھنسے ہوے ہو غلام کے دل ل میں اور غضب یہ کہ اس کو محسوس بھی نہیں کر سکتے غیروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو شکل میں، صورت میں، نشست و برخاست میں تخیل میں، عمل میں، دوسروں کی نقل ہی ہمارے لئے سرمایۂ ناز ہے اپنی ہر چیز سے ہر صفت سے بے زاری ہے شرمساری ہے۔ معلوم نہیں آزادی کا یہ مفہوم کہاں محقق ہوا! یورپ والوں کی عادتیں ان کے فیشن غرض جملہ زندگی کے لوازمے نتیجہ ہیں، ان کی دولت کے، ان کی ترقی علمی و عملی کے ملکی ضرورتوں کے ملکی آب و ہوا کے ہمارے لئے صرف ان کی تقلید کافی ہے ضرورت عدم ضرورت کی بحث نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ طبقۂ نسواں کی تعلیم کی بابت دو خیال نہیں ہو سکتے۔ ان کو زندہ رہنا ہے تو علم حاصل کرنا چاہئے اور اتنا حاصل کرنا چاہئے جتنا وہ حاصل کر سکتی ہیں۔ عالم نہیں فاضل نہیں۔ اس سے بھی بڑھکر علامہ و حکیم نہیں اور ایسی نہیں کہ نہ صرف قوم و ملک ملکہ دنیا ان کے علم و فضل پر فخر کرے مگر لازم ہے کہ حقیقی تعلیم سے فیض یاب ہوں جس میں علمی مذہبی قومی اور ملکی روح ہو نام کی بے مغز تعلیم نہ ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا مدرسہ بنات المسلمین کی عزت میرے دل میں اپنی بنا

پیدا ہوی کہ مجھ کو اس کی کیفیت سے دریافت ہوا کہ اس کے بانی محض نام ونمایش کے جویا نہیں بلکہ لڑکیوں کو وہ تعلیم دینا چاہتے ہیں جس میں اسلامی اور قومی روایات کا عنصر غالب ہو اور جس کو پڑھ کر لڑکیاں عالم بننے کے ساتھ مسلمان بھی رہیں نام کی نہیں حقیقی اور سچی مسلمان

آخر میں خود طبقۂ نسوان کی خدمت میں میری مخلصانہ گزارش ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ میں جو اوصاف حیا وعصمت ایثار مذہب کے احترام اور عزیزوں پر جاں نثاری کے ہیں وہ صدیوں کی جانکاہی اور دل سوزی سے پیدا ہوے ہیں۔ آپ کی ماؤں اور نانیوں کی امانت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ صرف یہی نہیں اسلام کی وراثت ہے ملک اور قوم کی عزت ہے انکی حفاظت آپکا اولین فرض ہے جو سیلاب فیشن اور ہوا پرستی کا اٹھا ہے اس کے مقابلے میں نسوانی استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہنا ایسا واقعہ ہوگا جس کو صدیوں تک تاریخ یاد رکھے گی اور آپ کی ہمتوں پر آفریں کہے گی۔

جو بیرونی دنیا کے سبز باغ آپ کو دکھاے جا رہے ہیں۔ اُن میں ایک مسلم خاتون کے لئے ہرگز وہ پھل پھول نہیں ہیں جن پر صفات بالا قربان کر دی جائیں اس کی کھلی ہوی دلیل وہ زندگی ہے جو سب کچھ کھو کر ہمارے مردوں نے حاصل فرمائی ہے اور جس کی مختصر کیفیت اوپر عرض کر چکا ہوں۔

خدا کرے کہ میری التجا کامیاب ہو۔ سامعہ خراشی کی معذرت ختم کلام ہے۔

جلسہ سالانہ مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ

بتاریخ ۵ امرداد ۱۳۴۱ف مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ کا سالانہ جلسہ بصدارت جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد کوتوالی تعلیمات عدالت و امور عامہ منعقد ہوا۔ مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال پرنسپل نے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ پڑھی جس میں صاحب موصوف نے یہ ظاہر فرمایا کہ مدرسہ نے نہ صرف تعلیمی حیثیت سے بلکہ گیمس میں بھی نمایاں ترقی کی ہے مسٹر پکتھال کی تقریر کے اختتام پر انگریزی اور اردو میں طلبہ کا تقریری مقابلہ ہوا جنا۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر نے طلبہ کو انعامات تقسیم کرنے کے بعد ایک پرمغز تقریر فرمائی جس میں صاحب موصوف نے طلبہ کو نصیحت کی کہ علم کو علم کے لئے حاصل کرنا چاہئے اور علم حاصل کر کے "انسان بننے کی کوشش کرنی چاہئے"۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ جو کتابیں طلبہ کو بطور انعام دی گئی ہیں۔ ان میں دو کتابوں کے عنوان نہایت سبق آموز ہیں یعنی

A Gateway to Books
Eyes and No Eyes

مدرسہ اور کالج کا نصاب ختم کرنے یا ڈگری حاصل کرنے سے تعلیم کی تکمیل نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سے صرف علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ دوسری کتاب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بعض اشخاص کو آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور بعض کو نہیں۔ آنکھیں سب کو ہیں۔
لیکن اُن کے ساتھ دل و دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تب ہی ہم جیسا کہ چاہیے دیکھ سکتے ہیں۔

جلسہ تقسیم انعامات مدرسہ تحتانیہ سرپور

تاریخ ۲۰ اردی بہشت ۱۳۴۱ف بوقت ۵ بجے دن مدرسہ ہذا میں ایک جلسہ زیر صدارت عالیجناب سید ابو تراب صاحب بی اے (علیگ) تحصیلدار تعلقہ سرپور ترتیب دیا گیا تھا جس میں مقامی حکام و اولیا ر طلبہ و شرفاء تعلقہ شریک تھے۔ صدر صاحب جلسہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور قرأت کلام پاک اور حمد و نعت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ طلبائے مدرسہ نے بیتیں نظمیں خوش الحانی کے ساتھ سنائیں۔ مدرسین مدرسہ نے اردو اور تلنگی میں موثر تقریریں کیں۔ بچوں کا مکالمہ نہایت ہی دلچسپ رہا۔
عالیجناب صدر صاحب نے (۲۲) تمغے جو متفرق کھیلوں میں طلبہ نے حاصل کئے تھے۔ تقسیم فرمائے۔ اور مکالمہ اردو میں سراج الاسلام خاں طالب علم جماعت دوم کو اپنی جانب سے ایک تمغہ اسی وقت عنایت فرمایا اس کے علاوہ صدر صاحب ممدوح نے مدرسہ کے غریب و نادار طلبہ کے لئے مبلغ (صمہ) روپیہ اور اسپورٹس کے لئے مبلغ (صمہ) روپیے مرحمت فرمائے جس کا مدرسہ ہذا بے حد ممنون و شکرگزار ہے ختم جلسہ کے بعد معزز مہمانوں کی خاطر تواضع چاء وغیرہ سے کی گئی۔

جلسہ گورنمنٹ مدرسہ تحتانیہ لکشٹی پیٹھ

سال حال نظارت درجہ اول ضلع چینور تعلقہ آصف آباد میں گورنمنٹ کا انعقاد عمل میں آیا جس کے فائنل اسپورٹس ۳۰ رفروردی ۱۳۴۱ف سے یکم اردی بہشت ۱۳۴۱ف تک بمقام لکشٹی پیٹھ ہوئے۔
۲۸ فروردی ۱۳۴۱ف کی شام ہی سے مدارس حلقہ ہذا کے بہتیرے طلبہ اپنے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں حاضر ہوئے طلبہ کے مجمع کثیر سے لکشٹی پیٹھ میں خاصی رونق اور چہل پہل تھی

مسلسل تین دن تک صبح و شام ملکی کھیلوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔ کلب کا وسیع میدان معززین و تماشہ بین حضرات سے ہر وقت پُر رہتا تھا۔

تیسرے دن شام کے ۴ ½ بجے سید احمد صاحب صدر مدرس نکلشٹی پیٹھ و معتمد ٹورنمنٹ کی تحریک اور مولوی محمد عبدالجبار صاحب صدر مدرس اندارم کی تائید پر جناب مولوی محمد عبید اللہ صاحب کاظمی تحصیلدار نے کرسی صدارت کو زینت بخشی اور تقسیم انعامات کا جلسہ حمد باری تعالیٰ سے آغاز ہوا۔ پھر مولوی شیخ ناظم علی صاحب مددگار مدرسہ نکلشٹی پیٹھ نے علم و ورزش کے فوائد بتاتے ہوئے ایک مدلل مضمون پڑھا۔ اور مسٹر سمدر الہ راملو صاحب مدرس مدرسہ موصوف نے تلنگی میں تقریر کی۔ جناب رام کشن راؤ صاحب ناظر حلقہ ہذا نے بہت سارے ضروریات مدرسہ کی نشاندہی کرتے ہوئے صدرنشین صاحب کی توجہ بحیثیت تحصیلدار مبذول کرائی اس کے بعد جناب صدرنشین صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اختتامی تقریر فرمائی اور دست مبارک سے اعزازی تمغہ طلبہ کو عطا کئے۔ انعامات وغیرہ کے لئے جناب صدرنشین صاحب نے مبلغ (۱۵ عہ) روپیہ سکہ عثمانیہ سے امداد فرمائی۔ ایک خاص اعزازی تمغہ جناب کرمارا ؤ صاحب متعلقہ آفیسر آبپاشی نے سب سے بہتر کھلاڑی کے لئے عطا فرمایا۔ جو عبدالمجید نامی طالب العلم نے حاصل کیا۔ جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اعلیحضرت بندگانعالی اور شہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخندہ فال کی ترقی عمر و دولت و اقبال و جاہ کی دعا پر ختم ہوا۔ معززین و حاضرین کی تواضع چائے و پان سے کی گئی۔ اور طلبہ میں شیرینی تقسیم ہوئی۔

افتتاح عمارت سرکاری مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل بلدہ

بتاریخ ۲ اردی بہشت ۱۳۴۱ف ۹ بجے صبح جلسہ افتتاح عمارت جدید مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل سرکار عالی واقع نظام شاہی روڈ منعقد ہوا مقررہ وقت سے پہلے ہی ارکان مدرسہ مذکور جدید عمارت میں مصروف انتظام تھے۔ معزز مہمانوں اور اولیاء طلبہ کی بروقت تشریف آوری سے حاضرین جلسہ کی تعداد معقول تھی۔ تحریک صدارت کے لئے مولوی سید علی صاحب ایم۔ اے کنٹب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ کا اسم گرامی بالاتفاق تجویز کیا گیا۔ مولوی عبدالرؤف صاحب وکیل ہائیکورٹ نے تحریک صدارت کے ضمن میں جلسہ کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ کی ذات ستودہ صفات کو نہایت موزوں تبلایا اور فرمایا کہ ان کی شخصیت

محتاج تعارف نہیں۔ مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ کی حد تک جو روزافزوں ترقی خاص شہر حیدرآباد میں دیکھی جارہی ہے وہ انھیں کی کوشش بلیغ کا ثمر ہے۔ یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس جلسہ کی صدارت کے لئے اُن کے مقابلہ میں کوئی اور بہتر انتخاب بحالت موجودہ نہیں کیا جاسکتا۔ شمس الدین محمد عثمان صاحب۔ مددگار مدرسہ نے تحریک صدارت کا خیر مقدم کرتے ہوئے منجانب مدرسہ تائید کی اور کہا کہ انجمن اساتذہ کا قیام اغراض و مقاصد تعلیم کی زبانی اور تحریری اشاعت سید علی اکبر صاحب کے دم قدم سے وابستہ رہی ہے علاوہ ازیں موصوف نے یورپ کے ممالک کی سیاحت فرمائی اور وہاں کے تجربات و مشاہدات بچشم خود دیکھنے کے بعد رسالہ ٹیچر کے اوراق میں بیش بہا تعلیمی مضامین وقتاً فوقتاً طبع فرماکے اہل ملک کی بڑی خدمت انجام دی۔ پس یہ فریضہ نہایت خوش آیند معلوم ہوتا ہے کہ صدق دل سے تحریک صدارت کی تائید کیجائے اور منجانب مدرسہ اس امر کی استدعا بھی بے محل نہ ہوگی۔ اگر اس موقع پر حالیہ سفر یورپ کے جدید اور تازہ علمی تحریکات سے مدرسین کو بہرہ ور ہونے کا شرف عطا کیا جائے۔ تاکہ ایک بگڑے ہوئے ملک کی نظام معاشرت کی ذہنی جسمانی اور اخلاقی اصلاح تعلیم کے ذریعہ اس قدر دشوار تر ہے جس میں عمر اور وقت کا بہترین حصہ مدرسین کو صرف کرنا پڑرہا ہے منتخب صدرنشین نے حاضرین جلسہ کے پرمسرت نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے کرسی صدارت کو زینت بخشی۔

حسب نظام العمل محترم صدر صاحب کی تحریک پر جلسہ کی ابتداء قرآت سے ہوئی جس کو مولوی سید فرید بادشاہ صاحب مددگار مدرسہ نے مناسب اور دلنشین آواز میں مجمع کے روبرو ادا کیا بعد ازاں مولوی عبدالحکیم صاحب مدرس نے ایک دلکش اور دلآویز نظم موقع کے مناسبت سے پڑھی جس کو حاضرین جلسہ نے نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا۔ اس کے بعد مولوی شیخ علی حسین صاحب بی اے بی ٹی۔ صدر مدرس مدرسہ نے اعلیحضرت سلطان العلوم موجودہ فرمانروائے ملک دکن کے دور ہمایونی کی تعلیمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر مدرسہ کے لئے ایک خاص عمارت کا ہونا لازمی قرار دیا۔ اور مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل کی اس خصوص میں خوش قسمتی پر فخر و مباہات کا اظہار کیا اختتام تقریر میں مسٹر موصوف نے فرمایا کہ اس عمارت کی تعمیر خاص کر ناظم صاحب تعلیمات اور صدر محترم ہی کی کوششوں سے

معرض وجود میں آئی ہے آخر میں صدر صاحب مدرسہ نے صدر نشین صاحب جلسہ سے مدرسہ کے افتتاح کی استدعا کی۔

محترم صدر نشین صاحب نے اپنی تقریر کے آغاز میں تحریک و تائید صدارت کی نسبت موزوں اور غیر موزونیت کے بارہ میں اپنی ہیچمدانی کا اظہار کرتے ہوے عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات کا ذکر فرمایا جن کی صدارت کے لئے یہ جلسہ خاص طور پر مناسب تھا۔ مگر ان کی مصروفیتوں کے مدنظر عدم شرکت پر اظہار افسوس کے ساتھ موصوف کی دلچسپی اور تعلق خاطر کا اظہار کیا جو انھیں عملہ مدارس کے لئے سرکاری عمارت مہیا کرنے میں رہتا ہے۔ اپنے انتخاب صدارت جلسہ کے لئے صدر نشین صاحب نے حاضرین جلسہ کے روبرو شکریہ ادا کیا اور سابق صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ مولوی سید آغا حسین صاحب مرحوم کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان کا قول صادق ہوتا نظر آتا ہے جب کہ قرب وجوار کی آبادی کا لحاظ کرکے ایک مدرسہ فوقانیہ کی ضرورت ہوگی سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے صدر نشین صاحب نے بیان کیا کہ دس سال قبل سررشتہ تعلیمات نے اس عمارت کو جس میں سجن لال کی گرنی تھی خرید تھا۔ موجودہ مدرسہ کے روزافزوں ضروریات کو دیکھکر مرحوم صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ کے توقعات کے پورا ہونے کا امکان بتلایا اور کہا کہ ایک وسیع عمارت کی ضرورت دن بدن ناگزیر ہوتی جارہی ہے جس میں موجودہ مدرسہ وسطانیہ کو فوقانیہ کے درجہ تک پہونچادیا جائے۔

تعلیمی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ اس مدرسہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان کی کہ اساتذہ مدرسہ ہر وقت یکجہتی اور باہمی اشتراک عمل سے کام کرتے ہیں دوسرے یہ کہ اولیا و سرپرست طلبہ مدرسے کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں اولیائے طلبہ اور مدرسین کے باہمی اتحاد عمل کا ذکر کرتے ہوے محترم صدر نشین صاحب نے یورپین ممالک کے عام لوگوں کی تعلیمی جد وجہد کو بیان فرمایا خصوصاً ملک جرمنی میں طلبہ کے والدین مدرسہ کے کاموں میں مدرسین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

آخر میں دعا اور شکریہ کے بعد جلسہ تقریباً دس بجے ختم ہوا بعد ختم جلسہ محترم صدر صاحب اور دیگر حاضرین جلسہ نے جدید عمارت کا معائنہ فرمایا۔ اور اس تقریب میں طلباء مدرسہ کو اس روز تعطیل دی گئی۔

مدرسہ وسطانیہ لنگسگور میں کیمپ فائر

بتقریب تشریف آوری عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف بتاریخ ۷ ار اردی بہشت ۱۳۴۱ ف بروز پنجشنبہ مظاہرہ اسکوٹنگ اور شب میں کیامپ فیر پیش کیا گیا مدرسہ کی عمارت اور اس کا ماحول رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

مختلف طریقوں سے اسکاوٹس نے ڈرل اور دریائی ساحل کے کنارے جھونپڑی سازی کا مظاہرہ کیا اور اسکوٹس کی دوسری جماعت نے فسٹ ایڈ کا کام عملی طور پر پیش کیا اس کے علاوہ مختلف کھیلوں کے مظاہرہ ہوئے۔ اختتام سے پہلے قومی ترانہ ہوا۔ بعد میں اسٹیٹ فلیگ کی سلامی عمل میں آئی کیامپ فیر میں شرکت کی درخواست عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد نعرہ مسرت کے ساتھ برخاست عمل میں آئی۔

دن بھر کی مصروفیت کے باوجود عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف بہ ہمراہی جناب دوم تعلقدار صاحب حلقہ لنگسگور کیمپ فائر کے ملاحظہ کے لئے شب میں تشریف فرما تھے۔ بعض وکیل صاحبین اور معززین بھی شریک جلسہ تھے اور اسکوٹس نے مختلف لباس میں نمودار ہو کر مختلف کام کئے۔ بعض دلچسپ مکالمہ بھی ہوئے۔ کیاپٹن لیونرڈ من جو ہندوستان کے اسکوٹ کے سرپرست و حامی ہیں ان کی نقل کی گئی۔ جو بڑی دلچسپ اور تفنن آمیز تھی۔ بعض نے دھنگر اور پٹیل کی نقل کو نہایت دلچسپ ظرافت انگیز پیرایہ میں ادا کیا ختم مظاہرہ پر اسکوٹس نے اکھٹے ہو کر سریلی آوازمیں قومی ترانوں کو الاپا کیامپ فیر کے اختتام پر مولوی محمد جیلانی صاحب بی۔ اے۔ صدر مدرس نے اپنی تقریر میں اسکوٹس کے چند قابل تحسین کارناموں کو پیش کیا اور یہ بتلایا کہ اسکوٹنگ کی مبارک تحریک کو عالمگیر ہر دلعزیزی حاصل کئے ہوئے بیس سال ہوتے ہیں لیکن مدرسہ ہذا میں اس تحریک کا آغاز ہو کر بیس ہفتہ بھی نہیں ہوئے لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اسکوٹس میں خاص جوش ہمدردی و موانست کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصیبت کے موقع پر اسکوٹس اپنی جان پر کھیلنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ محمد یوسف نامی اسکوٹ نے تالاب کے کنارے خطرناک راستہ پر جب گھیل کے جھکنے سے بنڈی والا بنڈی کے نیچے آرہا تھا۔ اپنی ذاتی کوشش و جسارت اور ہمدردی کو کام میں لا کر ہلاک ہوتے ہوئے

آدمی کی جان بچائی جس سے اس کے بائیں کولہے پر سخت چوٹ آئی بے نیازی کے ساتھ اس
ہنڈی والے کو گھر پہنچا دیا جب معاوضہ پیش کیا گیا تو نیکی اپنا معاوضہ آپ ہے سمجھ کر اس
نے قبول کرنے سے انکار کیا ۔

مدرسہ ہذا کے اسکوٹس نے جناب صوبہ دار صاحب و مسٹر بنی معتمد مال کے تشریف
آوری کے موقع پر پیشوائی کی خدمت ادا کیں اور اپنے کام کا مظاہرہ کیا ۔ آبشار جلدرگ
پر جناب کیپٹن لیونرڈ من صاحب کی معیت میں کرائسٹ کیمپ کے موقع پر اسکوٹس نے دربانی
و سنتری کے خدمات ادا کرنے کو بھی مستحسن سمجھا ۔ آخیر میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے عالیجناب
صدر مہتمم صاحب تعلیمات و جناب ڈویژن صاحب کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا ۔

بعد ازاں عالیجناب مولوی سید حسین صاحب صدر مہتمم تعلیمات سمت گلبرگہ
نے جمیع اسکوٹس و حاضرین کو مخاطب فرماتے ہوئے اسکوٹنگ کے اغراض و مقاصد پر جامع
و مانع تقریر فرمائی ۔ آپ نے یہ بتایا کہ یہ کوئی جدید تحریک نہیں ہے ۔ ہمدردی و موانست کی
تعلیم و تلقین زمانہ قدیم سے انسانی اداروں میں ہوتی چلی آئی ہے لیکن مختلف ناموں سے
یہ تحریک یاد کئے جانے کی وجہ سے اس کی قدامت کا پتہ نہیں چلتا ہے ۔ سر بیڈن پاول
کی یہ مبارک تحریک سارے عالم میں اپنی برادری کو قائم کرتی ہے ۔ بلا امتیاز مذہب و
ملت ایک مشرقی اسکوٹ دوسرے مغربی اسکوٹ کا بھائی ہے ۔ اس تحریک کا حقیقی منشا
یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے کام آئے اس طریقے سے دیئے سے دیا سلگتا ہے یعنی اخوت
و ہمدردی شیوۂ حیات ہو ۔ اپنے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے عالیجناب صدر مہتمم صاحب نے
اسکوٹ ماسٹر مسٹر حبیب اور جمیع اسکوٹس کے کارہائے نمایاں پر مسرت کا اظہار فرمایا
اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسکوٹس کو بیانڈ عطا کرنے کا
وعدہ فرمایا ۔ بعد ازاں اسکوٹس نے اپنے بلند آہنگیوں سے نعرۂ مسرت بلند کیا اور جلسہ
برخاست ہوا ۔

جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ کنٹرمیوشن

جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ کنٹرمیوشن موضع کولور تعلقہ یادگیر ضلع گلبرگہ شریف
تاریخ ۵ ماہ اسفندار ۱۳۴۱ ف روز جمعہ زیر صدارت جناب سوامی
سرما وڈیا ڈیا صاحب بوقت سہ پہر بمقام فٹ بال گراونڈ منعقد
ہوا ۔ جس میں علاوہ اولیائے طلبہ و دیگر معززین اطراف و اکناف

کے آدمیوں کا مجمع کثیر تھا۔ گراونڈ کو رنگارنگ کی جھنڈیوں سے سجا کر پر لطف بنایا گیا تھا۔ مدرسہ ہذا کی عثمانیہ اور ستوار کی خانگی ٹیم کے مابین میاچ تھا جس میں مدرسہ ہذا کی ٹیم دو گیم سے سبقت لے گئی۔ اس کے بعد شیخ علی صاحب صدر مدرسہ کی تحریک اور مسٹر شنکر یا صاحب مدگار کی تائید پر مسٹر سوامی جی نے کرسی صدارت کو زینت بخشا جلسہ کا آغاز حمد باری تعالی سے کیا گیا۔ ازاں بعد شیخ حسن اور بوراجیا تلمیذان مدرسہ نے اردو و کنڑی میں علم اور وقت پر مضمون پڑھے۔ من بعد صدر صاحب مدرسہ نے اول الذکر عنوان پر تقریر کرتے ہوئے حاضرین کو توجہ و ترغیب دلائی۔ اور بعد ازاں جناب صدر نشین صاحب نے بھی عنوان بالا پر بالکنڑی نہایت پر اثر و دلپذیر تقریر فرماتے ہوئے تحصیل علم کا شوق دلایا۔ اور جناب ساہو بوراجیا صاحب نے حاضرین کا فوٹو کھچوا کر جلسہ کی رونق کو دوبالا فرمایا۔

اختتام پر جناب صدر نشین صاحب اور معززین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھولوں کی ہار پہنائے گئے اور قریب مغرب جلسہ برخاست ہوا۔

ماس ڈرل جناب سید محمد ہادی صاحب ناظم بائی اسکاوٹ نے اس سال بتاریخ ۲۴ مارچ ۳۲ء شام کے ۵ بجے بمقام سٹی پولیس گراونڈ مدرسہ کے طلبہ کی ماس ڈرل کا انتظام نہایت ہی وسیع اور اعلی پیمانے پر کیا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ اُن طلبہ کو جو اسپورٹس میں شریک ہونے سے رکتے ہیں اور جن کی طبیعت میں جھجک ہے شرکت کا موقع دیا جائے۔ تقریباً تیرہ سو طلبہ نے زیر کمان وفادار خانصاحب اجتماعی ورزش میں حصہ لیا جو نہایت ہی شاندار اور کامیاب تھا۔ حاضرین جلسہ اور عالی جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد تعلیمات نے ڈرل ملاحظہ فرما کر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ پانچ جج ڈرل کے دوران میں یہ دیکھتے رہے کہ کس مدرسہ کے طلبہ ہم آہنگی اور صحت کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ڈرل کے اختتام پر فوقانیہ نام پلی کو شیلڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔

نظام العمل کا دوسرا حصہ خصوصی کرتب کے لئے مختص تھا۔ اس میں مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی کا مظاہرہ سب سے بہتر طے پایا اور اسی مدرسہ کو کپ عطا کیا گیا۔

اس کے بعد مسٹر سید محمد ہادی نے تقریر کی اور ماس ڈرل کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نواب لطف الدولہ بہادر کو ریاست کے طلبہ کی جسمانی ترقی سے گہری دلچسپی ہے ممدوح الشان نے محض ترغیب اور تشویق کی خاطر یہ خوشنما چیلنج شیلڈ اور کپ

عنایت فرمایا ہے۔ اس گراں بہا عطیہ کے لئے بصمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہوئے مقرر نے بازی گاہ کی اہمیت بتائی اور عالیجناب معتمد صاحب تعلیمات سے استدعا کی کہ اس کے حصول کے لئے ضروری امداد فرمائیں۔

آخر میں نواب اکبر یار جنگ بہادر نے انعامات تقسیم فرمائے۔

سالانہ اسپورٹس طلبائے مدارس بتاریخ ۳ و ۴ مارچ ۳۲ء گوشہ محل کے حوض میں منعقد کئے گئے۔ نوسو طلبائے کالج اور مدارس نے اس میں حصہ لیا پچھلے سال کے مقابلہ میں سال حال نمایاں طور پر ترقی ہوی۔ نظام کالج اور چادر گھاٹ ہائی اسکول کے طلبہ کئی شرطوں میں کامیاب رہے اور انہی دونوں مدارس کو چیمپن شپ کے کپ بھی ملے۔

مدرسین کی ریلے ریس بہت دلچسپ اور کامیاب رہی گو اس شرط کا اضافہ اسی سال کیا گیا مگر ۱۲۔ مدارس کے مدرسین نے اس میں حصہ لیا۔ ہرچند ویسلین مشین ہائی اسکول کے مدرسین نے مقابلہ خوب ہی کیا مگر کامیابی کا سہرا نظام کالج کی ٹیم کے سر رہا۔

شرطوں کے اختتام پر مسٹر سید محمد ہادی معتمد عمومی نے تقریر کی اور ان عہدہ داروں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ضروری امداد و اعانت سے دریغ نہ فرمایا۔ آخر میں نواب معین الدولہ بہادر نے جو شرطوں کا معائنہ بکمال دلچسپی وانہماک فرماتے رہے جیتنے والے طلبہ کو انعام تقسیم فرمائے۔

اسپورٹس کے انتظامات تشفی بخش تھے اور تماشبینوں کا مجمع بھی بخوبی ضبط میں رہا۔

اشتہار

اردو اکادمی جامعہ ملیہ ۔ دہلی

جامعہ ملیہ کے مقاصد میں علمی تحقیق اور اشاعت علوم ایک بہت اہم مقصد ہے اس کا جو وسیع اور مکمل نظام ارباب جامعہ کے پیش نظر ہے اسے عمل میں لانا فی الحال ممکن نہیں اس کے لئے بہتر زمانے کا انتظار ہے جو بہت جلد آنے والا ہے ۔ مگر اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا مناسب نہیں اس لئے جو کچھ تھوڑی بہت علمی خدمت اسوقت ہوسکتی ہے وہ کی جا رہی ہے

جامعہ کی اردو اکادمی کے مختصر قواعد ارباب علم کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں اور ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ اکادمی کے رکن بنیں اور اس کے منتظمین کی ہمت افزائی فرمائیں اس ذریعے سے انھیں بڑی آسانی ملے اردو کی بہترین نئی کتابیں پہنچ جایا کریں گی اور ایک مفید ادارے کی مدد بھی ہوجائیگی

(ڈاکٹر) سید عابد حسین ایم اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ۔ ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ

مختصر قواعد

۱ ۔ جامعہ ملیہ کا شعبہ تصنیف و تالیف "اردو اکادمی" کہلاتا ہے ۔ ۲ ۔ اردو اکادمی کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرا کے شائع کرے ۳ ۔ اکادمی ہندوستان کی ان علمی انجمنوں اور ناشروں کے ساتھ اتحاد عمل رکھتی ہے ۔ جو اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں ۔ اور ان کی قابل قدر کتابوں کی اشاعت میں حسب مقدور مدد کرتی ہے ۴ ۔ اکادمی کی طرف سے ایک علمی رسالہ "پیام تعلیم" شائع ہوتا ہے ۔ ۵ ۔ اکادمی کے رکن وہ حضرات ہو سکتے ہیں جو چوبیس روپے سالانہ پیشگی ادا کریں یا اگر کسی وجہ سے یکمشت للعہ ادا کرنا ممکن نہ ہو تو ارکان کی سہولت کیلئے یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ یہ رقم کم از کم چھ چھ روپیوں کی چار قسطوں میں ہر سہ ماہی کے شروع میں ادا کر دی جائے ۔ ۶ ۔ ارکان کی خدمت میں ہر سال چوبیس روپئے کی کتابیں پیش کی جائیں گی اور جامعہ اور پیام تعلیم" جن کا مجموعی چندہ ساڑھے سات روپئے سالانہ ہے بلاقیمت نذر کئے جائیں گے ۔ ۷ ۔ ارکان کو سال کے شروع میں اکادمی کی مجوزہ مطبوعات کی فہرست بھیجدیا کریگی اور جب کوئی کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو فوراً ان کی خدمت میں روانہ کر دی جائے گی ۸ ۔ اس کے علاوہ ان کتابوں کی فہرست بھی بھیجی جائیگی جو دوسری علمی انجمنوں اور مختلف ناشرں کی طرف سے شائع ہونے والی ہیں اور ارکان سے درخواست کی جائے گی کہ ان میں سے اچھی کتابیں منتخب فرمالیں جو اردو اکادمی کی کتابوں کے ساتھ ملکر چوبیس روپئے سے زیادہ کی نہ ہوں یہ کتابیں بھی جس وقت وصول ہونگی فوراً ارکان کی خدمت میں روانہ کی جائیں گی

جو صاحب ان شرائط پر اکادمی کے رکن بننا پسند فرمالیں وہ ناظم اکادمی کو اپنے نام اور پورے پتے سے مطلع فرمادیں

thing else as is often the case. It is here that religion, by bringing to bear the deeper forces of life on the problem, can be an invaluable ally. Further, if we are to preserve the equilibrium between thought and action, it is also necessary to create situations for the exercise of the good or altruistic idea. It is so easy to be good in intention only. Goodness must be wrought into character and action and it is to this end we must apply our efforts. Situations can be thought out whereby the ideal it is desired to inculcate can find expression. To take one instance from classic school literature the Head in "Tom Brown's School Days" decides to give wayward Tom the responsibility of looking after little Arthur, thus bringing help to a weaker pupil in the way it was needed and at the same time saving Tom to his better self. Such situations both individual and in a more social way often developing into extra-mural activities will be a great help towards achieving the end aimed at.

The value of unconscious influences, both in the home and in the school is also emphasised by Mr. Rahman who deplores the example the boy often gets in his home which by contrast must confuse his moral sense. The School can only correct this by doing what is, after all, one of its main objects, viz., turning out better parents for the next generation. As regards the school influence, that complex intangible thing we call the "tone" or "ethos" of a school, every effort should be made to develop it. Schools in India have not given sufficient time and thought to this very necessary factor in school life and much more could be done to encourage it. It is astonishing how a boy responds to his environment in this way. He adopts the school attitude and method of viewing things often unconsciously and in six months one has known a boy quite changed as a result of it. In this connection we would refer readers to an article by Dr. Krishnayya in our last issue which contains valuable suggestions on this subject.

Editorial

One of the most striking and hopeful aspects of Education to-day is the fact that many schools are reaching out towards a larger social interpretation of their task. Statesmen also are realising, as never before, the silent yet powerful shaping influence of the school in the life of the nation. To formulate a high individual and social ideal is comparatively easy, but it is harder to leave individualism behind in practice. It is the understanding of the real nature of the problem and definite action that is wanted and in this respect it seems to us that the article by Mr. M. A. Rahman on "This Character Formation Business" goes to the heart of the problem.

As his title implies, there is any amount of lip-service to the ideal of character formation and citizenship as constituting the chief aim of the schools. But he points out, in the last analysis, all pay tribute to the successful man, often irrespective of the moral issues involved, and it is this that vitiates much of our effort and tends to give an atmosphere of unreality to the whole process of moral instruction. To the pupil it seems to be the "sentimental ethics of unsuccessful strangers."

Dr. Littleton, late Head Master of Eton, in one of his books also calls attention to the same thing. He says when talking with parents over the future of their boys, all invariably state, that they want their sons to be turned out good men. On his enquiring what is exactly meant by the term "good," it transpires that what they really want is for the world to *think them good*—a vastly different thing. It is success that is the real desideratum. This then is the real problem, to get our criterion right,—to see that goodness is valued for its own sake, and not construed in terms of some-

inaccuracies. The future India is to be the resultant of all the healthy forces leading to co-operation and goodwill between the various communities and also of the sum-total of all that was and is best in the cultures of the different races inhabiting this vast country of ours. Then again the point that we are world-citizens should be emphasised. Great stress ought equally to be laid on the fact of the unification of the world. An earnest teacher will find from this book some help in this direction also.

We are, therefore, of opinion that the book will be eminently useful both to the teachers and the taught in all the High Schools where English is the medium of instruction in History. Its moderate price and nice get-up should add to its popularity.

G. A. C.

All India Education Bulletin of All India Federation of Teachers' Association, February, 1932, Edited by D. P. Khattry, B. A., L. T., Honorary Secretary, All India Federation of Teachers' Associations, Price 6 Annas.

We congratulate Mr. Khattry on bringing out this useful and interesting Bulletin, which, besides giving his Report for 1931, contains the full texts of the Reports of the All India Compulsory Primary Education Committee and the Text Book Committee. An Urdu translation of ~~the~~ important portion of the Bulletin appears in our Urdu Section.

Editor.

The second part of Mr. Jabbar's article on Manual Training will appear in our next issue.

Editor.

quotation the source of which is not mentioned. The reader is still left in doubt regarding the probability of the incident. If the cell was really 18 ft. square, could it possibly hold 146 prisoners? Some further light could have been thrown on the incident. Estimates of the characters and the achievements of great rulers like Harsha, Mohamad Tuglak, Akbar, Aurangzeb and Shivajee have been judiciously made. While discussing the significance of the religious experiments of Akbar the Great, the author says: "After issuing the 'Infallible Decree' in 1579....................he showed a positive hatred for Mohamedanism. He forbade even naming of children after Mohamed the prophet." (page 225). We differ from such a view of Akbar's eclecticism which arose not from hatred, but out of his deep conviction that 'There is good in every creed; let us adopt what is good and discard the remainder.' Col. Malleson in this connection rightly observes,, "He declared himself to be the interpreter of the religion of which the Prophet had been the messenger in the sense of teaching its higher truths, the truths of beneficence, of toleration and equal justice." To us it seems as though the great Emperor was the first propounder of the benign principle of Hindu-Muslim Unity, the significance of which is as great to-day as it was in the days of the 'Moghul' rule.

Another noteworthy feature of the book is that such subjects as the growth of Indian Nationalism, the conditions of the Indians in South Africa, Minto-Morley and Montagu-Chelmsford Reforms, the Non-Co-operation Movement and the Round Table Conference have been very sympathetically and justly treated. We are glad that Prof. Iyengar has, on the whole, steered the ship clear and safe out of the Scylla of prejudice and the Charbydis of exaggeration.

When judged from the stand-point of a teacher also, the book is bound to prove useful. In this a teacher, will find ample material for widening the student's outlook. It also contains the revised versions of some historical fallacies and

However, in this book, which has been 'prepared according to the Madras S. S. L. C. Syllabus' Professor Iyengar has made a fairly successful attempt to give balanced attention to the various essential elements of Indian History. He makes a rapid but excellent survey of the times commencing from the pre-Aryan period and ending with the epoch-making events of the Viceroyalty of Lord Irwin, such as the Ghandi-Irwin Pact and the Round Table Conference. Nor has the geographical back-ground been neglected. Historical maps have been inserted in their proper places. The cultural and the economic aspects of the different epochs have also been briefly dealt with in the form of foot-notes. The learned author has taken full advantage of the recent researches in the field of archaeology. There are references to the existence of the rich Sumerian Colonies in the Indus valley, which is borne out by the recent evcavations at Mohenjo, Daro and Harappa. But for the limitations imposed by the H. S. L. C. Syllabus, greater space would no doubt, have been assigned to the criticisms based on the original sources of history. In one or two places, a little more of elucidation would have been quite welcome. On page 200 of the book in giving a description of the battle of 'Talikota', the place is referred to as 'Talikota' or 'Rakhas Tagadi.' On pages 196 and 201 that battle is spoken of merely as the *Battle of Talikota.* Now the researches of scholars like Mr. Patwardhan, Mr. Chandorkar and Father Herras have made it abundantly clear that the appellation of Talikota is wrong and it should be named 'Rakhas Tagadi' as the battle was really fought at these two villages, south of the Krishna river, and not at Talikota, which is 5 miles to the north of this river. Ferishta mentions that the same battle was fought a Bhogapur or Bayapur. Under these circumstances, the correct appellation could have been explained in the form of a foot-note at least. Again on page 304 a few intelligent queries regarding the Black Hole Tragedy have been raised, and the answers are given in a

helped to make the Sports a success and congratulated the winners on their good performance. Nawab Moin-ud-dowlah Bahadur, who had watched the races with keen interest, then presented the prizes to the winners.

The arrangements were very satisfactory and the boys who had gathered in large numbers showed excellent discipline.

Reviews

A School History of India by Prof. M. S. Ramaswamy Iyengar, M.A., with a foreword by Prof. K. D. Sastriar M. A., Sreeniwasa Varadachari & Co., Madras. Pages 466. Price Rs. 1-12-0.

THE task of unravelling in detail the tangled skein of Indian History, and that too for the benefit of a Secondary pupil, is not an easy one and it cannot be said that a thoroughly acceptable text-book has yet been written. Most of the text-books now in use either lay undue emphasis on the political aspects of Indian History or give the minimum of facts and dates, keeping in view 'the examination purposes.' In nine cases out of ten, the cultural and the human aspects of history are neglected. The results of the study of such defective text-books have been deplorable. A secondary pupil fails to appreciate the salient features of the cultures of the different races that ruled over India from time to time and his whole outlook is narrowed down. To him Indian History appears as though it is a dry narrative of " blood, treachery and confused fighting of adventurers carving out thrones and empires for themselves." Until and unless a history book presents a faithful record of the social, economic and political conditions of the times with which it deals, it cannot lay any claim to be called real history.

The second part of the programme consisted of special displays by individual schools. The performance of the Residency Middle School was declared to be the best by the judges.

At the conclusion of the display, Mr. S. M. Hadi made a speech in which he pointed out the importance of the mass drill. He said that, being very much interested in the physical progress of the students of our State, Nawab Lutf-ud-Dowla Bahadur had presented a beautiful Challenge Shield and a Cup for this kind of display. He thanked the Nawab Saheb for his kind donation and hoped that he would come and see a better show next year. Mr. Hadi deplored the lack of playgrounds in Balda and requested the Secretary to move the Government to supply this need. He thanked Mr. Weber and his students for all the help he had received from them. In the end, Nawab Akbar yar Jung Bahadur gave away the prizes.

Athletic Sports.

The annual inter-school and inter-college sports were held on the 3rd and 4th March on the Goshamahal ground. Nine hundred students belonging to twenty eight institutions of Balda competed in the various events and showed great progress since last year. No less than eighteen previous records were broken. The competitors from the Nizam College and the Chaderghat High School were successful in many events and won the Championship Cups for their institutions.

The teachers' Relay Race, a new event introduced this year, produced very keen interest and no less than thirteen institutions entered for it. The Nizam College team was successful, but the teachers of the Wesleyan Mission High School made a bold bid for the honour.

At the conclusion of the sports, Mr. S. M. Hadi, the General Secretary of the Hyderabad Athletic Association, made a speech in which he thanked all those officials who had

The desirability of dividing the English course in schools and colleges into a language course common to all and a special subject in the optional group was engaging the attention of some member. The Board of Studies in English approved of the suggestion and requested the Syndicate to take further action. The Syndicate appointed a small committee to consider the question. The Syndicate placed before the Academic Council a scheme. In this scheme English was not only placed as a subject course in the optional group as proposed by the Board of Studies but it was also placed as an alternative language in Part II of the Second Language. This inclusion under Part II was rightly resented and the whole scheme was referred back.

R. G. Grieve, Acting Director of Public Instruction, is going on leave preparatory to retirement. Mr. R. Littlehailes, Acting Commissioner of Education with the Government of India, is expected to take his permanent appointment as Director of Public Instruction, Madras.

Local News

Physical Exercises Mass Display.

With the assistance of the Principal and students of the Government College of Physical Education, Hyderabad Deccan, Mr. S. M. Hadi, Chief Inspector of Physical Education, organized a Mass Physical Education Display on the 24th March on the City Police ground. Boys from Standard IV to Form III, belonging to nine different institutions, were trained for the purpose. About thirteen hundred boys performed the exercises in uniformity under the leadership of Mr. Wafadar Khan. It was a very spectacular show and was very much appreciated by those present, among whom was Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, the Secretary for Education. Five judges were busy throughout the display awarding marks to the various schools. At the conclusion of the mass drill, Nampalli was declared winner.

As a result, a contract was arrived at whereby the Government, in consideration of the plaintiff's undertaking to spend large sums of money on the improvement of education, agreed that all expenditure thereon, over and above the amount of the plaintiff's budgetted expenditure, during the year 1917-1918, should be shared equally between the Government and the plaintiffs. In pursuance of the contract, the Government paid its share for the years 1918-1921. Thereafter however the Government failed to pay the full amount of the bills and thus owed the Municipality Rs. 12,05,000 in respect of the years 1921-1926. The plaintiffs reserved to themselves the right to sue the defendants in respect of sums spent thereafter.

His Lordship held that it would seem that an agreement was arrived at between the President of the Bombay Municipality, professing to act on plaintiff's behalf, and the Secretary to Government of Bombay, Educational Department, who professed to act on behalf of the Bombay Government who in their turn seemed to be acting on behalf of the Secretary of State. This would have the effect of binding the parties to a concluded contract. But Section 30 of the Government of India Act seemed to contemplate a formal deed or instrument in which the contract was set out. His Lordship therefore came to the conclusion that no valid contract was arrived at which was a binding on either party of the suit.

MADRAS.—The Educational Exhibition arranged by the Corporation of Madras will be opened by Dewan Bahadur S. Kumarasami Reddiar, Minister for Education with the Government of Madras.

The Academic Council of the Madras University at its meeting held early this month, sanctioned the appointment of a full timed teacher for Geography and a part-time teacher for Music. These two departments will be opened in June.

BOMBAY.—In the last week of January all the students of the Baroda college went on strike in sympathy with some 650 students of the First year and Intermediate classes who were suspended by the Principal for absenting themselves on the day of Mr. Sengupta's arrest. For a time it appeared as if a very ugly situation would develp owing to the difficulty in arriving at an amicable settlement. The situation however suddenly cleard up, for the Principal declared that he valued more the good will of his students and threw open the doors for those who cared to attend the classes. The students readily responded and probably also realised that the Principal scored a point in apparently seeming to yield. The incident is an illustration to show the excellent relations which exist between the students and the Principals of the college in the Presidency.

A very interesting civil suit was disposed of by the High Court of Bombay in February last. It was filed by the Bombay Municipality against the Secretary of State for India for recovery of Rs. 12,05,000 as the half share of the Government of Bombay, in the scheme of expansion of Primary Education in the city. In dismissing the suit with cost the Hon'ble Mr. Justice Mirza, remarked, "Although my sympathies are with the Municipality on the moral aspects of this dispute, I have to recognise that I am not in a court of morals but a court of law." On technical objections the contract was not valid not having been made on behalf of and in the name of the Secretary of State as required by the statute.

The case for the plaintiffs was that in or about the years 1916-1917 the Government of Bombay realising that a point had been reached at which Primary Education in Bombay city could no longer be developed in a manner befitting the city, without substantial contributions from provincial revenues, entered into negotiations with the object of bringing such education up to a higher standard.

BENGAL.—1. An attempt on the life of His Excellency the Governor of Bengal was made by a Bengali girl graduate, named Miss Bina Dass, during the Annual Convocation of the Calcutta University at the Senate House on the 6th February. Five shots were fired but His Excellency had a providential escape. The Vice-chancellor, Lt. Col. Suhrwardy and Mr. J. C. Mukherjee, Chief Executive Officer, Calcutta Corporation made a dash for the assailant and secured her at grave personal risks. His Excellency Sir Francis Stanley Jackson, P. C., the chancellor who was delivering his address when the shots were fired continued his speech, after order had been restored. A special Tribunal tried the case and sentenced the accused girl to 9 years' rigorous imprisonment. The Government has recognised the act of courage of the Vice-Chancellor by conferring on him a Knighthood.

2. It was arranged that the next sitting of the All-Bengal Teachers' Conference would be held at Serampore (Hoogly) during the next Easter Holidays. But it was decided in the last meeting of the Executive Committee of the All-Bengal Teachers' Association, that in view of the situation in the country the Conference would be postponed sine die.

3. Madamme Montessori has been appointed a Reader of the Calcutta University. She is expected to come to Bengal shortly.

4. Mr. G. S. Dutt I. C. S., District Magistrate, Birbhum, has been showing great activity in reviving the Folk Dance and Folk songs in the province. Under the auspices of the Rural Heritage Protection Association, of which Mr. Dutt is the President, a teachers' Training Camp has been opened at Suri when a large number of teachers are taking lessons in Folk dance and Folk songs to introduce them in the schools of Bengal. Mr. Buchanan, the Director of Physical Education, Bengal Government, is also actively supporting the scheme.

one may behold. Slowly he sinks into a crimson sea. The twilight fills the sky, and the little lamps of the cottages and of the sky are lit one by one. The mind travels far into the unknown regions carrying the Finite to meet the Infinite, the created to the Creator in whom "The whole world finds its shelter." Then surges in the heart the longing to be cradled in the arms of nature,—far away from the turmoils of the man-made busy world that is always rushing and always hastening, unmindful of the wonders which the Creator has surrounded it with........... One is rudely shaken from the reverie by the hooting of an owl from the neighbouring tree. One rises from one's perch, picks up the path and returns to the Asrama at Santaniketan.

Educational News

(Issued under the auspices of the All-India Federation of Teachers' Associations, by the Association of the Editors of Educational Journals in India.)

PUNJAB.—The Ministry of Education, Punjab Government, in its memorandum No. 21037 G. have issued orders abolishing the Junior Anglo Vernacular classes attached to the Government colleges at Lyalpur and Multan with effect from 1st April 1932 and discontinuing the Junior Anglo Vernacular Examinations for one year from 1933-1934.

DELHI.—The All-India Jahagirdar's Educational Conference will meet under the chairmanship of the Honourable Raja Sir Rampal Singh on the 15th, 16th, and 17th instant in the convocation hall of the Delhi University.

the School, College and Research stages of other universities, form the three distinct departments in the educational scheme at Santaniketan. Opportunity is given to every student to train himself in drawing and music. The importance of manual training is fully recognised. Each student spends a good part of the school hours in learning to use the simple household instruments and in receiving training in gardening and house and road repair. Carpentry, and weaving, together with book-binding, wood carving, lacquer work etc. are also taught to those with a practical bent.

The purpose of the College is to prepare students for more advanced literary and academic studies, and to provide a liberal education for those who will begin to earn their bread in the practice of arts and crafts, industry, agriculture or commerce. Courses in agriculture and cottage industries are given at Sriniketan, a couple of miles from Santaniketan.

Santaniketan has cultivated a music of its own. The Poet has composed words and music for over 2500 Bengali songs, and has initiated a new school of music with the Santaniketan school of music as the acknowledged centre of of this new movement.

The Foundina of Visva-bharati The Visva-bharati—"a wider cultural centre"—was inaugurated in 1921 and from that day onwards savants from different countries have been invited. Prof. Sylvain Levi (France), Mark Winternitz (Czecho-Slovokia), Sten Konow (Norway), Carlo Formichi (Italy), Julius Germanus (Hungary) and others have already responded to the call.

As one recalls one's stay in Santaniketan, the picture of an evening with the picturesque sunset and "solemn-stillness" comes to one's mind. The weary traveller of the heavens has lost his dazzling splendour in his weary march. He is no longer a dazzler but a red ball of fire which every-

The members of the Asrama get up early in the morning. Time is given for meditation. Later on they meet under the trees and chant the following mantra in union :

"Thou art our Father, May we know thee as our Father! May we truly Salute Thee!"

Again in the evening the pupils meet and sing the verse:

"The God who is in herbs, in trees in water and in fire, who, pervades the whole universe, to that God we offer our salutation again and again."

The inmates enjoy the communal life offered in the Asrama. They live in small groups, each with a house-master who is both an instructor and companion. Each group forms a small community fully conscious of its place in the larger life of the Asrama. Students offer hospitality to the guests. They visit the villagers and offer relief in times of an epidemic or a famine. They conduct a school of their own for the villagers in the neighbourhood.

The working hours of the school are from 7 to 10 in the morning and from 2 to 4 in the afternoon. The classes are held in the open air under shady trees whenever the weather is good. The equipment of the out-door class-room consists of an easel, a black-board, a raised platform for the teacher and the wide expanse of nature on all sides. As the visitor goes round Santaniketan, different shadowy nooks are shown and he is told the names of these class-rooms named after the teachers who have taught there before.

The playgrounds are full of enthusiasts every evening and Santaniketan enjoys a great reputation for football and athletics. The time between the games and dinner is spent in entertainment, telling a story, reciting a poem or debating on a subject. The students have their school songs, musical festivals, terminal dramatic performances, fairs, and exhibitions. The hour of retirement is marked by girls and boys going round the dormitories singing appropriate songs.

The Courses of Study. The Patha-bhavana, the Siksha-bhavana and the Vidya-bhavana, corresponding roughly to

shrivel up into clerks, lawyers and police inspectors, and we die young.

With a repugnance for the so-called education of the day, the poet has tried to remedy these defects by offering in the educational institutions at Santaniketan an education best suited to the Indian genius.

The Educational Institutions in Santaniketan. To-day, the Vidyalaya of 1901 has grown beyond recognition, with a hall of residence for girls, the Kala-bhavan (the school of Art) started in 1918 and Visva-bharati a wider cultural centre inaugurated in 1921. The different educational institutions in Santaniketan are the Patha-bhavana (The School) the Siksha-bhavana (the College); the Vidya-bhavana (the Research Institute); the Kala-bhavana (The School of Fine Arts and Crafts); Sangita-bhavana, (the School of Music and Dancing). All of them are residential and form the different parts of the one body. There is a very valuable library containing very precious manuscripts in many of the Eastern languages. There is a museum with articles of artistic and ethnological value collected from the different parts of India. The Art Gallery contains paintings of the Modern School as well as of the Rajput, Buddhist and Moghul Schools. Besides, it contains Japanese and Chinese paintings also. The School of Art started in 1918 depicts today a school of vigorous painting with a distinctive feature of its own. Original fresco-paintings and a scheme of decorations of important buildings at Santaniketan with original fresco-designs are some of the achievements of the Santaniketan artists.

The Daily Round. The institution is definitely co-educational and girls receive practically the same education as boys, and the standard of attainment is maintained at the same level for both. Additional arrangements are, however, made to teach the girls such subjects as cooking, domestic science, needle-work etc.

In founding the Asrama the poet wrote :

"To give spiritual culture to our boys was my principal object in starting my School in Santaniketan. Having this ideal of a school in my mind, which should be a home and a temple in one, I selected this spot, away from all distractions of town, and hallowed with the memory of a pious life whose days were passed here in communion with God."

Dr. Tagore on Modern Education. The Poet's spirit has been for a long time convinced that India has a contribution to make to the larger world, to make the latter richer and happier than now. One of the meeting places for the East and the West is the University, unhampered by exploitation and free from utilitarian motives.

"Once the East had her reputation of fabulous wealth, and seekers were attracted from across the seas. Since then, the shrine of wealth has changed its site. But the East is famed also for her storage of wisdom, harvested by her patriarchs from long successive ages of spiritual endeavour. Once upon a time we were in possession of such a thing as our own mind in India. It was living. It thought, it felt, it expressed itself. It was receptive as well as productive. That this mind could be of any use in the process or in the end of our education was overlooked by our modern educational dispensation. We are provided with buildings and books and other magnificent burdens calculated to suppress our mind. The latter has been treated like a library shelf solidly made of wood, to be loaded with leather-bound volumes of second-hand information. In consequence it has lost its colour and character and has borrowed polish from the carpenter's shop. All this has cost us money and also our finer ideas, while our intellectual vacancy has been crammed with what is described in official reports as Education. In fact, we have bought our spectacles at the expense of our eyesight."

In exposing the defects of the modern educational system, which he is trying to combat by the institution of "An Eastern University," he says :—

"Mind, when long deprived of its natural food of truth and freedom of growth, develops an unnatural craving for success, and our students have fallen victims to the mania for success in examinations. Success consists in obtaining the largest number of marks with the strictest economy of knowledge. It is deliberate cultivation of disloyalty to truth, of intellectual dishonesty, of a foolish imposition by which the mind is encouraged to rob itself. But as by this means we are made to forget the existence of mind, we are supremely happy at the result. We pass examinations and

Mela day. The atmosphere was very disturbed, and one wondered how much of what one had heard about the place was true. We were also carried away in the swirl of gaiety with jugglers and wrestlers who performed feats of wonder. That evening the boys and girls of the institution gave performances of Jiujitsu—the Japanese art of self-defence. The founder, Dr. Rabindranath Tagore, a stately old figure with a stoop and a flowing beard, all clad in flowing robes of white silk, was also present.

The Founding of the Vidyalaya. But the normal life at Santaniketan is far from being as tumultuous and noisy as the Founder's Day suggested to us. The whole atmosphere is calm, serene and peaceful with nature as an open book, unfolding her pages of charm and beauty to her students who follow after her either under the shady trees or out in the flowery fields at every turn. Santaniketan stands on the crest of an undulating moorland. Originally it was the haunt of robbers. "Maharshi", Devendranath Tagore, acquired the land and called it Santaniketan, "the abode of Peace." The spot where the Maharshi used to sit in meditation is marked by a marble slab and a Bengali inscription of his prayer:

"He is the repose of my life,
The joy of my heart,
The peace of my spirit."

Rabindranath Tagore, "the Maharshi's" son, thought that an Asrama Vidyalaya would solve the educational problems of India; and with his father's consent, he opened the school in 1901.

Having in view the ideal of the ancient forest homes of India, he said;

"Our ideal institution will be situated under the shadow of trees, in the open country far from the turmoil of cities. The teachers will carry on their own studies and teach, and the students will learn and grow up in an atmosphere of peace and quietness."

These are a couple of statements made by the poet in out-lining the aim and scope of Visva-bharati, the natural growth of the Asrama Vidyalaya started in 1901. "The Vidyalaya" is not so easily recognised as "The Poet's School at Santaniketan." The latter term has become almost a byword to most people who have had anything to do with education in India.

The trip to Santaniketan. "Santaniketan" has always conjured up in my imaginative mind the picture of a bearded old wizard always at work, casting a life-long spell over his subjects, raising before their eyes pictures of nature in her youthful charm and perfection. For a long time it had been my longing to visit the enchanted place and see the wizard and his pupils at work. The opportunity came when they had one of their 'Melas' in December, 1929. One night a party of us alighted at Balpur railway station, about 99 miles from Calcutta on the loop line of the East India Railway. We had another two miles to cover to reach our destination, and this part of the journey was done in a rickety old bus of a hundred parts which creaked and bade good-bye to every other as it rattled along the narrow road. It was raining hard both outside and inside of the bus! So we reached the enchanted grounds wet to the skin with our packages nearly soaked in water. Cheer and warmth greeted us at Santaniketan. We were shown into a thatched hut, and with the help of the misty moonlight, we saw a hut. It was dry, with its floor spread with a pile of hay. We stretched ourselves on the hay and soon fell asleep. In the early hours of the next morning we were roused by the delightful songs of the boys and girls who went round the dormitories singing. Already the spell was cast on us, and from that time we too joined the inmates of the institution and participated in their activities.

The Founder's Day. At about eight in the morning all the members met in the Mandir (the House of Prayer) for worship. Then followed the noisy and active life of a

of their various student unions, might organise debate contests. In the larger cities it is possible for the local institutions to institute annual tournaments in which the girls' high schools may also participate. It would, perhaps, be better to hold preliminary heats on the knock-out system, and the finals could then be held before a large gathering of the public. Debating as an extra-curricular activity would thus come to hold a very important place in the high school pupils' imagination.

I do not see why we should not widen the sphere of the debate contests between High Schools as we go on. From City Contests we can arrange for State or Provincial Contests—and ultimately, why not an Inter-State or an All-India contest? It seems to me that it would be possible thus to create a real bond of kinship among the High School-going youth of India at large. And who can calculate the far reaching influence of such contacts between youthful debaters; for is there not every reason to believe that from among these shall arise our future-legislators, men of might and leadership, to whom it shall be privileged in years to come to be standard bearers of India, free and once more standing to function among the freedom-loving nations of the world?

Santaniketan and The Educational Institutions

BY

REV. PAUL ISAAC, B.A.,

Head-Master, S. P. G. St. Thomas' Secondary School, Secunderabad.

"VISVA-bharati represents India where she has her wealth of mind which is for all. Visva-bharati acknowledges India's obligation to offer to others the hospitality of her best culture and India's right to accept from others their best."

RABINDRANATH TAGORE.

voting) to represent the school in debate contests. The first speaker opens out the ground and clears up the issue; the second specialises in witticisms and generally creates a favourable attitude on the part of the audience by his humorous sallies, and the third speaker clinches the argument with a very effective speech, summing up their case. Such a system of team-work practice would be very helpful if adopted by our High School debaters also. It would be well to have frequent inter-school debates between various High Schools in a city or a community, just as we are used to having football and hockey matches.

Apart from the obvious advantage that such team contests produce in the way of a "school spirit," there is the added advantage of bringing closer together High Schools in a spirit of friendly rivalry. There is another factor which is of no mean importance in this connection. It would take years for us in India to have co-education, that is for boys and girls to study in the same school together. As it is, we have no opportunity for bringing boys' schools and girls' schools together on any common basis of interest. High school girls would not want to challenge high school boys to a football or hockey match, but they can very well pitch their wits against them in a debate contest. Where co-education is not the vogue in certain parts of the United States, educationists avail themselves of this mutual basis of interest between boys' schools and girls' schools in a particular area by organising debates between them. Why should not we attempt similar experiments in our larger community centres where we have both boys' and girls' high schools? These encounters need not necessarily form part of a tournament: they may be friendly matches.

But, wherever possible, it is helpful and highly encouraging as an incentive to hold annual tournaments in city areas. Nor should such tournaments be always organised by associations that have no direct interest in the programme of education. The schools themselves, through the initiative

speaking style is very different from the written. All the speeches that we heard at the debate contest were "bookish", academic to a fault. The speakers obviously felt that they had to be dead serious or it would not be good form. None of them so much as attempted a funny 'hit'. They did not see the value of appealing to the sense of humour of their audience. If the end of debating as an extra-curricular activity is to enable the youth ultimately to express himself effectively and interestingly before an audience, without any undue suggestion of detracting mannerisms and unnecessary nervousness, then it is necessary that every opportunity should be availed of to help the beginner start on the right lines and to correct himself as he goes along. We Indians have a national proclivity for disputation, and this failing makes itself felt in early adolescence to a marked degree! It is, therefore, to be expected that Debating should prove in time a very attractive feature of the High School pupils' outside-interests. Should not school authorities, then, evince an increasing interest in High School debating *per se*?

In the first place, a serious effort should be made to provide coaches who may be either paid or honorary workers. Young lawyers who are probably *alumni* of the school would willingly assume such a responsibility when approached, as it opens out for them also a congenial sphere of usefulness in the community. With as little suggestion of class routine as possible, they should give the young debaters helpful hints in voice culture, correct enunciation, platform etiquette and effective expression. In American High Schools they usually have an 'elective' class hour in "Public Speaking."

In the second place, the idea of team work in debating should be inculcated. Speaking is not necessarily individualistic: to be effective in creating public opinion the pupil will have to learn that there should be something like a co-operative effort. It is usual in American High Schools to select a team of three (usually as a result of student

It is common in every American High School to have "coaches" not only for Athletics and every major sport, but also for Debating and Dramatics. Sometimes they have more than one coach in the same school for one or other of the various extra-curricular activity of the pupils. Invariably they are teachers who have very definite responsibilities so far as handling specified subjects on the curriculum is concerned. The Debating Coach may be teaching English or History or Mathematics, but unless he is specially engaged as a coach, he is a member of the School staff. Sometimes it happens that the local minister or lawyer is asked to take over this responsibility. I do not see any difficulty in our High School Headmasters securing the help of young members of the community-lawyers, doctors, or even business men who have a bent for that sort of thing. Such a connection would be of mutual benefit, and would ultimately create in the public at large a palpable interest in the extra-curricular activities of the local High School pupils.

Debating involves a certain amount of technique. When we filled up the individual score sheets of the contestants at the Hyderabad inter-school meet referred to above, we graded each speaker on the maximum of 20 for 'pronunciation,' 20 for 'style', 20 for 'delivery' and 40 for 'matter'. I remember the case of a young man who made an extraordinarily good speech. In fact from the standpoint of subject-matter he was certainly head and shoulders above the rest of them. He was indeed the most thoughtful and decidedly the most original of all the contestants. But he did not secure the first place because he lost very heavily in 'pronunciation', 'style', and 'delivery'. Had he been properly coached, he would have easily acquired the art of public speaking, the effect of voice modulation and a more convincing way of "putting across" his speech. Public speakers are not all born : most of them are made.

Not only has the Indian High school boy to learn the technique of debate and public speech ; he has to learn that

here certainly was a tremendous opportunity for teachers so inclined, actively to associate themselves with a major field of extra-curricular activity in which, it was apparent, the average high school pupil was interested.

I noticed that seven schools in the city had delegated thirteen teams for the competition. These representatives did not by any means compare unfavourably with similar pupil-contestants I have listened to in American and English Schools. This was in spite of the fact that they were handling a foreign language. Although not a few faults in enunciation, mode of delivery and style were noticeable, some of the speakers showed abundant promise of creative thougt and imagination. In defending the thesis that "Government Service was preferable to Business" one speaker drew a nice distinction between government *service* and government *work*. Another pointed out that government service was indeed the "business of the people," that is, where government was for the people and by the people. If it was not so now, well, it should be made the busines of the people! Considering that the subjects were announced only an hour before the debate, and the fact that the endeavour was entirely the outcome of the pupils' own efforts, the result was commendable. But that does not mean it was all perfect. There was ample need for improvement—improvement which could only be effected by the sincere co-operation of a sympathetic teacher.

The teacher who decides to associate himself with his pupil's extra-curricular activities has to develop a genius for initiative and leadership that should of its very nature be imperceptible. He is no more the teacher, but the adviser and loyal friend. He does not compel prescribed action, but excites purposeful effort. He does not lay down the law; he merely suggests and leaves to the pupil the alternative of following his advice or of ignoring it altogether, if he sees fit. He doesn't teach: he "coaches."

education in itself is no mere means to a livelihood. He knows that a college degree is no longer a ready passport into an office. To be what he would be, the average high school boy has already a sneaking suspicion that he should acquire more than what the curriculum covers by way of imparted knowledge. That is why he is seeking outlets for self-expression, consciously or unconsciously, in extra-curricular activities that cannot be categorised either as 'class work' or 'home work.'

Should the teacher feel bound by the moral compulsion of his calling to interest himself in these activities that do not, by right of his professional contract, come under his purview? When classroom supervision is extended to extra-curricular activities, do not these latter lose their distinctive nature in the eyes of the pupil? Will not the very fact that his teacher butts into the privacy of his interests outside the class-room dwarfen and dwindle the spontaneous enthusiasm of the pupil in extra-curricular activities? These and like questions raise a host of difficulties.

We must not forget that in many cases the pupil's interest in things that do not directly concern his class lessons is in a large measure due to the fact that they are not schematic, graduated by the hour-glass and punctuated by periodical "tests". The unfortunate fact about class-room exercises is the inevitable feeling of compulsion that results in forced effort bordering on drudgery. When a thing *has* to be done, there is no fun in doing it. Boys who would grudge an hour ill-spent in frowning over a composition on "The Printing Press" or some equally enlightening subject, have been known to talk with intelligent interest and obvious enthusiasm in a debating society on "Self government for India".

I happened to be on a committee of judges at an Inter-School Debating Contest sponsored by the Hyderabad Y. M. C. A., when it came to me with a surprising suddenness that

Happily, however, for the High School pupil in India, times are changing. An increasing interest is being evinced at the present in the pupils' occupations, recreational and otherwise, that do not from their very nature fall within the school time-table. In the State of Hyderabad, for instance, the authorities have undertaken to superintend and direct the pupils' play-ground activities with encouraging results. Physical education, as such, and not merely "gymnastic instruction," once ubiquitously styled "the drill period" in the curriculum, is assuming a place of recognised importance as a consequence. The directors of physical education in the Hyderabad State schools make themselves responsible for the direction and organization of the out-door sports of the pupils in their schools. They not only coach the Football, Hockey and Cricket teams, but they also assume the duties of a games master and train whatever talent they come upon for the State sports. Moreover, we have a Scout organization in the State that deliberately sets out through its scoutmasters to awaken in the pupils a lively interest in out-door projects, opening out a wide vista of multifarious activities to the growing mind of the young, curious to learn facts about a world which their text-books do not provide them with.

This growing interest in the extra-curricular activities of the pupils is the outcome of the recognition of a new principle in modern pedagogy. Education is no more curriculum-centred, but pupil-centred. The modern teacher cannot rest satisfied with seeing his pupil grow up to acquire certain "skills," the ability to spell correctly, to write grammatically, to sum accurately or to remember certain significant facts of history, for example. The modern teacher wants his pupil rather to grow into conscious worth of his manhood and his obligations both to himself and to society—to find his place in the complex world of today that spells life in the larger sense. The average high school pupil, for that matter, is already beginning to realize that

very low order, we may, without prejudice to the claims of English as an important subject of the curriculum, have the 'Informational Aim' instead. Name it what you will, the information thus gained would serve not only those who discontinue their studies after the Matriculation to face the battle of life more successfully, but also those whose happy lot it may be to go up to the University, and thus open up vistas of the beautiful and noble far beyond the ken of their less fortunate brothers.

Debating as an Extra-Curricular Activity of High School Pupils

BY

Paul David Devanandan, M. A., Ph. D. (Yale)

HAS the teacher any more responsibility towards his pupil than what the curriculum imposes on him? With so many hours of English, of History or of Mathematics taught in accordance with the class-work routine, is the teacher's task done? I do not know how many Indian Schoolmasters would consider that issue relevant. As our educational system is based on annual tests of the pupils' capacity periodically to reproduce a passing percentage of the subject-matter definitely prescribed for the teacher and the taught, the efficiency of the teacher is evaluated in the end by the results he produces in the shape of "percentage of passes." The teacher, therefore, rightly thinks his time would be wasted and the energy of his pupils misdirected when spent on matters that have no direct bearing on the study-subjects. Once the school hours of class exercises are over, the pupil is left to his own—and the teacher turns away with a sigh of relief.

the teaching between practical training in English and the study of English Literature. Mr. S. G. Dunn, Professor of English Literature at Allahabad, thinks that the English courses have been 'futile' because of the failure to recognize the distinction. Some important witnesses lay stress, and rightly so, on the need for practical training in English. They think the claims of this training have been sacrificed in the past to the study of literature; and they would limit all compulsory English training, both in the School and College, to the practical side.'

It is no use multiplying evidence as to what should be the aim of teaching English in Indian Schools. Suffice it to say, that even with regard to University training in English, the Commission state: 'We do not recommend that a uniform course in English should be comlplusory for all students even in the Faculty of Arts. But we should like to see opportunities given to all students to attend such courses in English, which would be compulsory for students taking English Literature as a subject at their examination. Under the tutorial system which we recommend, much of the practical training in English will be given not by teachers of Literature but by the teachers of other subjects. Finally in dealing with non-literary students, it should, we think, be specially borne in mind that a knowledge of English is, to quote Mr. A. Sinha, 'not an end in itself, but only a means to some higher end."

I would, therefore, suggest that the aim of teaching English in India should be 'Utilitarian' up to the High School Stage; this would enable students to speak and write good correct English. In other words, it should serve as a tool as, according to Lord Avebury's distinction, it does in a large measure in the case of English boys of Primary Schools the length of whose course, let it be remembered, is about eight years. But if the word 'Utilitarian' smacks too much of selfishness and is believed to be an ideal of a

impossible—for the student to express himself in English, much more so to appreciate English Literature as an Englishman does, unless he is prepared to sacrifice his own mother-tongue and strictly abstain from ever speaking it at home or abroad or unless the repertory of his mother-tongue is so limited that he can do better without it. This, I am sure, all will agree, would be paying scanty compliment to any Indian language which has vast possibilities of development and expansion.

Secondly, there is the dearth of good English language teachers who, with a few exceptions here and there, resort to methods much like the one described by Stevenson, by taking noble passages and poems to pieces and thus marring all that is beautiful and appealing in them. Strange to say, these teachers are more popular with the Indian students than their abler compeers; and there is a reason, a very strong reason, for it. They help the students more in passing their examinations. Thus we arrive at the 'vicious circle' pointed out in their report by the Hartog Commtitee. "The candidates for training are of poor quality because the schools at which they have been taught are poor; the schools are poor because there is not an adequate supply of well-trained teachers."

But even if this second difficulty be overcome, there is the last but not the least insurmountable barrier, in the person of the student himself, who from the very nature of the case as quoted above, 'may be called well educated, but cannot properly be called cultured,' for the simple reason that it is a mental impossibility to him. It was, perhaps, with this difficulty in view that some important witnesses of the Calcutta University Commission insisted on a distinction between practical training in English and the study of English Literature. The Commission's report—a gospel of education for many years to come—says, 'There is a strong body of opinion in favour of distinguishing in

School System,' written by Mr. Ali Akbar, the Divisional Inspector. He has been to Germany twice and has studied the methods of teaching Modern Foreign Languages in the German schools thoroughly. Mr. Ali Akbar points out that though German teachers adopt the "Direct Method," while teaching the texts, yet for purposes of general information about the English culture, (for instance, English Philosophy, English History, etc.,) the students of the High Section are frequenty advised to read German translations of English books. Now contrast this method of teaching a foreign language with that practised here in this country, which is very similar to the one described by Stevenson. Who would say that either of these contributes in any way to the attainment of the "Cultural aim" ?

Thus we see that neither the Germans nor the Indians are really achieving what they say they are aiming at. The Germans may, perhaps, owing to the affinity of the English and German languages and to the close affinity of their national culture, attain the cultural aim to a certain extent in the High School stage, the standard of which, let it be clearly borne in mind, is almost equivalent to that of the Intermediate class of our Colleges. I do not know how far this aim can be realized in Indian High Schools. It is no good fighting shy of words and saying one thing while doing just the opposite. Such an attitude misleads unknowing and inexperienced teachers, does incalculable harm to the students and tends to confuse educational issues. It is, therefore, much better to have a plainer and simpler aim and to attain it than to have a higher one and not attain it at all.

That the "Cultural aim" is difficult of attainment in Indian High Schools can be conclusively proved in many ways. To begin with there is a great disparity in the modes of expression and thought of the Indian and English languages which makes it very difficult—nay almost

learning to read; the second is due to the absence of equivalent sound in the repertory of the mother-tongue. Since the Bengali boy is not going to be one among many Englishmen but one among many Bengalis, he is entitled to his own dialect, so long as it is consistent and intelligible. Those likely to have intercourse with non-Bengalis (and these are few) may without essential modification of these proposals acquire a pronunciation correct according to English standards." If Dr. West goes to the length of neglecting three out of four Foreign Languages Bonds, and of over-looking mispronunciation, the aim of teaching English in India must be something other than 'Cultural.'

It is said that the aim of the Germans in teaching English to German boys is cultural; but it is to be noted that the teaching of this language is commenced in the fifth school year, when a boy, if he is destined to adopt the clerical and vocational line in future, learns English for six years, or if he is marked out for a University career and the higher professions, for nine years. But obviously the "Cultural aim" in its real sense can hardly be realized even in six years' time. To be plain, it is only a misnomer for ths 'Utilitarian,' or at best the 'Informational aim'; for the real object of teaching English (at least to those who are destined for the intermediate walks of life) is either to give a smattering of the language to enable them to carry on ordinary correspondence and communication or, if the word 'Utilitarian' is repugnant, to impart some information about the culture of a neighbouring nation which will enable the students better to appreciate their own. This aim in the last analysis cannot but be called "Informational."

Nor is this all. Their method of teaching English also proclaims that their aim is either Utilitarian or Informational and not Cultural. I have had the proud privilege of going through a chapter in manuscript on 'The Teaching of English' in a book, now in the press, entitled 'The German.

strongly believe it never can, then we will have to find out or coin some name other than 'Culture' for the aim that would justify this method. One such name is being used by the American educationists, though with a slightly different object in view. I believe it would serve our purpose just as well, and further the cause of teaching English in Indian Schools, by clarifying our ideas, and by helping us to a better understanding of what our aim is, and how it is to be gained. This is "The Informational Aim," by which nothing more is meant than the imparting of mere information. This may be turned to good account either if the student discontinues his studies after Matriculation, or is fortunate enough to go up for University education, where this would serve as a back-ground for higher academic purposes and attainments.

"The attempt to teach English in Bengal as a vague and general 'Culture subject' has resulted in a lack of analysis of the Bengali's precise need of English," says Dr. West, and with a clear grasp of the situation he adds, "His essential need is the ability to read English, specially for the purpose of information. The Bengali can be cultured in his mother-tongue, but he cannot be informed: the information is in English"; and in suggesting that the instruction in English should be so designed that the 'surrender value' of the course shall at every point be as high as possible, he says, "We must first of all enable the boys to read. The Reading Bond is moreover the easiest of the four language Bonds. The others, speech, hearing and writing, may be taught later to those who wait for them, are more able to master them and more likely to need them."

He is even prepared to pardon mispronunciation by Indian students. "Mispronunciation may be due to ignorance, as in cases of wrong accent, or to lack of skill. The former type of error may easily be avoided in the process of

attempt merely to appropriate other men's thoughts as recorded in books, but rather from a gradual widening experience of things—an experience in which the personal activity of the student is a prime factor."[1]

If this be the true conception of "Culture," it is highly doubtful if any English language teacher would willingly shoulder the responsibility of imparting it to Indian students, and still more doubtful if they can acquire it, even though the teacher hammered it into their brains.

For it is generally agreed that "culture" is very difficult of attainment even by English boys and girls who, though "well educated," cannot properly be called "cultured."

When one scrutinises the methods adopted by teachers in the teaching of this language, one cannot but come to the conclusion that the aim is anything but cultural. To elucidate my meaning, I cannot do better than quote O. J. Stevenson's graphic description of his experience as a school boy when he was reading *The Lady of the Lake.* The subject of the day's lesson was the opening stanza of Canto V. "It was a strenuous lesson. The stanza was torn to shreds. Word after word was put under the microscope and examined as to its grammatical relation, its literal or figurative use, its precise shade of meaning and its special appropriateness in the passage. I enjoyed the exercise, I believe, after a fashion, but I have a distinct recollection of my bewilderment after it was over, and my feeling that I should like to know, after all, what the Stanza was all about."

If this method of teaching a language, which is practised almost all over India, realizes the cultural aim, I submit I have nothing to say, but if it does not, and I

1. Cyclopaedia of Education.

To my mind, the root trouble lies with the word 'Culture,' which has been so often used indifferently and loosely without due regard for what it really means that we have lost sight of the magnitude of responsibility and the untimely burden thrown both upon the teacher and the taught. The inevitable result of this inexactitude in terminology, and vagueness in aim has led, or rather misled us, into saying one thing and doing quite another, and has vitiated the theory and practice of teaching English to Indian boys.

The story does not end here. The Cultural aim has been the cause of many suspicions and heart burnings. Dr. West, Principal of the Teachers' Training College, Dacca, in his illuminating book on "Bilingualism," writing about the Bengali's fear of loss of nationality by the acquisition of the English language and of Western Culture, says: "Renationalisation, even under the most favourable circumstances, for example, the absorption of an alien into the surrounding civilisation of America, is ineffective in practice; much more ineffective must be any attempt to import a foreign culture into the midst of a surrounding civilisation." The need for this explanation and amplification arose from the fact that the Bengali did not fully realize the real implications of the word 'Culture' and thought that if the aim of teaching English in Indian Schools is 'Cultural,' it must necessarily involve a displacement of his own individuality and national culture—a positive proof as to how 'mere words' lead us into discussions of the most acrimonious sort.

In fact "culture" in relation to man, denotes the result of the process of amelioration; a school boy or school girl cannot properly be called "cultured," though he or she may be called 'well educated,' for culture connotes a certain ripeness of judgment and feeling, and a degree of development in the respective directions of the intellect, the emotions and the will. Culture does not result from the

forced to distinguish between the Utilitarian and Cultural aim of the teaching of the language. The Utilitarian aim is " to prepare pupils to use the language as a means of ordinary communication—in this aspect English is treated as a tool "; while the Cultural aim is " to provide a body of culture material—in this aspect English is cultivated more or less for its own sake, the emphasis is laid upon content: English Literature stands out prominently here. In fact, we have the distinction drawn by Lord Avebury between knife and fork studies, and those culture studies that for want of a better name we may call dinner studies. English is obviously either a knife and fork study or a dinner study according to the aspect emphasised."

It is perhaps clear from what has been said above that even our own mother-tongue has two functions to perform —firstly, to enable us to earn our bread and butter, and secondly to enable us to employ our leisure hours usefully. If this conclusion is right, is it not time that we paused and thought twice before deciding as to what should be the aim of teaching in India a foreign language like English which has no affinity whatsoever with our vernaculars. Moreover, we must take into consideration the fact that more than 90% of the school-going population discontinues its studies after Matriculation and launches out into the world to face the struggle for existence. If English is to be a 'dinner study,' i. e. a cultural study whose chief function is to prepare us for the appreciation and enjoyment of the beautiful and noble in Art and Literature by which we may spend our spare time usefully, then we have yet to find out a knife and fork study that would arm us with the means of earning our sustenance. But if it is claimed that the aim of teaching English in Indian Schools is both Utilitarian and Cultural, then the question may well be asked as to what amount of 'culture,' in its real sense, a student in his middle teens may and can acquire from the study of this foreign language.

titles to wealth, comfort and honour, and in which the wages of honest toil are contumely and indigence.

The law that governed his family organization was co-operation for the common good. In school, healthy emulation and not internecine competition, provided the incentive to work, and industry was rewarded and intellect respected. What a contrast this outer world would present to his family world and school world! How, in his efforts to make a success of his career, he would find his morality (contemptuously called "schoolboy morality" by his successful rivals) proving a hindrance rather than a help. He might before long begin to suffer from backslidings of the heart. Has he been in the dark about the Truth all the time?

From such a frame of mind, to positive moral degeneration, there is but one step, and the only hope of escape lies in making refuge in cynical isolation. Let us pay our homage to the man strong enough to maintain such isolation. To him let there be honour unto the very end of days!

The Teaching of English in Indian Schools

BY

Mohammed Osman, B. A., Dip-In-Edn. (London),

Vice-Principal, Osmania Training College, Hyderabad-Dn.

THE question as to what should be the aim of teaching English in Indian Schools has time and again been discussed by thoughtful language teachers and almost all of them seem to be unanimous in their answer, though with different objects in view, that it should be cultural. The Sub-Committee appointed by the Hyderabad Teachers' Association in 1929 to report on "The Teaching of English" also expressed the same opinion, and referring to Mr. Ali Akbar's article on German Education, said: "If even Germany insists on this aspect in her curriculum of English studies, how much more should this be the case in India where Indian students are in close touch with English administration and civilization and have all to gain by understanding it."

But the words 'Culture' and 'Cultural,' though so very familiar and hackneyed, prove to be rather vague and elusive when we try to find out what we really mean by them from an educational and scientific point of view. Even in England where, needless to say, English is the mother-tongue of the people, educationists have been

words, would Hameed succeed in preserving his good character intact?

But first I must answer a probable objection by way of anticipation. I have omitted, so far, all reference to heredity and individual temperament, both of which are to a certain extent determinants of a person's character. There are various reasons for their omission. For one thing, I am convinced that environment (particularly human environment) counts a good deal more than heredity, and that what is often put down to heredity turns out on closer scrutiny to be the outcome of parental or other external influences during early years. For another thing, I believe that temperament—the admixture of those innate, nondescript tendencies which some regard as the resultant of glandular secretions—is not entirely unchangeable. Rather do I feel inclined to think that it sometimes does altogether change with the change in food, climate or the condition ofhealth.

Indeed, the whole of this article is based on the assumption that human nature is pliant and malleable. We become what environment makes of us. We are born neither saints nor sinners. No child brings into this world "trailing clouds of glory" behind him, nor does there exist a human being of whom we could say that he is "a devil, a born devil, on whose nature nurture will never stick."

Nurture sticks on everyone's nature, as it did on that of Hameed, who owes the goodness of his character to the morally wholesome atmosphere at home and at school. If he does not succeed in preserving his goodness unsullied, when he is called upon to enter what is veritably a struggle for existence, that only goes to prove how potent is the influence of environment even when one's character is, to all outward appearance, well-formed.

It is not difficult, therefore, to imagine Hameed undergoing further changes—adjusting himself to a totally new environment, impelled by the instinct of self-preservation. He will not have carried on the struggle for existence long, without discovering that his system of morality will not work. He will find himself cast upon a world where the law of the jungle reigns supreme, and where everybody's claw is against everybody else. He will find himself in a mean, selfish, competitive world,—in a grossly sordid and pecuniary atmosphere in which parasitism and knavery are

preparation for the public examinations which seem to be indispensable under the existing system of society. All that the teacher can do at present, so far as this character-formation business is concerned, is to set a good example by personally practising the old-time virtues, for his personality will go a long way in influencing the character of his pupils.

This may sound a trite old commonplace to some. But do we not still find shamming and greening and intriguing as integral parts of the moral make-up of some teachers? And do we not still behold the pitiful spectacle of some of them toadying to every jackanapes in authority, for petty promotions and emoluments? What sort of influence would a teacher of this stamp exert upon the morals of his pupils, who are always watching him more keenly than he supposes, and noticing every little trait in his character? It is the teachers who help to establish the moral tone or the Ethos of the school, and it is this Ethos, more than anything else, which determines the character of the pupils.

The influence of pupils themselves on each other's character is greater than that of any teacher. They are the custodians of the school tradition, and their collective censure is dreaded by every little member of their community. No normal child above a certain age likes being ostracized.

The moral tone of Hameed's school is higher than that of many other schools. His teachers are on the whole of the self-respecting kind. His companions are all decent little fellows, and he gets on well with nearly every one of them. He is, moreover, keen on his work and plods at it methodically. So he may reasonably cherish hopes of passing his Matriculation Examination after three years. And then—well, unless he secures a scholarship to proceed to the 'Varsity, he must "enter life," as the phrase goes, and subscribe his quota to the moderate income of the family. Let us forecast, therefore, how his contact with the outside world is likely to affect his character. Or, in other

point of view, as the result of their enforcement with an iron hand. Such of the pupils as are spiritedly assertive acquire anti-authority and anti-social complexes and eventually drift into crimes.

Let every teacher therefore take care that he at least is not responsible, through his discipline-mania, for the transference of any child from the ordinary school to a Reformatory.

Fortunately for Hameed, however, there have been no thorough-bred discipline-maniacs among his teachers since he joined that school. And what is more, as he is not an abnormally spirited type, no catastrophic change is likely to happen in his life during his school days or after. But let us proceed to answer the question, "What part has been played and will be played by Hameed's school environment in his moral development ?"

It will conduce to lucidity if we divide the school environment into two parts, the teachers and the pupils, and then ask "How does a teacher mould the character of his pupils ? And how do the pupils themselves influence the development of each other's characters ?"

The answer to the first question is evident in the light of the foregoing discussion on the nature of the process of character formation. The teacher does not and cannot mould the character of any pupil deliberately. Hameed's teachers, for instance, did not and could not do anything by way of sublimating his instincts; and nobody need accuse them of dereliction. One cannot be well-versed in the subject one teaches, skilled in the method of teaching that subject, and at the same time an expert psychologist knowing all the ins and outs of that most weird thing called mind. And even if such a prodigy of a teacher were available, he would not find time in an ordinary school, for such psychological experiments which are generally of doubtful efficacy, thanks to the enormous size of the classes, the school curriculum which must be kept to, and the

will do his utmost to abstain from them. For indulgence in either would cause unpleasant sensations in him—sensations which are metaphorically spoken of as 'pricks of conscience.'

It follows, therefore, that the process of character formation is neither more nor less than the process of habit formation, or sentiment formation, or conscience formation, or whatever else one may like to call it.

While discussing Hameed's might-have-beens, I have clearly indicated how very important the home environment is to a growing child in those early and formative years when he takes his cue in regard to his moral judgments, as in many other things, from his nearest and dearest elders. The dispositions he then forms are not easily eradicated afterwards.

It is for this reason that psychologists interested in the prevention of juvenile delinquencies advocate the total segregation of young criminals from their home environment if the latter is in any way morally unwholesome.

Hameed's home environment, however, was unquestionably good. But his parents, following the fashion of the day, sent him, at the age of twelve, to a boarding school, where he has now remained for two years. If all goes well, there are about four more years of school and boarding life before him. Let us, therefore, inquire how and to what extent this new environment has influenced the development of his character up till now, and how far it is likely to influence him in the future.

We may be sure that some of Hameed's teachers did ladle out moral precepts, which, of course, produced no effect either for good or for evil, and were listened to in the same spirit as are the rules on Grammar and Composition.

I have hinted, at the very outset of this article, at the futility of inflicting precepts on the young. But their worst consequence, which may be a nauseating disgust with morality, is not one quarter so disastrous from the social

be accounted for chiefly by the emotional antagonisms to parents set up during early years. But let us assume that no such event took place in Hameed's emotional history and proceed with our psychological speculations as to his potentialities.

Suppose that Hameed was endowed with an extra-strong sex instinct, fell into evil company and turned out a debauchee. Now, what would have happened if he had been brought up in strictly moral surroundings and had thus been forced to repress his sex instinct?—According to the current conclusions of psychology, he would probably have had a nervous break-down. Again, what would have happened if, through chance or by deliberate training, he had acquired a taste for poetry?—He might perchance have blossomed into a poet. For, a poet and a debauchee (so we are assured by a section of psychologists) are at bottom one and the same, the difference consisting simply in the channels through which the sex instinct works itself.

The *permanent* diversion of any human instinct into socially useful and profitable channels is called the 'Sublimation' of that instinct.

'Sublimation' cannot be accomplished by a mere temporary diversion. Our emotions, (or sensations due to general organic disturbance,) must be organized into what the psychologists call "dispositions" (*persistent tendencies*, that is, to feel certain kinds of emotions in the presence of certain situations). On the higher levels of mental life, such persistent tendencies are called sentiments.

Sentiments, then, in plainer English, may be said to mean our mental habits of regarding a thing as good or bad, our deep-seated likes and dislikes, our conscience.

To illustrate the point, if Hameed has formed the habit of regarding bribe-taking and debauchery as bad, if, in other words, he has come to feel an intense dislike for them, he

Suppose him to have been brought up in a society in which bribe-taking was rampant. The chances are that he would regard bribe-taking as a perfectly normal and legitimate outlet for his acquistive instinct, and would suffer from no qualms of " Conscience " while practising it. For had he not noticed as a boy that his father's slender income did not suffice for the style in which his family was living? And had he not suspected that it was being supplemented through some hidden source? Also, had he not heard his mother thanking God for His benevolence, and her parents for their sagacity in marrying her to such a deuce of a clever fellow with such a tremendous latent earning capacity? Of course, both his parents and every body else railed against the corruption of the administration in a general way. But that did not mean that, so far as he was concerned, bribe-taking was sinful. He knew his father took bribes. His father's friends, equally respectable people, did likewise. So where was the harm in it? As for the school-masters who had preached honesty to him—well, they were liars and fools who thoroughly deserved the contempt with which everybody looked upon them.

Now Hameed, with his strong acquisitive instinct, might just as well have turned out a great scholar. For a scholar is a bribe-taker turned outside in, and a bribe-taker a scholar turned inside out. But then he had never heard of, or seen, any of his elders holding the poor, ill-paid, shabbily clad scholars in high estimation. To Hameed, the opinion and example of his successful father mattered a good deal more than the sentimental ethics of unsuccessful strangers. Blood proved thicker than water.

The point to be borne in mind here is that it is not heredity but love and admiration of one's elders, and pre-eminently of one's parents, that form the corner stone of one's character. Thus it is that the curious phenomena of saints begetting devils, and devils begetting saints, can

constituted on a purely individualistic and pecuniary basis, it would be surprising if things were otherwise. That some good men are successful and some successful men good are only exceptions that prove the rule, and will be generally found to be cases of genius or exceptional talent triumphing, accidentally or otherwise, over their environment. But as such super-human exceptions are outside the purview of this article, which deals with the generality of mankind, let us revert to Hameed.

Hameed, who is now fourteen, came into this world like any other child, a naked, squealing little savage with the same instincts and impulses as his father, his grandfather or any of his forbears, however remote. In the earliest stage of his development, his behaviour was guided, like that of any other child, by pleasure and pain. He just did what gave him pleasure and abstained from doing what gave him pain. But this happy state of free, savage-like individualism did not last long. For he soon realised that certain actions, though painful in themselves, were nevertheless rewarded, while others, though of a pleasurable character, were punished by his elders. He was therefore constrained to modify his conduct accordingly. But that was not all. He also discovered in himself a growing sensitiveness to the praise and blame of those around him, particularly of those for whom he had a great regard. This necessitated further adjustments of his reactions to various situations. Then out of all these influences—the pleasure-and-pain, the reward-and-punishment and the praise-and-blame of those he loved and respected—out of all these, there was created in him an abstract Something which is commonly and erroneously called 'a conscience,' in the sense of an inborn faculty for distinguishing right from wrong, but which is no more than the totality of one's permanent likes and dislikes or, in scientific parlance, one's sentiments. A discussion of the potentialities of Hameed's moral development will make this point clear.

First let us ascertain what sort of character we want to produce through education, for, unless there is some kind of general agreement and clearness regarding our aim, it is useless to inquire into the rightness or wrongness of our methods.

Do we want Hameed to grow up into a bully and a sneak, an unscrupulous money-grabber, a common charlatan directing all his energies into securing by hook or by crook his own personal advancement? Or do we want him to become a modest, self-sacrificing citizen, self-respecting and industrious, with a strong sense of civic responsibility, loving his fellow-beings and delighting in doing them a good turn?

I have selected these two types out of a host of possibilities just for the sake of illustrating that, while we pay lip-tribute to the latter, we seem really to cherish a secret admiration for the former, to which, when it succeeds, (as it invariably does), we openly bow and scrape in a shameless deliquium of veneration. Not only that. We often try to conceal even from ourselves this obvious contradiction between our professions and our conduct lest our self-esteem should sink to zero, whilst, at the same time, we exonerate ourselves in the eyes of others by means of an ingenious prostitution of phraseology—How is it done?—The bully-sneak is extolled as a man fit to rule over others and possessing the additional virtue of habitual obedience to his superiors. The unscrupulous money-grabber is regarded as a self-made man, and the self-aggrandizing charlatan as a superior being with great "push and go". It seems that our estimates of men's character are directly proportionate to the degree of monetary success they achieve in life.

The contrast that some moralists draw between a good man and a successful man is not merely imaginary and verbal. In a system of society such as ours, which is

This Character Formation Business

OR

Hameed's Moral Development.

BY

M. A. RAHMAN

At least since the days of Plato, the idea has been in vogue, in some form or other, that the chief aim of education is the formation of good character; and, as a corollary from this, the school has been looked upon as a factory for the manufacture of good characters.

A certain Head-master of Eton in the last century, who was wont to say to his flock "Boys be pure in heart; for if you don't, I will flog you," carried the matter to its logical absurdity. But it is not uncommon even to-day to find a schoolmaster who gets his pupils to write an essay on "Honesty," and then imagines that he is thereby helping them to grow up into honest citizens. Is it any wonder, then, that the spread of education has made no difference whatever in the numerical strength of the blackguards on our planet?

The object of this article is two-fold, firstly to show that the failure of the pedagogical efforts to produce better characters is, in the main, due to a misunderstanding of the process of character formation, and secondly and incidentally to point out that the existing system of society is far from congenial to the preservation of good characters.

Psychologically speaking, character is the sum-total of sentiments, and sentiments are organized emotions. But more of this later on.

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA No. 47.

Vol. VI JANUARY—MARCH, 1932. No. 3.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M.A.,
Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

SECUNDERABAD-DECCAN.
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1932.

Annual Subscription Rs. 3.

جلد (۶) شمارہ (۴)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اردو حصہ (عہ/ ۱۲) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ا ر) صرف اردو (۸/)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ہ) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عــہ	صہ ۸ر	سے،
نصف صفحہ	صہ،	عہ ۱۲ار	صہ ۸ر
ربع صفحہ	عہ	۶ر	۱۵ار
فی سطر	۱ار		۶ر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ خورداد ۱۳۴۱ف م جون سنہ ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

جلد ۶ — شمارہ (۴)

۲

افتتاحیہ

اجتماعی تعلیم
اور ناقص القویٰ کے لئے مدرسہ

مدرسہ کی کسی جماعت پر خواہ چھوٹی ہو یا بڑی صرف سطحی نظر کی جائے تو نمایاں طور پر پتہ چلے گا کہ سب طالب علم ایک ہی ذہنیت کے نہیں ہیں اور ان کے قوائے دماغی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر ذرا گہری نظر سے کام لیا جائے تو ان طلبہ کو کم و بیش تین نمایاں رجوں یا طبقوں یعنے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی خیالی یا فرضی تقسیم نہیں ہے بلکہ ہر مدرس کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان درجوں کے ہوتے ہوئے مدرس کس طرح تعلیم دے؟ اس کا مقصد اعلیٰ تو یہ ہونا چاہئے کہ ہر بچے کی نفسیات سے واقف ہو اور انفرادی طور پر ان کی صلاحیت اور قابلیت کو ابھارے۔ موجودہ تعلیم اجتماعی ٹھہری اور اس کا اہم فریضہ یہ ہوا کہ طلبہ کی شخصیت کو انفرادی طور پر ترقی دے۔ مدرس ہزار بھی فرض شناس اور قابل ہو مگر مقصد تعلیم اور طریقہ تعلیم میں جو تضاد ہے اس کا ارتفاع ایک حد تک دشوار ہے اس کی ان مشکلات میں اور بھی اضافہ اس طرح ہو رہا ہے کہ شاذ و نادر ہی تیس سے کم لڑکے پڑھنے کو ملتے ہیں بلکہ بسا اوقات پینتیس چالیس و پچاس کی حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں ان حالات کے تحت وہ اپنی تعلیم کی رفتار نہ درجہ اعلیٰ کی رفتار ترقی کے مطابق رکھ سکتا ہے اور نہ درجہ ادنیٰ کے لئے بلکہ بمصداق خیر الامور اوسطہا متوسط درجہ کے طلبہ کا ساتھ دیتا ہے۔ اگر وہ ادنیٰ کا ساتھ دے تو متوسط اور اعلیٰ قوائے دماغی رکھنے والے طلبہ کا سخت نقصان ہوگا۔ اور اگر اعلیٰ درجہ کی رفتار ترقی ملحوظ رکھے تو اس میں باقی دونوں درجہ کے لڑکوں کا سخت تر نقصان مضمر ہے۔ غرض کہ ہر دو صورتیں نقصان سے خالی نہیں ہیں تیسری صورت بھی گو مضرت سے خالی نہیں ہے مگر موجودہ حالات کے تحت غنیمت ضرور ہے۔ ہم مذکورۂ بالا خرابیوں کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ سالانہ امتحان کے نتائج پر نظر کی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ باوجودیکہ سال بھر کافی محنت کی گئی۔ مدرس بھی فرائض شناس تھے۔ اس پر بھی ہر جماعت سے کم و بیش ایک تہائی طالب علم ترقی سے محروم رہے۔ منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ طریقہ تعلیم اجتماعی ہے۔ مدرس کے بس کی بات نہیں کہ جماعت کے ہر ایک غبی اور کودن لڑکے کو پاس کرا کے اونچی جماعت میں بھیج دے۔ انہی مشکلات کو محسوس کر کے امریکہ میں جو اس وقت تعلیمی امور میں علم بردار سمجھا جاتا ہے، ڈالٹن پلین وغیرہ سے کام لیا جا رہا ہے جس میں طلبہ کی انفرادی صلاحیت کے ابھرنے اور ترقی پانے کی زیادہ گنجائش ہے۔ دوسرا سبب منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ہے کہ بکثرت طلبہ اوسط سے گرے ہوئے قوائے دماغی ساتھ لاتے ہیں۔ مدرس اگر بغور مشاہدہ کرے تو انہیں کوئی نہ کوئی ذہنی نقص ضرور ملے گا۔

بچے کا ابتدائی زمانہ جو بظاہر کھیل کود کا ہے اپنی گوناگوں اہمیت کے لحاظ سے خاص نگرانی اور غور و پرداخت کا محتاج ہے۔ گھر میں تربیت اور تعلیم اسی زمانے میں ہونا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ہم سے مفقود ہے اگر کسی کو مدرسہ کے سب سے گھٹیا، پس ترین گروہ اور زیادہ سے زیادہ طلبہ کا اجتماع ایک جگہ سے دیکھنا ہو تو مدرسہ کی سب سے پہلی جماعت میں پہنچ جائے اور نفسیات کے معمولی سے معمولی نظریے کا بطلان اور موٹے سے موٹے اصول کی تکذیب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے متمول حضرات کے لڑکے اچھے ماحول اور بہتر تربیت سے یوں بھی متمتع ہو رہے ہیں۔

مگر غریب لڑکے گھر کی تربیت اور اچھے ماحول سے یکسر محروم ہیں۔ اور ابھی وہ ایک زمانہ تک محروم رہیں گے کم سے کم انہیں مدارس ہی میں اتنا موقع ملنا چاہئے کہ ان کے حواس خمسہ اور قوائے دماغی کا نشو و نما ہو سکے۔ کتنے ناقص قوای اور متوسط قوائے سے گرے ہوئے لڑکے ہمارے مدرسوں میں برائے نام زیر تعلیم رہ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں! اور ذہین طلبہ کے مقابلہ میں دو دو تین تین سال ناکام رہ کر تھکے ہوئے ہیں اور بالآخر ہمیشہ کے لئے سلسلہ تعلیم کو قبل از وقت منقطع کر بیٹھتے ہیں! ایسے طالب علم جب مدرسہ میں داخل ہوئے تھے تو ان کی دماغی حالت بہتر تھی، مگر مدرسہ چھوڑتے وقت اور بھی غبی نکلے اور ناکارہ رفتہ ہو کر کشمکش حیات کیلئے یہ سرمایہ مدرسہ سے لے چلے۔ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایسے طلبہ جنہیں کوئی ذہنی نقص ہو یا متوسط درجہ سے گرے ہوئے ہوں معام مدارس سے الگ کر لئے جائیں اور انہیں ماہر فن مدرسین اور ماہر فن ڈاکٹروں کی نگرانی میں دیا جائے جو بغور مشاہدہ اور امتحان کے بعد فرداً فرداً ہر لڑکے کا مخصوص ذہنی نقص دریافت کریں اور اس کے علاج اور تعلیم کے خاص خاص طریقے بھی اختیار کریں تاکہ ایسے طلبہ قوم کے مفید رکن ثابت ہوں اور بحیثیت سماج میں کوئی حصہ لے سکیں۔

یہ امر طمانیت بخش ہے کہ اس سال بلدہ میں ایک ماڈل پرائمری اسکول جدید العصری نمونے کا جملہ آلات تعلیمی سے لیس اور اعلیٰ تربیت یافتہ استانیوں کی نگرانی میں قائم ہو چکا ہے یقین ہے کہ مذکورۂ بالا حالات کے تحت ارباب متعلقہ ان واقعات پر توجہ مبذول فرمائیں گے اور ناقص القویٰ نیز صغیر سن غریب طلبہ کیلئے بھی مدارس قائم کریں گے۔

فرقہ بندی اور تعلیم

دنیا کے عظیم الشان باعزت اداروں کے قیام و ترقی کا دار و مدار کسی نہ کسی روحانی فرقہ کے رہین منت ہونے کے باوجود موجودہ زمانہ کے ایک غیر جنبہ دار حامی تعلیم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ تعلیم پر علی العموم دنیا میں اور علی الخصوص ہندوستان میں فرقہ بندی کا اثر نہایت مضر پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے پس یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اہل ملک ان تمام طریق تعلیم سے اجتناب کریں جنہیں فرقہ وارانہ جذبات برانگیختہ و مشتعل ہوں۔

یہ امر مسلم ہے کہ تمام قدیم کالج اور یونیورسٹیوں کا وجود کسی نہ کسی مذہبی فرقہ کے جوش و تائید کا نتیجہ ہے۔ آج تک بعض تعلیمی اداروں کی سرسبزی و فلاح کا باعث خاص مذہبی فرقے ہیں۔ ازمنہ گزشتہ میں ٹکسیلا اور نلندہ میں بدھ مذہب کی یونیورسٹیاں اور گروکل یا ہندو مذہب کے ادارے موجودہ زمانہ کی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کی طرح قایم تھے۔ فی زمانہ دنیا کے ہر ایک گوشہ میں دینی مدارس اور کالجوں کا چلن ہے۔ ہندوستان میں بھی دو مصدقہ ہندو مسلم یونیورسٹیاں اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ ان کا سبب کیا ہے؟ عرصہ سے مذہبی تعلیم اور تعلیم بذاتہ دلمت و گریبان ہیں اب اس روایت کا ترک بھی لوہے کے چنے ہیں نہ اگلتے بنتے ہیں نہ نگلتے۔ موجودہ اداروں میں ان کا رواج ہے۔ اور آئندہ ان کے ترک پر ہم قادر نہیں ہیں۔ اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے تو مذہب بذاتہ فرقہ وار جوش و دیوانگی کا محرک نہیں ہے۔ وہی ادارے فرقہ وارانہ کہلانے کی مستحق ہیں جن کے قیام و پرداخت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جائے کہ ان کے سند یافتگاں کے تخیلات و مقاصد علم تک محدود نہ رہیں بلکہ وہ خارجی اثرات بھی قبول کرنے کی صلاحیت رکھیں اس طرح وہ تمام مدارس اور یونیورسٹیاں جن کو کسی انجمن یا جماعت یا خاص فرقہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی ان کے حصول مقصد کے لئے کرنا پڑتی ہے یقینی فرقہ وارانہ ادارے ہیں۔

تعلیم میں کسی نوعیت کی بھی فرقہ بندی کا وجود اس کی صحیح علمی زندگی کے تخیلات کے منافی ہے ہاں ممکن ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں مذہب اور تعلیم کا الحاق ہمارے آبا و اجداد کے طرز معاشرت

کی وجہ سے قدرتی ولازمی رہا ہو۔ اب اس کی ضرورت مرتفع ہوگئی ہے اور ان کے یکجائی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ پھر اس کا لحاظ بھی لابدی ہے کہ ہماری قوم کے اکثر افراد کی فرقہ وارانہ ذہنیت واختلافات اور روزانہ کے جھگڑوں کے مدنظر طریقہ تعلیم میں ایسا تغیر وتبدل کیا جائے کہ فرقہ بندی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ یہ امر بھی بلا اختلاف تسلیم کیا جائے گا کہ کسی ادارہ کے مدرسین وطلبہ میں فرقہ بندی کا وجود اس کی سائنسی تحقیقات اور آزادخیالی سے تضاد کی نسبت رکھتا ہے۔ سائنسی تحقیقات اور آزادخیالی علمی زندگی کی جان ہے اور ہمیشہ ہونا چاہیئے۔ مقصد تعلیم یہ نہیں ہے کہ اساتذہ کی تقریروں اور کتابوں کے ماحصل کو ذہن نشین کرنے پر قناعت کی جائے بلکہ ان کی آرا کو غیر جنبہ داری و تنقیدی نظر سے جانچنا اور بلا تعصب کے علم کو ترقی دینا۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام فرقہ وارانہ مدارس بلحاظ اغراض ذاتی وغیرہ اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل سے قاصر رہیں گے۔ اگر وہ اپنے گروہ یا جماعت یا فرقہ کے وفادار ہیں جن کی نمایندگی کا ان کو فخر حاصل اور جن کی اعانت پر ان کا وجود موقوف ہے تو سودمند تعلیم کے اصول پر کاربند ہونے کا دعویٰ باطل و بے حقیقت ہے۔ کیا ہم نہیں جانتے ہیں کہ ایک فرقہ وارانہ مدرسہ کے اکثر مدرسین اور طلبہ کی سعی ہوتی ہے کہ وہ اس خاص فرقہ کے اصول پر کاربند ہوں جن کی ان کو تعلیم دی گئی ہے اور ان اصول کی خواہ مخواہ حمایت میں سرگرم رہیں خواہ وہ کیسے ہی خراب و کیک ہوں۔ تاریخ میں ہم کو کافی مواد مل سکتا ہے کہ مذہب دا اپنے عام اور معمولی معنی میں ہمیشہ ہی خواہ مخواہ سائنس کی راہ میں روڑے اٹکاتا رہا۔ اب فرقہ وارانہ اداروں کی بحث اسی صورت میں ہے کہ وہ حمایتی انجمن یا فرقہ کی وفاداری کے ساتھ ساتھ علمی زندگی کے تخیلات کی تکمیل میں سرگرم ہو وہ اپنے فرقہ وارانہ مقاصد واغراض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مقصد علم سے بھی غافل نہ ہوں۔ یہ ہی طریقہ آجکل رائج اور رہر دل عزیز ہے۔ اس صورت میں ان کی حالت اس شخص کی ہوگی جو ذرا فاصلہ سے رکھے ہوئے دو اسٹولوں پر بیک وقت بیٹھنا چاہے اور ان کے درمیان گر پڑے اور اس مثل کا مصداق ہو "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہتے" خیر۔ وہ متنبہ ہو جائے گا لیکن یہ خسارہ پر خسارہ اٹھائیں گے اور اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ آخرکار ان کے افعال واعمال علم اور مذہب دونوں کے معیار سے گرجائیں گے اور ان کے ہر ایک فعل میں مکاری وکیادی کی جھلک نظر آئے گی۔

آزاد تعلیم کے وسیلہ سے انسان اخوت وہمدردی کے جذبات تک عروج کرتا ہے لیکن فرقہ وارانہ ادارے ان کے نشو ونما میں سد راہ ہوتے ہیں۔ کوئی سنجیدہ صاحب فراست انکار نہیں

کر سکتا کہ خاص مسلمہ قومی اغراض و مقاصد کی خواہش دو یا زیادہ قوموں کے مابین اختلافات کے سمندر کو وسعت نہیں دیتی۔ وہ ادارے فرقہ بندی کے لئے قایم کئے گئے ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ خیال کے مردوزن کی افزایش کے سوا کوئی خدمت ملک کیسے انجام دے سکتے ہیں اسی سبب سے ہم کو بعض ایسے اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے جن کے صفات عجیب و غریب ہیں ایک طرف علم کے حامی اور دوسری طرف سخت متعصب۔ اگر آپ کو فرقہ بندی کے مضر اثرات بہ نفس نفیس ملاحظہ فرمانا ہے تو ذرا زحمت فرمائیے۔ فرقہ وارانہ اداروں کے اراکین سے وقتاً فوقتاً ملاقات فرمایئے۔ ان سے گفتگو کر کے ان کے خیالات کا اندازہ فرمالیجئے اور ان کے اعمال کی نگرانی کیجئے۔ انشاء اللہ آپ کو خودغرضانہ عزور اور فرقہ وارانہ نفرت کی جھلک ان کے ہر ایک قول و فعل میں نظر آئیگی فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا کرنے اور اس کو دائمی بنانے کے علاوہ بعض فرقہ وارانہ ادارے آداب نشست و برخاست و اکل و شرب کے متعلق ایسے اصول سکھاتے ہیں اور ان کی عادت ڈال دیتے ہیں کہ دوسرے فرقہ کے طالبعلم کو ایک خاندان کے رکن کی حیثیت سے ان کے ساتھ بود و باش اختیار کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔

بعض ادارے مثلاً عیسوی مشن کے مدارس دعوی کریں گے کہ فرقہ وارانہ اختلافات کی علٰحدگی طلبہ کی علمی زندگی سے ان کے اغراض و مقاصد کا ایک اہم جزو ہے۔ ان پر فرقہ وارانہ اختلافات کی ذہنیت پیدا کرنے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے بصد ادب عرض کیا جائیگا کہ اگرچہ ان کے دعوی کا صدق پر مبنی ہونا بعید از عقل نہیں ہے تاہم ان کے اغراض مخفی اور ان کے طرق حصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا دماغ قابل اطمینان نہیں ہوسکتا اور شاید انکا دعوی کردہ مقصد کبھی حاصل ہوجاتا ہو۔ مشنری ادارے اولاً مشنری ہیں پھر علمی۔ صرف یہی بات ان کے ہم خیال اور ان کے مخالفین کو ایک دوسرے سے بدظن کرنے کو کافی ہے ان اداروں کی علمی زندگی کے فائدہ مند اصول کا اثر ان اصحاب پر نہیں پڑتا جن کو ان سے بہرہ اندوز ہونا چاہیئے۔

یہ امر بھی اظہر من الشمس ہے کہ آجکل کل تحقیقات کا دارومدار سائنس پر ہے اور اس کے مسلمہ اصول و معلومات کو دنیا بلا رد و قدح قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے کیونکہ ان کی بنا عقل پر ہے۔ اکثر امور معتقدات مذاہب کے خلاف ہیں پھر ان کی تعلیم عیسائی یا دیگر مشنری اداروں میں رواج پانا کس حد تک مناسب ہوسکتا ہے اور ان سے طلبہ کو کیا فائدہ ہوگا۔ اگر مذہبی تعلیم لازمی ہے

تو اس کے لئے معابد زیادہ موزوں ہیں لیکن ایسے ادارے اس کے لئے ہرگز ہرگز زیبا نہیں ہیں جہاں بیک وقت دینی و دنیاوی امور سکھائے جائیں اور مسائل ہر دو خلط مبحث کر دیئے جائیں نئی لہما اس مبحث میں پڑنا اس مضمون کے دائرہ سے خارج ہے کہ بعض مذاہب کے اصول کی تعلیم کس حد تک ضروری و لازمی ہے نہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں سے فلسفہ مذہب اور تاریخ مذاہب کی نصاب بھی نکال دیئے جائیں بلکہ ان کی تعلیم ایسے اصول پر دی جائے کہ اختلافات و منافقات کا سدباب ہے

فرقہ وارانہ جذبہ نے تعلیم میں کچھ ایسی ناگفتہ بہ صورتیں پیدا کر دی ہیں جن کو علمی تعصبات کے نام سے یاد کرنا بیجا نہ ہوگا۔ ان کا تعلق جماعت منتظمین یا تاریخ ادارہ سے ہے مثلاً کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں عورتیں ان ممتاز اداروں سے متمتع نہیں ہو سکتیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں طالبات کا داخلہ تک ممنوع ہے وہاں مستورات کے دو کالج ہیں جن کا تعلق بھی یونیورسٹی نے اپنی ذات سے رکھنا گوارہ نہ کیا۔ وہ یونیورسٹی یونین کی رکن تک نہیں ہو سکتیں صرف اس کے جلسوں میں بطور تماشائی شرکت کر سکتی ہیں۔ اس کا باعث مذہب کا گہرا اثر ہے کہاں! ایک ممتاز انگریزی یونیورسٹی ہیں جس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے۔ اس پر کیا موقوف۔ دوسرے اداروں میں عورتوں کے نمائندے بہت کم ہیں۔ وہ ہر طرح سے ذہنی ترقی سے محروم رکھی جاتی ہیں جن کا سب سے بڑا اور اہم سبب مذہب و تعلیم کا خلط ملط ہے انگلستان کا ذکر کیا وہ ایک مہذب اور تعلیمیافتہ ملک ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی حالت اس سے بدتر ہے ور ان سے بھی خراب اچھوتوں کی گت ہے۔ یہ دونوں فرقہ وارانہ تعصب کے قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے ہیں اور ان کو باور کرایا جاتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت سے محروم رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

تعلیم میں فرقہ بندی کا باعث صرف مذہب نہیں ہے لیکن سب سے زیادہ دخل اسی کو ہے۔ فی زمانناہندوستان میں انے گنے ادارے کما حقہ خود مختار ہیں اور ان میں فرقہ وارانہ جذبہ کا اثر نہیں ہے۔ جہاں مذہب کو دخل نہیں وہاں سیاسی ضروریات کے لحاظ سے ناجائز قیود عائد کی جاتی ہیں اور ان کی علمی نمو متاثر ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائی سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ دباؤ بھی مذہب سے کم قاتل نہیں ہے۔ یہ مسلم ہے کہ حکومت وقت کا کچھ نہ کچھ رسوخ تعلیمی اداروں میں رہنا چاہیئے لیکن اس کا ادارہ کے معمولی سے معمولی انتظام میں دخل دینا اور اس کے تفصیلی حالات پر دسترس رکھنے کی کوشش زہر ہلاہل سے کم نہیں نقصان یقینی و لازمی ہے۔ تمام ماہرین تعلیم نے تسلیم کیا ہے کہ متذکرہ بالا اصول پر کاربند ہونے سے اہل ادارہ پر الٹا اثر پڑتا ہے طلبہ و منتظمین میں شک و شبہ کی وبا پھیلتی ہے حکومت بھی نقصان سے محفوظ و مامون نہیں رہتی۔ اس سے بہتر ہے کہ طلبہ کو چند سیاسی

مکالمہ کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے دی جائے۔

لہٰذا تعلیمی اداروں کو اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے غیر فرقہ وارانہ خود مختار ہونا چاہیئے۔ ان کو کسی صورت و حالت میں بھی مذہبی تبلیغ و اشاعت کا گہوارہ نہ بنانا چاہیئے۔ اگر مذہبی تعلیم کی ضرورت لابدی ہے تو اس کو مذہبی انجمنوں کے ذریعہ انجام پانا چاہیئے جو فرقہ وارانہ ادارے مذہبی و علمی دونو خدمات کو بیک وقت انجام دینا چاہتے ہیں وہ اکثر اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ اور قومی خوشحالی کو بعید و انتہا نقصان پہونچاتے ہیں۔ جو باتیں کسی خاص مذہب میں اچھی اور سب انسانوں کے لئے یکساں مفید ہوتی ہیں وہ سائنس اور عام معلومات کے ذیل میں بآسانی پڑھائی جا سکتی ہیں۔

مذہب کے اصول سے فرقہ بندی کو ترقی ہوتی ہے۔ ان کے علم سے عام خلقت کو کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بنی نوع انسان کے یکجا رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے جذبہ کو فنا کرنے میں معین ہوتی ہے جو انسان کی خوشحالی اور قومی زندگی کے ہر ایک راہ پر کامیابی سے گامزن ہونے کے لئے لازم ہے اسی طرح حکومت کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اداروں کی تنظیم اور انتظام کو ان پر چھوڑ دیں اور ضرورت سے زیادہ دخل نہ دیں ورنہ اساتذہ و طلبہ میں شک و شبہ و مکاری کی بری خصلتیں گھر کریں گی جو علمی زندگی کے شجر کو رفتہ رفتہ کھوکھلا کر دینے میں کوئی کسر اوٹھا نہ رکھیں گی۔

غرض کہ تعلیم کو فرقہ بندی سے بعید و انتہا نقصان پہونچا ہے۔ ہمارے وطن میں اس کی برائیاں اور نقصانات روز روشن کی طرح ظاہر و ہویدا ہیں۔ ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہیں وہ ہم کو نظر نہیں آتیں۔ عادت نے بالکل اندھا کر دیا کسی وقت دھندلا سا خیال آجاتا ہے تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ”دید خواہد شد“ کی سپر کام کر جاتی ہے۔

محمد وحید الحق

عربی کا طریقہ تعلیم

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

عربی تعلیم کا آغاز ہندوستان میں گذشتہ چند صدیوں سے ہوا ہے۔ اس کی تحصیل میں زیادہ تر مسلمانوں ہی نے حصہ لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر مسلمان اپنے بچے کو عربی پڑھنا سکھانا مذہبی نقطۂ نظر سے ضروری خیال کرتا ہے اور یہ تعلیم صرف کلام مجید کی تلاوت ہی کی حد تک محدود رہتی ہے اس تعلیم کا آغاز

طرح ہوتا ہے کہ پانچ سال کی عمر میں بچے کی تسمیہ خوانی کے بعد عربی زبان پڑھنے کے طریقے بتلائے جاتے ہیں عربی عبارت کے معنی و مطلب سے سروکار نہیں ہوتا۔ اور تقریباً تین سال میں بچہ کلام مجید ختم کرلیتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم زیادہ تر ان ابتدائی مدارس میں دی جاتی ہے جو ہندوستان میں عموماً "مکتب" کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ ماہران تعلیم کا خیال ہے کہ اس طرح کسی غیر زبان کی تعلیم حاصل کرنا بچوں کی ذہنیت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ سردست اس قسم کی تعلیم کے انسداد کی کوئی فوری صورت نظر نہیں آتی تاہم آجکل اس کی بجائے دیسی زبان کی تعلیم مقبول عام ہوتی جا رہی ہے۔ مکتبوں میں کلام مجید پڑھنے سے کسی طالب علم کو عربی زبان کی تحصیل میں کسی قسم کی آسانی نہیں ہوتی اور نہ اس تعلیم کا یہ مدعا ہوتا ہے مگر پھر بھی ہندوستان میں ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے کلام مجید ختم کرنے کے بعد بچے کو اردو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ اس وجہ سے کہ تمام ہندوستان میں یہ مسلمانوں کی عام طور پر مادری زبان ہے اس کے بعد فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے اور پھر عربی زبان کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ طالب علم فارسی میں ترقی کرلیتا ہے۔ ہمارے مدارس کے نصاب میں دینیات کی تعلیم لازمی ہے مگر زبان زائد کے لئے فارسی یا عربی کے انتخاب کا موقع دیا ہے۔ اس سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ والدین اکثر فارسی کو عربی سے آسان ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کے لئے انتخاب کرلیتے ہیں۔

عربی تعلیم کا قدیم طریقہ قدیم زمانے میں عربی سیکھنے کے لئے طالب علم کو تقریباً ۸ سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک صرف عربی قواعد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قواعد کی گردانوں کے سوا طالب علم کو اس زمانہ میں کچھ نہ پڑھایا جاتا تھا۔ طالب علم کے لئے یہ اس قدر کٹھن منزل ہوتی ہے کہ اس سے منزل مقصود کو پہنچنے کی بہت کم توقع کی جاسکتی ہے۔ اس وجہ سے کہ قواعد کے طویل صیغے اور گردانیں اسے بغیر سوچے سمجھے زبانی یاد کرنے پڑتے ہیں۔ افعال کی اقسام کی مثالوں کو جدا ازبر کرنا پڑتا ہے۔ قواعد کے مقررہ جملے، الفاظ اور ان کے تعلیلات کو رٹ لینا وبال جان ہوتا ہے۔ اور طالب علم کو عربی زبان نہایت ادق معلوم ہوتی ہے اسی سبب سے اکثر لوگ عربی کا شمار ان زبانوں میں کرتے ہیں جن کی تحصیل مشکل ترین خیال کی جاتی ہے۔ ان دقتوں کی وجہ سے صرف ان ہی طلبہ کے لئے عربی زبان کی تحصیل ممکن ہوتی ہے جنہوں نے اپنا پورا وقت اسی کے لئے وقف کر دیا ہو اس لئے عربی کی تحصیل میں صرف وہی لوگ جانفشانی کرنے لگے جنہیں مذہبی تعلیم کا ذوق ہوتا تھا اور انہوں نے عربی قواعد پر عبور حاصل کرنے میں قابل داد استقامت کا ثبوت بھی دیا۔ اور عربی کی تحصیل کے لئے قواعد پر عبور حاصل کرنا بھی ضروری ہے لیکن ایک خرابی یہ ہے کہ ایسے طالب علم

کو سوائے زبان کی قواعد اور ضوابط کی کتابوں کے دوسرے کتابوں کے مطالعہ کا موقع بہت کم ملتا ہے
اس لئے یہ قدیم طریقہ اپنی خاص خصوصیت اور اہمیت کے باوجود اس زمانے میں رواج نہ پا سکا اور
اس طریقے کے نقائص کا احساس اس وقت ہوا جب کہ انگریزی مدارس ہندوستان میں رائج ہو گئے

ہمارے مدارس میں جہاں طالب علم کو مختلف مضامین پڑھنے ہوتے ہیں وہاں اس قدیم
طریقے کا رواج تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے بعض ایسے حضرات نے بھی جنھوں اگرچہ اسی قدیم طریقہ
پر تعلیم حاصل کی تھی پرانے طریقے کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی تاکہ مدرسہ کے مقررہ مختصر وقت میں
طلبہ عربی کی تعلیم بآسانی حاصل کر سکیں۔ مگر اکثر مدارس میں اب بھی قدیم طریقہ کا رواج پایا جاتا ہے
اس کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے کہ مدارس میں عربی کی تعلیم کے لئے ایسے مدرسین دستیاب نہیں ہوتے
جنھوں نے جدید طریقہ پر تعلیم پائی ہو اور جدید طریقہ پر تعلیم دے سکیں۔ عربی پڑھانے کے لئے طریقہ
راست Direct method جدید طرز کے مدارس کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس طریقہ کو رواج
دینے میں ایک دقت بھی پیش آتی ہے کہ ہندوستان میں عربی السنہ قدیم میں داخل ہے۔ اور یہاں
بہت کم بولی جاتی ہے۔ اس لئے طالب علم کو شاذونادر ہی عربی میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے
اس کے علاوہ ہمارے یہاں عربی پڑھنے کا صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ قدیم عربی ادب
یا مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور بس۔ اور جہاں تک جدید مدارس کی تعلیم کا تعلق ہے
اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم عربی کے ضروری الفاظ اور قواعد کے اہم قاعدوں سے واقف
ہو جائے۔ اس قدر کہ وہ آسان عربی عبارت کا جو زیادہ دقیق نہ ہو دیسی زبان میں ترجمہ کر سکے۔

مخفی نہ رہے کہ عربی کی تحصیل کے لئے صرف و نحو سے کافی واقفیت کی ضرورت ہے اسی
لئے عربی زبان کے علماء نے اس طرف خاص توجہ مبذول کی تھی۔ طالب علم اگر ابتدائی زمانے میں
عربی قواعد پر عبور حاصل نہ کرے تو وہ آئندہ اس زبان میں ترقی نہیں کر سکتا۔ چونکہ ہمارے مدارس
میں قواعد کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اس لئے اکثر طلبہ میں سے مدارس کی تعلیم ختم کرنے کے
بعد عربی میں ترقی کرنے کی صلاحیت اپنے میں نہیں پاتے اور وہ ناامید ہو کر عربی کی تحصیل کو خیرباد
کہہ دیتے ہیں۔ اس لئے ذیل میں ہم ایک ایسا طریقہ پیش کرتے ہیں جو قدیم اور جدید طریقوں کی
خرابیوں کو دور کرنے میں ہمیں مدد دے گا۔

عربی پڑھانے کا بہتر طریقہ

کسی زبان کو پڑھانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو وہ قدیم پرانا طریقہ ہے جس
میں ترجمہ کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر یہ طریقہ عام طور پر مستحسن نگاہ سے

نہیں دیکھا جاتا۔ دوسرا طریقہ راست ہے جسے انگریزی میں Direct method کہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتلایا گیا ہے ہندوستان میں عربی کی تعلیم کے لئے طریق راست ذرا دقت طلب ہی ہے۔ تاہم ایک فرض شناس مدرس خواہ وہ ان ٹرینڈ ہی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی طرح عربی اسباق کو متوسط دماغ کے طلبہ کی استعداد کی حد تک بھی دلچسپ اور آسان بنا سکتا ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے طلبہ کو عربی پڑھانے کے لئے قدیم طریقہ کی پابندی بھی ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ طریقہ راست سے جہاں کہیں موقع ملے کام لیا جائے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے پہلے قواعد کے خاص قاعدوں کی چند مثالیں طلبہ کے سامنے پیش کی جائیں۔ جب انھیں ان مثالوں کی مشق ہو جائے تو انھیں طریقہ راست پر تعلیم دینے کی کوشش کی جائے۔ جہاں یہ ناممکن ہو وہاں مدرس منتخب آسان مثالیں پیش کر کے انھیں دیسی زبان میں سمجھا سکتا ہے۔ اس کام کے لئے صرف وہی مثالیں لی جائیں جو مابہ الامتیاز عربی خصوصیات رکھتی ہوں۔ اور ایسی خصوصیات اردو، فارسی یا انگریزی میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اس وجہ سے کہ عربی اور دوسری زبانوں میں بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے۔

تلفظ (الف) حروف صحیح :۔ عربی کی بعض آوازیں ایسی ہیں جنھیں نہ صرف ہندوستانی بلکہ ایرانی اور بہت سے غیر سامی نسلوں کے لئے بھی صحیح طور پر ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ ایرانی یا ہندوستانی عربی کے ان الفاظ کے تلفظ کے وقت جو اُن کی زبان میں مستعمل ہیں مندرجہ ذیل حروف کا صحیح فرق ظاہر نہیں کر سکتے۔

ء اور ع
ہ اور ح
ت اور ط
س اور ص یا ث
ز اور ظ، ض، ذ

اس لئے طلبہ کو عربی حروف کے صحیح تلفظ کی مشق کرائی جائے۔ اس قسم کی ذرا سی مشق بھی طلبہ کو صحیح تلفظ نکالنے کے قابل بنا دے گی۔ عربی کے چند حروف ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں غلط طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔ مثلاً بنگال میں ج کو ز پڑھتے ہیں اور تعجب کا مقام ہے کہ اس طرح ز کو ج۔ پنجابی ق کا صحیح تلفظ ادا نہیں کرتے اور جنوبی ہندوستان میں ق

اور خ کے تلفظ میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر ایسی صورتیں پیش آئیں تو مدرس ابتداہی سے ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے ذراسی وقت برداشت کرلے تو ان عیوب کو آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے دوسرا لفظ جو ہندوستان میں عام طور پر غلط پڑھا جاتا ہے "و" ہے۔ اس لفظ کا تلفظ انگریزی (W) کے تلفظ کے مانند ہے (V) کے مانند نہیں۔ اس لئے و کا تلفظ دانتوں کو زبان سے چھوئے بغیر صرف ہونٹوں سے ادا کیا جائے۔ البتہ (V) کا تلفظ فارسی یا اردو کے واو کے مانند ہے۔ عربی میں ایسی کوئی آواز ہی نہیں ہے

ب۔ حروف علت عربی میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں کی بہ نسبت حروف علت بہت ہی کم ہیں۔ شائد اسی لئے ہندوستانیوں نے عربی کے حروف علت کی آوازوں میں دگنا اضافہ کردیا ہے۔ اس قسم کے اختلاط سے عربی الفاظ کے تلفظ میں ایسی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ بھی عربی کی حقیقی آوازیں ہیں۔ افسوس ہے کہ عربی کے اساتذہ اس طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند مشہور غلطیوں کو درج کرتے ہیں جن سے اس قسم کے اختلاط کی کافی تشریح ہوگی۔

(۱) عربی میں صرف تین حروف علت بتلائے جاتے ہیں۔ یعنی و ا ی مگر عربی حروف علت کی آوازیں انگریزی حروف u, i, a کے مساوی ہیں اور ان ہی کو مفتوح کرکے اس طرح بھی ادا کیا جاتا ہے ū, ī, ā ان چھ حروف علت کی آوازوں کے علاوہ دو لین معروف Diphthongs بھی ہیں ai اور au =

(۲) انگریزی حروف e اور o کی آوازیں خواہ یہ کھینچ کر پڑھی جائیں یا نہ کھینچ کر عربی حروف علت کی آوازیں نہیں ہیں۔ مگر یہ آوازیں دوسرے ممالک کی عربی زبان یا بعض مقامات کی عربی بول چال میں شامل ہوگئی ہیں۔ اور عربی السنہ قدیم میں ان کا پتہ نہیں۔ اس لئے اساتذہ اس بات کا خیال رکھیں کہ طلبا ان غلط آوازوں کے عادی نہ ہوجائیں۔

عربی ہجا عربی حروف کا ٹائپ Type ایک حد تک صوتیات کے اصول پر قایم ہے ہر ایک حرف اپنی ایک ہی آواز رکھتا ہے۔ صرف متذکرہ بالا حروف علت ہی کی آوازوں کے تلفظ میں طلبا کو دقت پیش آتی ہے۔ اگر طلبا کو ان حروف کا صحیح تلفظ سکھایا جائے تو یہ دقت بہ آسانی رفع ہوسکتی ہے ان امور پر بھی جو درج ذیل ہیں توجہ کرنی ضروری ہے۔

(۱) ا اور ع کے استعمال کے فرق کو واضح کیا جائے۔ اور طلبا کو ایسے قاعدے بتلائے جائیں

جن سے ان حروف کا صحیح استعمال انھیں معلوم ہو جائے۔ ان قاعدوں کے لئے "المنجد" عربی لغت مطبوعہ بیروت کے مقدمہ کا مطالعہ اساتذہ کے لئے مفید ہوگا۔ یہ ایک مستند عربی لغت ہے جسے بیروت کے کیا تھلک پریس نے جدید طرز پر مکمل کر کے شائع کیا ہے۔

(۲) اسی طرح طلبا کو الف اور ی کے تلفظ اور ان کے استعمال کا باہمی فرق اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے۔ ایسی مثالیں بھی پیش کی جائیں جہاں الف یا ی لکھنے یا پڑھنے میں پوشیدہ ہوا کرتے ہیں۔ اس قسم کے استعمال وغیرہ کی نسبت چند آسان قاعدے بنا کر طلبا کو بتلائے جائیں۔ عربی الفاظ کے ہجوں اور تلفظ کی نسبت مدرس کو ڈبلیو۔ رائٹ کی قواعد عربی Grammar of Arabic Language حصہ اول طبع سوم میں کافی مواد مل سکتا ہے۔

(۳) عام طور پر عربی خط میں طرز تحریر کے نقطہ نظر سے چند خاص غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اور اکثر عربی کے عالم فاضل بھی اپنی لاپروائی کی وجہ سے عموماً ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں اس لئے اساتذہ کا فرض ہے کہ ایسی غلطیوں کی ایک فہرست تیار کریں اور جب طلبا میں ان باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو انھیں ان غلطیوں سے بخوبی واقف کرایا جائے۔

(۴) اردو اور فارسی میں عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ ان زبانوں میں اگرچہ اپنی اصلی حالت میں لکھے جاتے ہیں مگر ان کا تلفظ اکثر و بیشتر بدل جاتا ہے۔ ایسے عربی الفاظ بہت ہی کم ہیں جن کا طرز تحریر دوسری زبانوں میں صاف طور پر بدل گیا ہو اور ان کے معنوں میں بھی فرق آگیا ہو۔ مثلاً عربی لفظ "ارادۃ" کو لیجئے یہ لفظ اردو اور فارسی میں دو طریقوں سے لکھا جاتا ہے یعنی "ارادہ" اور "ارادت" اور ان دونوں کے معنوں میں بھی فرق ہے۔ مگر عربی میں ایسا نہیں ہوتا عام طور پر مادری زبان اردو ہونے کی وجہ سے طلبا عربی الفاظ کو اردو رسم خط میں لکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے صرف انہیں عربی اور اردو میں ان الفاظ کے رسم خط کے فرق کو سمجھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اساتذہ طلبا کی اس عادت کو چھڑانے کے لئے سخت محنت کریں اور انھیں یہ باتیں اسی وقت بتلائی جائیں جب کہ ان میں ان باتوں کو سمجھنے کی کافی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو۔

(۵) عربی کے ایسے بہت سے الفاظ بھی اردو اور فارسی میں مستعمل ہیں جو ان زبانوں میں دو طریقوں سے لکھے جاتے ہیں۔ عربی طرز تحریر کے اصول پر یا اردو فارسی رسم خط کے مطابق۔ اس لئے طلبا کو بتلایا جائے کہ ایسے الفاظ کو اردو یا فارسی رسم خط میں لکھنے کی بجائے عربی طرز تحریر کے اصول پر لکھا کریں۔ ایسا کرنے میں انھیں کچھ ایسی زیادہ دقت نہیں محسوس ہوگی۔

(الف) قواعد اور زبان کے متعلق عام معلومات کے لئے حسب ذیل ہدایات مفید ثابت ہونگے

(۱) عربی definite & indefinite articles کا استعمال ہمارے طلبہ کے لئے کسی قدر مشکل ہوتا ہے اس لئے ابتدا ہی میں طلبا کو ان کا استعمال اچھی طرح سمجھایا جائے اور ان کے استعمال کی مشق کافی طور پر کرائی جائے۔

(۲) دوسری سامی Semitic زبانوں کی طرح عربی میں بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں جو بغیر فعل کے بنتے ہیں۔ فعل کی تمثیلات Paradigms سمجھانے سے پہلے طلبا کو اس قسم کے جملے بتلائے جائیں۔ تھوڑی سی مشق کے بعد وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ اس قسم کے جملے خود بنا سکیں جن میں فعل کی امداد کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۳) متذکرہ بالا جملوں کے ساتھ ساتھ طلبا کو جمع سالم کے عام طریقے بتلائے جائیں۔ اس کے بعد جمع مکسر کے۔ لیکن جمع مکسر کے قاعدے طلبا کے لئے نہایت مشکل ہوتے ہیں اس لئے سب قاعدے جلد جلد ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ سہولت کے ساتھ بتدریج ان قاعدوں سے طلبا کو واقف کرایا جائے۔

(۴) جمع کے قاعدے بتلانے کے بعد تثنیہ کے قاعدے بتلائے جائیں۔

(۵) عربی زبان میں تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدے بہت آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی جماعتوں ہی میں طلبا ان سے بخوبی واقف کرائے جا سکتے ہیں۔ مگر تذکیر و تانیث کے عام قاعدوں کے مستثنیات کو ان کی استعداد کا لحاظ کرتے ہوئے رفتہ رفتہ تھوڑے تھوڑے کر کے سمجھایا جائے۔

(۶) اعداد صفتی و ذاتی عموماً ابتدا میں نہیں بتلائے جاتے۔ ابتدا ہی سے ان کے استعمال کی مشق کرائی جائے۔ ہاں قواعد کے لحاظ سے ان کے استعمال کے مواقع آگے چل کر بتلائے جا سکتے ہیں۔

اگر متذکرہ بالا ہدایت پر عمل کیا جائے تو یقین ہے کہ طلبا مختصر جملوں کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اور ایسے الفاظ کو بھی مختصر جملوں میں استعمال کر سکیں گے جو انھوں نے پڑھے ہیں۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد مدرس ان قاعدوں کا ایک دفعہ اعادہ کرے جو اب تک پڑھائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ذیل کے بتائے ہوئے سلسلے پر عمل پیرا ہو تو بہتر ہے۔

(۱) ضمائر منفصل بتلائے جائیں اور طلبا کو ضمائر منفصل جملوں میں استعمال کرنے کے طریقوں سے بخوبی واقف کرایا جائے۔ انھیں صرف وہی ضمائری سابقے Pronominal suffixes بتلائے جائیں جو اسم کی مختلف قسموں کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں اس کام کے لئے مدرس سبق

کی تیاری اچھی طرح کرلیا کرے اور کافی مقدار میں مشق بہم پہنچائے ۔لیکن وہ ضمائری سابقے نہ بتلائے جائیں جو افعال کے ساتھ آتے ہیں جب طالب علم افعال کی گردان سیکھ لیں گے تو وہ بہ آسانی ان سے خود واقف ہوجائیں گے ۔اس وقت مدرس کا یہ فرض ہے کہ افعالی سابقوں اور اسمی سابقوں کا مقابلہ کرکے انھیں ان دونوں کے باہمی فرق سے بخوبی واقف کرائے ۔

(۲) ضمائر کا بیان ختم کرنے کے بعد صفت کا بیان شروع کیا جائے ۔واحد وجمع مذکر و مونث کے ساتھ صفت کے استعمال کا طریقہ بتلایا جائے ۔اور اس کے ساتھ ساتھ تنہیٹا Articles "ال" اور "عن" کا استعمال بھی اب مزید وضاحت کے ساتھ بتلایا جائے ۔اور چھوٹے چھوٹے اسمیہ جملوں کے ذریعے ان کے استعمال کی کافی مشق کرائی جائے ۔اس کے بعد حروف ربط Prepositions حروف عطف اور ضمائر اشارہ کے استعمال کے طریقے حسب ضرورت طلبا کی استعداد کا بغور اندازہ کرتے ہوئے بتلاتے جائیں لیکن حروف ربط کا نحومی اثر جو ان جملوں پر پڑتا ہے اسے تفصیل سے بتانے کی ابھی چنداں ضرورت نہیں ۔اس اثر کو صرف اسی قدر واضح کیا جائے جس کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے ۔

(۳) فعل ۔فعل کے بیان کا آغاز فعل ثلاثی زمانہ ماضی Triliteral verb in Past tense سے کیا جائے ۔مضارع اور امر Imperative کا بیان متعاقب بتلایا جائے افعال ثلاثی کے پہلے سبق کے لئے جو فعل استعمال کیا جائے اس میں ایسے حروف نہ آنے پائیں جن کا تلفظ طلبا کے لئے مشکل ہو ۔پوری گردان Paradigm وقت واحد میں نہ بتلائی جائے بلکہ مختلف صیغے چھوٹے چھوٹے جملوں میں منتخبہ فعل کے ساتھ بتلائے جائیں ۔اس طرح بتدریج تمثیلی جملوں کے ذریعے گردان کو ختم کیا جائے تاکہ طلبا بہ آسانی اس گردان سے واقف ہوجائیں جو قواعد کی کتاب میں درج ہوتی ہے ۔اس موقع پر مادری زبان میں ایسے جملے عربی ترجمے کے لئے دئیے جائیں جن میں اسی فعل کے مختلف صیغے استعمال کئے گئے ہوں ۔اس کے بعد چند اور فعل دے کر طلبا سے عربی میں ان کی گردان بنوائی جائے اور مختلف جملوں میں استعمال کرایا جائے ۔گر ہر سبق میں مدرس کی یہ کوشش رہے کہ طلبا حتی الامکان نئے الفاظ سیکھتے جائیں تاکہ ان کے حافظے میں الفاظ کا کافی ذخیرہ جمع ہوتا جائے ۔فعل ثلاثی زمانہ ماضی کے بعد auxiliary verb کا بیان شروع کیا جائے ۔اس کے ساتھ طلبا کو چند ضروری فعل نہی بنانے کے طریقے اور کلمات استفہام سکھائے جائیں ۔اس طرح طلبا کو استفہامیہ و فعل نہی کے جملے بنانا آجائے گا فعل ثلاثی ماضی کا بیان اس طرح ختم کرنے کے بعد مضارع کا بیان شروع کیا جائے اور اس بیان کو بھی اسی طرح ختم کیا جائے جس طرح کے ماضی کے بیان کو ختم کیا گیا ہے ۔مضارع کے بعد

امر کا بیان شروع کیا جائے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول فعل متعدی معروف کے ساتھ بتلائے جائیں۔ پھر اسم مصدر سمجھایا جائے۔ اور اسی ترتیب کے ساتھ جس طرح کے متعدی معروف کو سمجھایا گیا ہے متعدی مجہول بھی سمجھایا جائے اس کے بعد ابھی فعل کی بعض مشکل قسمیں باقی رہتی ہیں مثلاً (۱) افعال ناقص مع تعلیلات (۲) مختلف ابواب افعال۔ پہلے صرف وہی افعال ناقص بتلائے جائیں جن میں بہت کم تعلیلات آتی ہوں۔ اور انھیں بھی اوپر بتلائے ہوئے طریقے پر تمثیلی جملوں کے ذریعے سمجھایا جائے اور پرانے طریقے کی طویل گردانوں کو رٹانے سے احتراز کیا جائے۔

(۳) افعال ثلاثی کی صوت کے vocalization لحاظ سے پانچ مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں اور یہ عمل صرف چند خاص الفاظ کی حد تک محدود ہے۔ چونکہ اس قسم کی تبدیلیاں ہندوستانی یا غیر سامی زبانوں میں مروج نہیں ہیں اس لئے مدرس طلبا کو عربی زبان کی اس نادر خصوصیت سے بخوبی واقف کرائے۔

ب ابواب افعال

افعال ثلاثی کے تقریباً ۱۵ ابواب بتلائے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں سے صرف ۱۱ یا ۱۲ ابواب اہم ہیں۔ پھر ہر ایک باب کی جدا خاصیتیں Properties ہوتی ہیں اساتذہ عموماً ان خاصیتوں کو رٹاتے ہیں۔ اس طرح طالب علموں کو بہت کم اس بات سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے کہ باب کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور خاصیت کا کیا مفہوم ہے۔ اور مدرسین جب طلبا سے زبانی یاد کرنے کے متعلق اطمینان کر لیتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ طلبا نے انھیں اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ چونکہ یہ طریقہ مفید نہیں ہے اس لئے مثالوں کے ذریعے ابواب اور خاصیتوں کو واضح کیا جائے۔ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے مدرس فارسی اور انگریزی سے جملے منتخب کر کے ان زبانوں کی فعل کی گردانوں کے باہمی فرق کو واضح کرے اس کے بعد عربی افعال کے ابواب اور خاصیتوں کو مثالوں کے ذریعے طلبا کے ذہن نشین کرایا جائے۔ اس موقع پر دیسی زبان کے ایسے جملے منتخب کر کے جن میں فعل کے ابواب کی مختلف صورتیں آئی ہوں عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے دئیے جائیں۔ اس کے بعد انھیں وہ قاعدے بتلائے جائیں جن کے وجہ سے فعل کی صورتیں بدلتی جاتی ہیں۔

افعال رباعی quadriliteral کے تین باب ہیں ان کو بھی بتلائے ہوئے طریقے پر ختم کیا جائے۔ فعل ناقص irregular verb کا بیان عربی صرف میں بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم صرفیوں نے اس کو سلیس بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس لئے افعال ناقص کے قاعدوں کو مدرسین حتی الامکان آسان بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے اس طرح بہت سے غیر ضروری تعلیلات کے قاعدوں سے نجات مل جائے گی۔

س۔ اسمائے افعال Nouns derived from verbs عربی میں دو قسم کے اسم ہوتے ہیں۔ (۱) اسم Noun Substantive (۲) اسمائے افعال یعنی وہ اسم جو فعل سے بنائے جاتے ہیں۔ اسم کا بیان پہلے پڑھایا جائے۔ لیکن اسمائے افعال طلبا کو فعل کا بیان ختم ہونے کے بعد بتلائے جائیں۔

د۔ حروف ربط Prepositions عربی میں حروف ربط اہم خصوصیت رکھتے ہیں۔ جس طرح فعل کی مختلف صورتوں میں بعض وقت ذراسی تبدیلی کی وجہ سے معنوں میں خاص فرق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح حروف ربط بھی فعل کے ساتھ مل کر اس کے معنوں میں خاص فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا استعمال زیادہ تر محاورات پر منحصر ہے فرہنگ سے اس قسم کے استعمال کے متعلق کافی مواد مل سکتا ہے۔

ج۔ نحو صرف کی تعلیم اچھی طرح ختم ہونے کے بعد نحو کی تعلیم شروع ہونی چاہیئے۔ نحوی قاعدوں کو بھی صرف کے قاعدوں کی طرح بتلاتے ہوئے طریقہ پر مثالوں کے ذریعہ طلبا کے ذہن نشین کرائے جائیں۔

نصاب درسیہ Course of Study اگرچہ مدرس کو مقررہ نصاب کی پابندی لازمی ہوتی ہے لیکن مدرس کو اختیار ہے کہ وہ اپنے طلبا کی استعداد کا ٹھیک اندازہ کرتے ہوئے اپنے طریقے پر نصاب کو ختم کرتا جائے۔ ہمارے مدارس کے لئے شام و مصر کے مدارس کی درسیہ کتابوں کو نصاب میں داخل کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس وجہ سے کہ وہاں کی بعض درسیہ کتب ایسی ہیں جو ہمارے مدارس کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گی۔

ابتدائی جماعتوں میں ایسی کتابیں رکھی جائیں جن میں پوری عبارت معرب ہو اور اعراب واضح طور پر پڑھے جاسکتے ہوں۔ جب طلبا کچھ عربی میں ترقی کرلیں تو اس کے بعد ایسی کتابیں نصاب میں رکھی جائیں جن میں آسان عبارت پر اعراب کا التزام نہ ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طلبا نحوی تعلیم حاصل کئے بغیر عربی عبارت صحیح پڑھنے کے عادی ہوتے جائیں گے۔ اور اعلیٰ جماعتوں میں پہنچنے کے بعد جب وہ صرف و نحو کے قاعدوں سے واقف ہوجائیں گے تو اعراب کی نسبت بہت آسانی پیش آئے گی۔ جماعت ہائے فوقانیہ میں ایسی کتابیں استعمال کی جائیں جن میں صرف وہی الفاظ معرب ہوں جن کے معرب نہ ہونے کی وجہ سے ان کے معنی کی نسبت اشتباہ کا اندیشہ ہوتا ہو اور باقی سب عبارت بلا اعراب ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوقانیہ کی امتحانی جماعتوں میں اعراب نہ دی ہوئی عبارت کو صحیح اصول پر پڑھنا بھی نصاب میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

ترجمے اور مضمون نویسی کی مشق بھی ضروری ہے۔ ترجمے کے لئے اُردو سے عربی یا عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی مشق کرائی جائے۔

لغت اور اس کا استعمال چونکہ عربی لغات ماخذ کے اصول پر مرتب کی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے طلبا کے لئے لغت کا استعمال آسان کام نہیں ہوتا جب تک طالب علم عربی صرف سے اچھی طرح واقف نہ ہو لغت کا استعمال نہیں کرسکتا۔ اس لئے طالب علم کو لغت استعمال کرنے کی اس وقت اجازت دی جائے جب کہ اس نے صرف کا بیان بخوبی ختم کرلیا ہو۔

عربی میں دو قسم کی لغات پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ جو فرہنگ کہلاتی ہے۔ دوسری وہ جو جدید طریقہ پر حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں۔ بہ نسبت اولذکر کے موخر الذکر طلبا کے لئے مفید ہوتی ہیں جب طلبا میں لغت استعمال کرنے کی کافی صلاحیت پیدا ہوجائے تو وہ فرہنگ بھی استعمال کرسکتے ہیں مخفی نہ رہے کہ جامعہ میں داخل ہونے سے پہلے طلبا فرہنگ استعمال کرنے کے قابل ہوجائیں۔

ہمارے مدارس میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبا مشکل الفاظ کے معنیٰ استاد سے پوچھ کر درسیہ کتابوں میں سطروں کے درمیان لکھ لیا کرتے ہیں۔ یہ نہایت مذموم طریقہ ہے۔ اس لئے مدرس طلبا کو ہدایت کرے کہ وہ مشکل الفاظ کی حسب ضرورت ایک فہرست تیار کریں۔ اور اس کے بعد وہ ان سے الفاظ کے ماخذ دریافت کرے۔ جب طالب علم کو ہر ایک لفظ کا ماخذ معلوم ہوجائے تو وہ لغت کے ذریعے معنیٰ معلوم کرکے ہر ایک لفظ کے محاذی لکھتا جائے۔ پھر مدرس اس فہرست پر سرسری نظر ڈال کر غلطیوں کو درست کرلیا کرے۔ اگرچہ یہ ذرا دقت طلب کام ہے مگر ایک فرض شناس مدرس اگر ذرا سی محنت برداشت کرلے تو طلبا میں اس مشق کی نسبت کافی دلچسپی پیدا ہوجائے گی۔ اور یہ دلچسپی طالب علم کے لئے آئندہ بہت مفید ثابت ہوگی اور وہ صرف میں اچھی مہارت پیدا کرلے گا۔

ہندوستانی طلبا اکثر عربی الفاظ کو غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور فارسی میں بہت سے عربی الفاظ داخل ہوگئے ہیں۔ مگر ان زبانوں میں یہ الفاظ اصلی معنیٰ نہیں رکھتے بلکہ اصطلاحی۔ لیکن طلبا ان الفاظ کو عربی عبارت میں اصطلاحی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے عبارت اکثر بے معنیٰ ہوجاتی ہے۔ بعض وقت طلبا اردو یا فارسی محاوروں کا عربی میں لفظی ترجمہ کردیتے ہیں جس کی وجہ سے اصلی مفہوم فوت ہوجاتا ہے۔ اس لئے مدرس طلبا کو اس قسم کی غلطیوں کی نسبت کافی ہدایت دیا کرے تاکہ اُن کی عربی عبارت عربی خصوصیات سے مبرا نہ ہو۔

ہمارے خیال میں حسب ذیل کتب کے مطالعہ سے ہمارے طریقہ کی کافی وضاحت ہوسکتی ہے

اور یوں بھی ان کا مطالعہ عربی کے اساتذہ کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

۱۔ درسیہ کتب

(۱) مرقات الجنی از Cheikho مطبوعہ بیروت (۲) مجانی الادب از Cheikho مطبوعہ بیروت

(۳) سلاسل القرا مطبوعہ قاہرہ (۴) القراۃ الراشدہ از محمد عبید مطبوعہ قاہرہ

(۵) The Phonetics of Arabic by Gairdner London عربی صوتیات کے مطالعے کے لئے مفید کتاب ہے۔

ب۔ قواعد و مضمون

(۱) Arabic Grammar by Thacker جمیل الدین صاحب فاروقی حیدرآبادی نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔

(۲) مبادی العربیہ چار حصے از R. Shartuni مطبوعہ کیاتھلک پریس بیروت

(۳) Arabic Grammar by Wright Cambridge

(۴) النحو الوضیہ از مصطفیٰ امین مطبوعہ قاہرہ (۵) تمرینۃ الطلاب صرف نحو از شرطونی مطبوعہ قاہرہ

(۶) درجات الانشار از Nagib Habaqa مطبوعہ کیاتھلک پریس بیروت

(۷) الشہابۃ الثاقب فی صنعت الکاتب از Said ash Shartuni مطبوعہ کیاتھلک پریس بیروت

ج۔ لغات

(۱) الفرائد الدریہ از J. G. Hava مطبوعہ کیاتھلک پریس بیروت

(۲) المنجد Almunjid از L. Maluf کیاتھلک پریس بیروت

(۳) اقرب الموارد از Rashid esh Shartuni مطبوعہ کیاتھلک پریس بیروت

(۴) لسان العرب مطبوعہ قاہرہ (۵) تاج العروس مطبوعہ قاہرہ فقط

مرتبہ غلام جیلانی وسطانیہ شاہ گنج

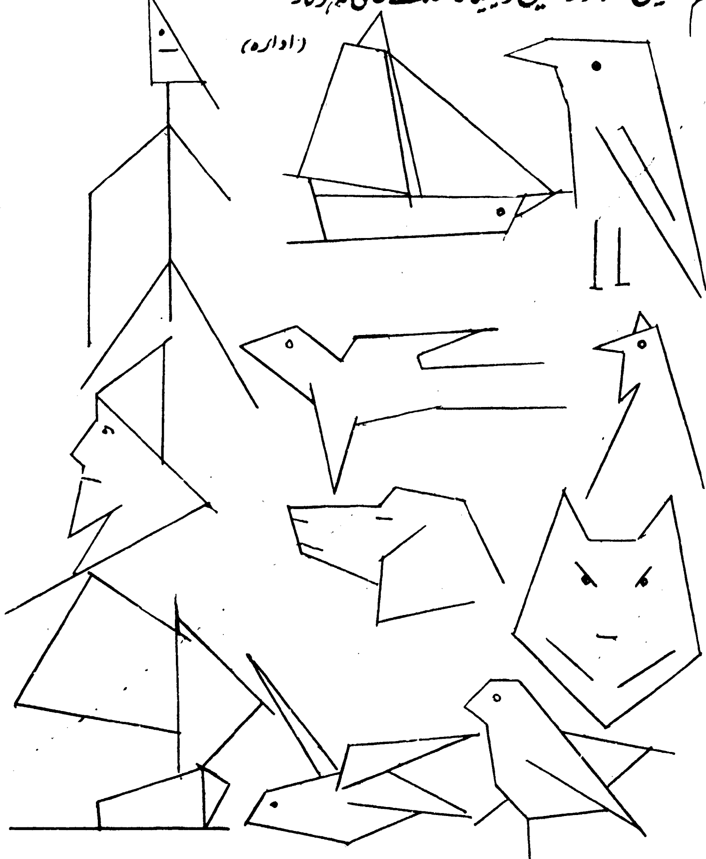
تعلیمی ڈرائنگ

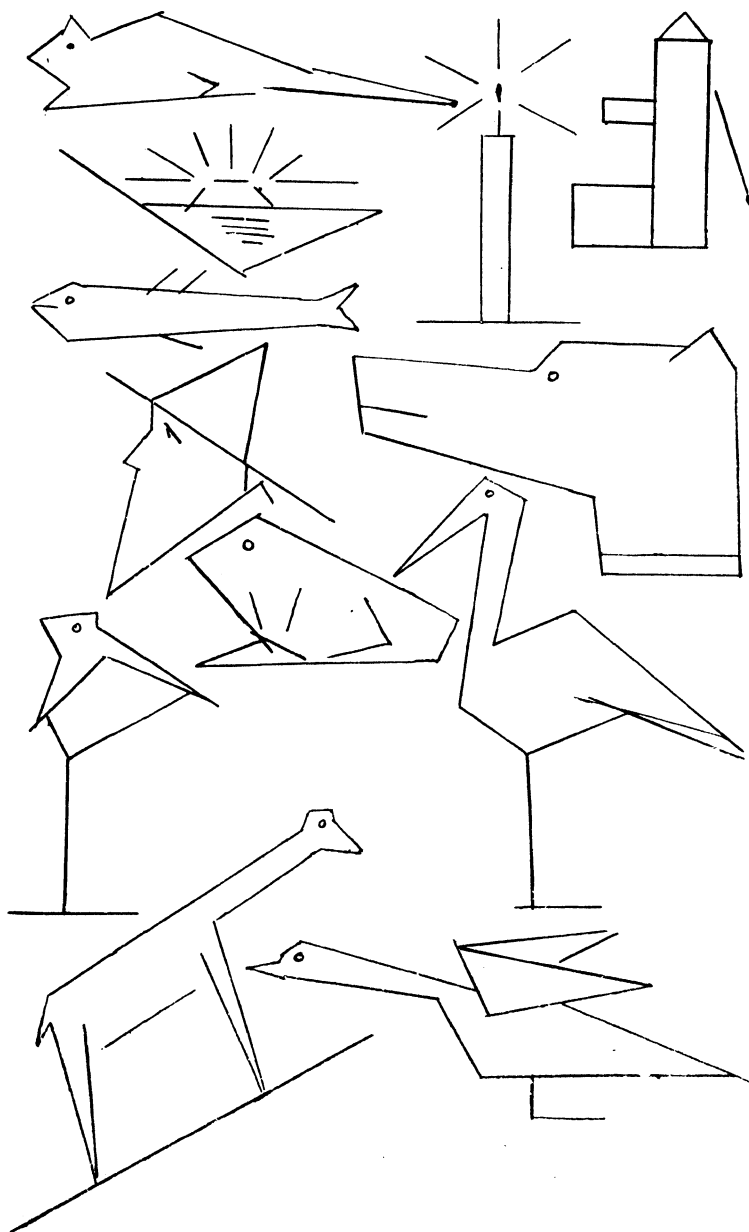
مندرجہ ذیل تصویریں جو چھوٹے لڑکوں کے لئے ہیں چند سیدھے صاف خطوط اور نقطوں سے

بن جاتی ہیں کہیں کوئی پیچ و خم یا دشواری ان کے تیار کرنے میں نہیں ہے تعلیمی ڈرائینگ کا یہی مقصد ہے کہ بلا تضیع وقت محض چند خطوط کے ذریعہ طلبہ کو اشیا کا تصور دلایا جائے قصہ گوئی یا ادب کی تعلیم میں مدرس ان سے کام لے سکتا ہے اس کے علاوہ ڈرائینگ ماسٹر اور مدرس دستی مشاغل طلبہ سے اس قسم کی تصاویر بھی تیار کرا سکتے ہیں یا Stick laying سٹکوں کے ذریعہ سے طلبہ کو نہایت ہی دلچسپ اور مفید کام میں مصروف رکھا جا سکتا ہے۔

مدارس میں عام طور پر آلات تعلیمی کے نہ ہونے کی چیخ و پکار سنی جاتی ہے اساتذہ صاحبان تھوڑی بہت دلچسپی لیں تو بیشتر آلات اور نقشہ وغیرہ بآسانی خود تیار کر سکتے ہیں۔ قارئین نیچر اس کے امکانات پر قلم اٹھائیں اور مشورہ دیں تو یقیناً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(ادارہ)





تعلیمی تفریح

عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و ضلع اطراف بلدہ نے بتاریخ ۵ ۲ بہمن سنہ ۱۳۴۱ف روز سہ شنبہ مدرسہ ہذا کا اچانک معائنہ فرمایا اور اس موقع پر جناب مولوی نظیر حسین شریف صاحب ناظر مدارس بلدہ بھی ہمراہ تھے۔ معائنہ کے دوران میں عالیجناب صدر مہتمم صاحب نے دریافت فرمایا کہ کیا پھر کبھی طلبہ کو تعلیمی تفریح کرائی گئی تھی۔ عرض کیا گیا کہ سنہ ۳۶ف کی تعلیمی تفریح کے بعد پھر تفریح کا کوئی موقع نہیں ملا کیونکہ ہر سال طاعون اور وبائی امراض پھوٹ پڑے تھے۔ اس سال آب و ہوا صاف ہے۔ عالیجناب ممدوح نے ارشاد فرمایا کہ اس سال بچوں کو تعلیمی تفریح کرائی جائے۔ چنانچہ باتباع ارشاد گرامی اساتذہ صاحبان مدرسہ کی کمیٹی بنی اور پروگرام تیار کیا گیا کہ مدرسہ سے نکل کر پہلے فلٹر بیڈ آصف نگر چلیں۔ اس کے بعد قطب شاہی گنبدوں کو جائیں۔ یہ پرانی عظمتوں کی یادگار ہے اور یہیں تاریخی مواد آسانی سے مشاہدہ میں آسکتا ہے۔ ان گنبدوں میں آرام کرنے والی ہستیوں کی کہانیاں سننے کے بعد جو نقوش بچوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہوں گے وہ کبھی نہیں مٹیں گے۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قلعہ گولکنڈہ کی سیر کریں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس کی شہرت نے ارباب ذوق و بصیرت کے دلوں میں دیکھنے کی تمنا پیدا کی اور لوگ دور دور سے اس کے دیکھنے کو چلے آتے ہیں۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد زمانہ حاضرہ کے مشہور تالاب عثمان ساگر اور حمایت ساگر کا معائنہ کریں اور واپسی میں میر عالم کا تالاب دیکھتے ہوئے گھر پہونچ جائیں۔

بیش بہا ہدایات عالیجناب صدر مہتمم صاحب نے اس معاملہ میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور ہر کام میں بڑی امداد فرمائی۔ جناب ہی کی ہدایتوں و رہنمائی میں تعلیمی تفریح کی دشوار گزار منزل آسانی سے طے ہو گئی۔ اس موقع پر وقتاً فوقتاً جو ہدایات فرمائی جاتی رہی ہیں۔ وہ ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ (۵۰) فیصدی یا اس سے زیادہ طلبہ تعلیمی تفریح کیلئے تیار ہوں تو اس روز مدرسہ بند کیا جائے اور اگر اس سے کم ہوں تو ایک وقت مدرسہ رکھکر تعلیم دیجائے اور بعد کے نصف دن میں مدرسہ بند کر کے تعلیمی تفریح کرائی جائے۔

۲۔ تعلیمی تفریح کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دور کے مقامات ہی کو لے جایا جائے۔ باغ عام کی نمائش گاہ اور چمن افضل گنج کی تفریح کرائی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی بہت سے کام کے باتیں ملیں گی۔ نیچر اسٹڈی کے لئے اس سے بہتر مقام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مدرسین اس تفریح میں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں اس کے لئے پہلے ہی سے خود تیار ہو جائیں اور اس مقام کے متعلق جملہ معلومات سے واقف ہو کر جائیں۔

۴۔ طلبہ کو تیار رہنا چاہئے یعنے یہ کہ ان کے ساتھ کاغذ اور قلم رہے۔

۵۔ طلبہ سے کام لیا جائے۔ مدرس صرف ان کی رہبری کرتا رہے۔ اس سے ان میں خود تحقیق کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے گا۔ اور جو بات وہ اپنے طور پر حاصل کریں گے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ان ہدایات کی روشنی میں بچوں کی تفریح کرائی گئی۔

۳۰ رفروردی ۱۳۴۱ف روز پنجشنبہ کو مدرسہ صبح ۸ بجے سے رکھا گیا اور دو گھنٹے تک تعلیم دی گئی۔ روانگی اس کے بعد موٹروں میں پہلے خورد ونوش کا سامان قرینہ سے رکھا گیا۔ اور پھر چلنے والے طلبہ کو بٹھایا گیا باقی طلبہ کو مکان جانے کی اجازت دی گئی۔ مدرسہ سے ساڑھے دس بجے روانہ ہوئے جس وقت ہم مدرسہ سے روانہ ہو رہے تھے اولیا طلبہ بھی موجود تھے ان کو اس انتظام اور بچوں کی حفاظت کا کامل اطمینان ہو گیا۔

فلٹر بیڈ پونے گیارہ بجے فلٹر ہاوس آصف نگر پہونچے۔ جناب مولوی سید عبد العزیز صاحب انچارج آفسر ہمارے انتظار میں تھے۔ یہاں بچوں کے تین فریق کئے گئے۔ اس ترتیب کے ساتھ ہر چیز کا معائنہ کرایا گیا۔ پہلے وہاں گئے جہاں عثمان ساگر کا پانی نہر کے ذریعہ داخل ہو رہا ہے اور اس نہر پر ایک پائپ لے جایا گیا ہے جس میں متعدد سوراخ ہیں۔ ان میں سے پھٹکری جو برقی قوت سے پہنچائی جا رہی ہے بہتے پانی پر گرتی ہے۔ اس سے معمولی طور پر پانی صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس سے ملحق خوبصورت سنگ بستہ عمارت میں پہونچے۔ اس میں ایک چھوٹا سا حوض ہے جو سطح زمین سے تقریباً ایک گز اونچا ہے۔ اور آئینہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس میں اندر کی حالت صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پھٹکری حل ہونے کے بعد جمع کر کے مشین کے ذریعہ باہر بھیجی جاتی ہے اور اسی کمرہ میں ایک میٹر بھی لگا ہوا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قدر پانی باہر بھیجا گیا۔ اس کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے حصے میں داخل ہوئے وہاں متعدد حوض ہیں جن میں سے صرف دو حوض میں پھٹکری بھری پڑی تھی۔ اور باقی حوض خالی تھے۔ اور وہاں سے جب باہر آئے تو تین بہت بڑے حوض پانی سے بھرے پڑے ملے۔ یہ وہی پانی ہے جو پھٹکری کی آمیزش کے بعد یہاں جمع کیا گیا ہے اس عمارت سے ذرا ہٹ کر ایک اور سنگ بستہ خوبصورت عمارت ہے۔ اس میں بارہ حوض مستطیل شکل کے بنے ہوئے ہیں جو سطح زمین سے تقریباً سات فٹ بلند ہیں۔ جا بجا سیڑھیاں لگا دی گئی ہیں ان کے ذریعہ نیچے آیا جا سکتا ہے۔ ان تمام حوضوں میں ریت بچھی ہوئی ہے اور ان میں ایک ایک فٹ

سے زیادہ پانی بھی ہے۔ ان میں سے ہر روز چھ حوض دھوے جاتے ہیں۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جناب مولوی سید عبدالعزیز صاحب نے ایک حوض ہمارے سامنے دھلوا کر بتانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ اسی کمرہ میں ہوا کا ایک میٹر بھی لگا ہوا ہے۔ حوض دھونے سے پہلے مشین چالو کر کے اس میں ہوا بھری جاتی ہے۔ اور مقررہ مقدار تک پہونچنے پر مشین بند کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہ عمل ہمارے سامنے کر کے دکھایا گیا۔

جن پائپ کے ذریعہ باہر کے حوضوں کا پانی اندر کے حوضوں میں داخل ہوتا ہے ان ہی پائپوں کے میٹر کے ذریعہ ہوا داخل کیجاتی ہے اور یہ پائپ حوض کے سطح پر ہوتا ہے اور اس سطح پر ریت بھی بچھی رہتی ہے اور ان حوضوں میں دو پائپ پانی خارج کرنے کے لئے لگا دیئے گئے ہیں۔ ایک سے غلیظ دوسرے سے صاف کیا ہوا پانی خارج ہوتا ہے۔ غرض پانی کی آمد کو بند کر کے ہوا کو چھوڑا گیا۔ اس سے ایک دم ریت کھولنے لگی۔ ریت اور پانی کی حرکت سے ایک قسم کی آواز پیدا ہوگئی۔ یہ عمل تقریباً دس بارہ منٹ تک ہوتا رہا۔ اس طریقہ عمل سے پانی غلیظ ہوگیا۔ اس کے بعد ہوا بند کر دی گئی۔ اس غلیظ پانی کو خارج کرنے کے لئے باہر کے حوض کا پانی جو پائپ کے ذریعہ اندر داخل ہوتا ہے اور جو تھوڑی دیر کے لئے روکدیا گیا تھا پھر جاری کر دیا گیا۔ اس سے سطح پر نیا پانی آکر جمع ہونے لگا تو یہ غلیظ پانی جو اوپر تھا خود باہر خارج ہوگیا۔ یہ دو فٹ غلیظ پانی تقریباً آدھ گھنٹہ تک خارج ہوجاتا ہے۔ اور اس کی جگہ دوسرا نیا پانی آجاتا ہے۔ اس طریقہ سے سطح پر کی ریت خود بخود صاف ہوجاتی ہے۔ ان تمام کاموں کو دیکھ کر طلبہ اور اساتذہ ششدر رہ گئے جب نیچے آئے تو اسی ہال میں ایک بٹیر دیکھا اور اس کے پاس کئی کلورین سے بھرے ہوئے آہنی بند بوتل رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک بوتل تار کے ذریعہ میٹر سے ملحق ہے۔ اور یہ میٹر سے کلورین مشین کے ذریعہ صاف شدہ پانی میں بہت ہی کم مقدار میں ملائی جاتی ہے۔ یہ عمل ۲۴ گھنٹے برابر ہوتا رہتا ہے۔ اس دوا کی تاثیر سے بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے جو خوردبین کے بغیر نہیں دکھائی دے جاتے ہلاک ہوجاتے ہیں اور اس کی بو بہت ہی ناخوش گوار ہوتی ہے اس کے سونگھنے سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ دوا بہت ہی کم مقدار میں ملائی جاتی ہے جس سے پانی کا ذائقہ بدلنے نہیں پاتا۔ اور صحت کیلئے مضر بھی نہیں ہوتا

یہ دوا ملا ہوا پانی عمارت کے باہر ایک بہت بڑے زیر زمین حوض میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس میں ہوا داخل ہونے کے لئے اس کی چھت پر جو سطح اس سے دو فٹ اونچی ہے متعدد چمنیاں لگی ہوئی ہیں اس سے ذرا ہٹ کر ایک اور رکھلا ہوا چھوٹا حوض ہے۔ اس میں پانی کا بہت بڑا پائپ آہنی زیر زمین حوض سے لایا گیا ہے اور اس پائپ سے اتنا ہی بڑا دوسرا آہنی پائپ جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ پانی شہر کو بھیجا جاتا ہے۔

جناب مولوی سید عبدالعزیز صاحب نے فرمایا کہ روزانہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ گیالن پانی سپلائی

کیا جاتا ہے۔ اور یہاں ایک عملہ بھی ہے جو ۲۴ گھنٹے باری باری سے کام کرتا ہے۔ اور دو نگرانکار ہیں ایک دن میں اور دوسرے رات میں حاضر رہتے ہیں۔ اس کے سالانہ مصارف (۶۰) ہزار ہوتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں پانی آتا۔ جمع ہوتا۔ صاف کیا جاتا اور پھر باہر بھیجا جاتا ہے۔ مگر کہیں بھی پانی اور کیچڑ دیکھی نہیں گئی۔ ہر جگہ خشک اور پاک صاف اس قدر کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اور عمارت کے باہر حسن قرینہ اور باقاعدگی کے ساتھ چمن بندی کی گئی ہے۔ اس سے کارکنان فلٹر بیڈ کے حسن ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی سید عبدالعزیز صاحب کے حسن اخلاق کا مدرسہ معترف ہے۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے ہر ایک بات تفصیل کے ساتھ بتلائی اس کا مدرسہ ہذا پر بہت ہی اثر ہوا۔ اور مدرسہ جناب ممدوح کا خلوص دل کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہے۔

قطب شاہی گنبدیں ہمارا خیال تھا کہ ہم فلٹر بیڈ آصف نگر سے آدھ گھنٹہ میں فارغ ہو کر نکلیں گے۔ حوض صاف کرا کے دکھانے کی وجہ سے ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت صرف ہو گیا یہاں سے ۱۱ بجکر ۵ منٹ پر نکلے اور ۱۰ منٹ میں گنبد ہائے قطب شاہی پہنچ گئے۔ قلعہ کی پلٹن کے ایک حوالدار رستم علی صاحب اور ایک سپاہی ہمارے لئے پہلے ہی سے آگئے تھے۔ یہاں بھی طلبہ کے تین فریق کر کے گنبدوں کا معائنہ شروع کیا گیا۔

ان گنبدوں کے معائنہ سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا بالکل ایسی حالت میں ہیں جو آج سے چھ سال پہلے تھی۔ لیکن اس عرصہ میں بہت سے نئے طلبہ اور اساتذہ مدرسہ میں آگئے اس لئے ان کا معائنہ کر لینا ان کے لئے اچھا ہوا۔

گو گنبدیں اسی ترتیب کے ساتھ نہیں بنی ہوئی ہیں جس ترتیب کے ساتھ بادشاہوں نے جلوس کیا۔ مگر بچوں کے ذہن نشین ہونے کے لئے بادشاہوں کی ترتیب کے لحاظ سے گنبدوں کا معائنہ کرایا گیا۔

۱۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ:۔ جب سلطان محمد قلی قطب شاہ کی گنبد پر پہونچے جو قطب شاہی سلطنت کا بانی تھا تو بچوں کو اس کی ابتدائی حالات سے واقف کرایا گیا۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس نے کس طرح سلطنت بہمنی سے تعلق منقطع کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اس کی گنبد بالکل معمولی ہے۔ اسمیں کوئی خاص تعمیری حسن کاری کو دخل نہیں ہے۔ البتہ تعویذ سنگ موسیٰ کی بنی ہوئی ہے جس پر قرآن مجید کے آیات کندہ ہیں۔ اور یہ بات یہاں خاص طور پر معلوم کرائی گئی کہ ہمارے بادشاہ ذیجاہ نواب میر عثمان علیخاں بہادر نے ان باقیات الصالحات کی داغ دوزی اور ترمیم کر کے ان پر کتبے لگا دئیے ہیں۔ اس گنبد کے دروازہ پر جو کتبہ نصب ہے اس میں سنہ ولادت ۸۹۰ھ جلوس ۹۰۶ھ اور انتقال ۹۵۰ھ درج ہے۔

۲۔ سلطان جمشید قلی قطب شاہ :۔ اس قطب شاہی خاندان کا یہ دوسرا بادشاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ اپنے والد سلطان محمد قلی قطب شاہ کی درازی عمر سے تنگ آگیا تھا اور حکومت کی آرزو میں اس نے اپنے والد کو قتل کرا دیا لیکن افسوس ہے کہ وہ خود بھی زیادہ دنوں سلطنت کرنے نہ پایا۔ ۹۵۰ھ کو تخت پر بیٹھا اور ۹۵۷ھ کو وفات پائی صرف سات سال اس نے حکومت کی اور سنہ جلوس اور وفات کی تاریخ کا کتبہ گنبد کے دروازے پر نصب کیا گیا ہے۔ اس کی گنبد تعمیری حسن کاری کا اچھا نمونہ ہے اور ماہرین آثار قدیمہ کو اس سے بہت کچھ مواد مل سکتا ہے۔

۳۔ سبحان قلی قطب شاہ :۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی قطب شاہ بادشاہ ہوا۔ کیونکہ وہ کمسنی میں بادشاہ ہوا تھا اس لئے حکومت سیف خاں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن امرا سیف خاں کی حکومت سے ناراض تھے نتیجہ یہ ہوا کہ سبحان قلی قطب شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا۔ یہ بھی ایک عجیب بدنصیب بادشاہ تھا کہ مورخین اس کو بادشاہوں کے سلسلہ میں شمار نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہوگی کہ اس کے مزار پر کتبہ بھی نصب نہیں کیا گیا۔

۴۔ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ :۔ کمسن بادشاہ کو تخت سے اتار کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دوسرے بیٹے ابراہیم قلی کو جو جمشید قلی قطب شاہ کا بھائی تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کو اپنے باپ کے ورثہ سے فیاضی اور نصفت پسندی ملی تھی۔ اس کے عہد کے کئی واقعات قابل ذکر ہیں۔

اتلی کوٹ کی لڑائی :۔ سلطنت بہمنی کے ٹکڑے ہونے سے پہلے ویجانگر کے راجہ بہمنی بادشاہوں سے لڑتے رہے۔ مگر ان کو کبھی فتح نصیب نہ ہوئی۔ جب بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پانچ علحدہ خودمختار سلطنتیں قایم ہوگئیں تو ویجانگر کے راجاؤں نے ان کی پھوٹ اور نااتفاقی کو غنیمت سمجھا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر علحدہ علحدہ ان پانچوں ریاستوں پر تاخت و تاراج شروع کر دی ان راجاؤں کی دست درازیوں سے تنگ آکر حسین نظام شاہ احمد نگر۔ علی عادل شاہ بیجاپور۔ علی برید شاہ بیدر اور ابراہیم قلی قطب شاہ گولکنڈہ آپس میں متحد ہو کر ویجانگر کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ ادھر بیجانگر کے راجہ نے بھی اپنی جرار فوج کے ساتھ دریائے کرشنا کے ایک جانب پڑاؤ ڈالا۔ اور اس طرح مورچہ بندی کر لی کہ دشمن کو سوائے دریا عبور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود متحدین نے ایک پوشیدہ راستہ معلوم کر لیا اور صبح ہوتے ہوتے تالی کوٹ کے مقام پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ غافل راجہ کے سنبھلنے تک ہزاروں سپاہی کٹ کر ڈھیر ہوگئے۔ مگر ویجانگر کے جانبازوں نے بھی سنبھل کر ہمت اور استقلال کے ساتھ حملہ کو روکا اور پھر ایسا زبردست حملہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑنے کو تھے کہ راجہ کے مارے جانے کی خبر پہنچی اور راجہ کی فوج بدحواس ہو کر بھاگی متحدین نے اس کا تعاقب کیا اور دارالسلطنت ویجانگر میں داخل ہو کر جی کھول کر بدلا لیا۔

دارالسلطنت کو اس درجہ تاراج کیا کہ پھر پنپنا نصیب نہ ہوا۔

۲۔ ابراہیم قلی قطب شاہ نے عادل شاہی خاندان سے قرابت بھی پیدا کرلی۔

۳۔ اسی بادشاہ کے عہد میں تالاب حسین ساگر اور بہت سی دوسری عمارتیں تیار ہوئیں۔

۴۔ گنبد کے دروازہ پر جو کتبہ نصب کیا گیا ہے اس میں صرف سنہ جلوس ۹۵۷ھ اور وفات ۹۸۱ھ درج ہے۔

۵۔ محمد قلی قطب شاہ:۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ اس کی گنبد وسعت۔ پاکیزگی و نفاست میں سب گنبدوں سے ممتاز ہے۔ اس کی چاروں طرف ایک وسیع چبوترہ کا جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے اس کی شان بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ چبوترہ دراصل ایک وسیع تہ خانہ کی چھت ہے۔ جس کے طول و عرض میں نہایت قرینہ کے ساتھ محراب بنے ہوئے ہیں۔ ان محرابوں کے اندر بالکل وسط میں اس بادشاہ کا اصل مزار ہے۔ یہ محراب اسی طرز پر بنے ہیں جو سٹی کالج کے بنے ہوئے ہیں۔ اس وسیع تہ خانہ کی چھت پر متعدد روشن دانیاں لگائی گئی ہیں۔ ان روشن دانیوں سے ہوا اور روشنی خوب آتی ہے۔ اس گنبد کے چبوترہ کا جنوبی حصہ احاطہ کی دیوار سے باہر ہوگیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنبد ایک میدان میں بنائی گئی ہے۔

اس بادشاہ نے بھی اپنے بہت سے کارنامے چھوڑے ہیں۔ اس نے کھوئے ہوئے علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں داخل کر لئے اور پرانا پل گلزار حوض مکہ مسجد۔ چار مینار اور چار کمانیں بنائیں۔ اور اس نے اپنی محبوبہ کے نام سے ۱۵۸۹ء میں موسیٰ ندی کے کنارے ایک شہر بھاگ نگر نام رکھا۔ اس کی رحم دلی کا یہ حال تھا کہ اپنے عہد حکومت میں کسی کو قتل کا حکم نہیں دیا۔ اس کی فیاضی بھی بے نظیر تھی جب کبھی اس کے محل کے سامنے کوئی برات گزرتی تو اپنی طرف سے دلہا دلہن کو جوڑے اور گھوڑے سے سرفراز کرتا۔ اس کی نیک نیتی کا یہ ثبوت ہے کہ اس کا خزانہ ہمیشہ بھرا رہا۔ اس کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر سنہ جلوس ۹۸۷ھ اور سنہ وفات ۱۰۲۰ھ درج ہے۔ اسی پرفضا مقام پر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔

سلطان محمد قطب شاہ:۔ اس کی گنبد دوسری گنبدوں سے بڑی ہے۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت کو زوال آیا اور اس نے شہنشاہ ہندوستان کو خراج دینا قبول کر لیا۔ اس کا سنہ جلوس ۱۰۲۰ھ اور وفات ۱۰۳۵ھ درج ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ:۔ گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور ۴۸ سال حکومت کی اور انسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اسی کے عہد حکومت میں لنگر کی رسم پڑی۔ کہتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ حکومت میں وہ ہاتھی پر سوار ہو کر شکار کو جا رہا تھا راستہ میں ہاتھی مست ہو کر فوج سے علٰحدہ ہوگیا۔ اور بادشاہ

کو جنگل میں لے بھاگا۔ بادشاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم کو اطلاع ہوئی تو تمام ملازمین کو حکم دیدیا کہ بادشاہ و ہاتھی کی تلاش کریں۔ اور جابجا جنگل میں درختوں پر روٹی پانی کے برتن چھینکوں میں رکھوا دیئے۔ تاکہ بادشاہ کو بھوک اور پیاس کے وقت غذا اور پانی میسر آئے۔ اس انتظام کے علاوہ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی جناب میں یہ نذر بھی مانی کہ اگر میرا بچہ بخیر و عافیت واپس آجائے تو محرم کے مہینے میں ہر سال حسینی علم کو لنگر بھجواؤں گی اور جب بادشاہ صحیح سلامت ہاتھی کے ساتھ واپس آیا تو شہر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور اپنے اقرار کے مطابق لنگر بھجوائی۔ چنانچہ آج تک سرکار کی جانب سے لنگر بھجوائی جاتی ہے۔ اور ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ اس بادشاہ نے اپنی ایک بیٹی کا اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ نکاح کر دیا۔

صرف یہ ایک ہی گنبد ہے کہ جس کے کتبہ پر تاریخ جلوس ۱۰۳۵ھ اور انتقال ۱۰۸۳ھ کے علاوہ تاریخ پیدائش ۱۰۲۴ھ بھی کندہ ہے۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ:۔ کہتے ہیں کہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی کی سید سلطان کے ساتھ شادی قرار پائی اور رسومات شروع بھی ہوگئیں۔ بادشاہ کے بڑے داماد سید احمد نے عرض کیا کہ شہزادی کا عقد سید سلطان کے ساتھ اگر ہوگا تو میں اورنگ زیب کے پاس چلا جاؤں گا۔ بادشاہ اور امرا نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ برابر اپنی ہٹ پر قایم رہا۔ بادشاہ نے سید احمد کی خاطر شادی ملتوی کر دی۔ حیات بخشی بیگم نے اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ سے کہا کہ ابوالحسن میرا قریبی رشتہ دار ہے اس کو اپنی دامادی میں لے لینا مناسب ہے۔ بادشاہ نے اپنی ماں کی رائے سے اتفاق کر لیا اور ابوالحسن کے ساتھ اپنی بیٹی کا عقد کر دیا۔ ابوالحسن قطب شاہی خاندان کا آخری تاجدار ہے۔ اس کی نزاکت اور نفاست کے پچاسوں قصے مشہور ہیں اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے گنبد تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کے تیار ہونے سے قبل شہنشاہ عالمگیر نے گولکنڈہ فتح ہونے کے بعد اس کو گرفتار کر کے دولت آباد بھیجدیا۔ اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ اس نے ۱۴ سال طفلی میں ۱۴ سال تحصیل علوم میں، ۱۴ سال سید راجو حسینی قتال کی خدمت میں بسر کئے اور ۱۴ سال جہانبانی کی اور ۱۴ سال قید و بند میں رہ کر ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۱۲ھ روز پنجشنبہ کو انتقال کیا اور خلدآباد میں مدفون ہوا۔

دیگر گنبدیں۔ اس احاطہ میں بادشاہوں کی گنبدوں کے علاوہ اور بھی گنبدیں ہیں۔ ان کے مختصر حالات بھی عرض کئے جاتے ہیں۔

سلطان محمد امین:۔ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی گنبد کے متصل ان کے صاحبزادے سلطان محمد امین کی گنبد ہے۔ بلندی اور گھیر میں کچھ زیادہ بڑی نہیں ہے۔ اس کے اندر قبریں ہیں سلطان

محمد امین کی قبر پر سورہ اخلاص بخط کوفی کندہ ہے اور وہ طغرا نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔ کتبہ پر سلطان محمد امین کی تاریخ وفات ۵ ارشعبان ۱۰۶۷ھ درج ہے۔

فاطمہ خانم:- سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی گنبد کے روبرو اس کی بیٹی فاطمہ خانم کا مزار ہے اس کے تعویذ پر آیات عربی خط میں کندہ ہیں۔ اس کے مزار پر گنبد بنانے کے بجائے چار دیواری کا حصار کھینچ دیا گیا ہے۔

حیات بخشی بیگم:- یہ بیگم سلطان محمد قطب شاہ کی بی بی اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی ماں تھی۔ اس کے مزار پر جو گنبد بنائی گئی ہے وہ دوسری گنبدوں سے بہتر ہے۔ اس کی مشرقی جانب سے بلدہ حیدرآباد کی بڑی بڑی عمارتیں مکہ مسجد اور چار مینار دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر سیاح اس گنبد کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اسی بیگم کی بنائی ہوئی مسجد گنبد کی مغربی جانب واقع ہے۔

مرزا نظام الدین احمد:- گنبدوں کے احاطہ کے متصل ایک ناتمام گنبد ہے۔ اس میں جو کتبہ نصب کیا گیا ہے اس پر گنبد ناتمام مرزا نظام الدین احمد۔ تاریخ وفات ۲۶ صفر ۱۰۰۸ھ روز شنبہ کندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانا شاہ ابو الحسن کا ہم زلف تھا۔

قلعہ گولکنڈہ پروگرام کے لحاظ سے قلعہ گولکنڈہ پہونچے۔ گنبدوں سے ۲ بجکر ۴۲ منٹ پر روانہ ہوئے اور بنجارہ دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ دروازہ پر گولکنڈہ لانسرز کا پہرہ ہے۔ ۱۳۳۶ف میں قلعہ کی جو تفریح کی گئی تھی اس وقت "سنگم" کا معائنہ کر کے مکائی دروازہ سے داخل ہوئے تھے۔ قلعہ میں سب سے پہلے کٹورہ حوض ملا جو ایک مربع شکل میں بنایا گیا ہے۔ اور جس کا ایک ضلع تقریباً ۳۰۰ گز ہوگا۔ اب تو خشک ہے مگر اس زمانہ میں پانی سے بھرا ہوا ہوگا۔ اس کے بالکل وسط میں ایک ہشت کرہ ہے غالباً وہ فوارہ ہوگا۔ یہاں سے بالا حصار پہنچے۔ یہاں بھی قلعہ کی پلٹن کے حولدار گنیش سنگھ اور ایک سپاہی ہمارے منتظر تھے۔ مولوی محمد صدیق صاحب مددگار مدرسہ ہذا یہاں کے متوطن ہیں۔ ان کی موجودگی سے بڑا فائدہ پہنچا۔ مولوی صاحب یہاں کی چپہ چپہ زمین سے خوب واقف ہیں۔ مولوی صاحب نے یہاں کی ہر چیز نہایت وضاحت سے بتائی قریب میں مولوی صاحب ان تمام روایات کو گولکنڈہ کے عنوان سے رسالہ حیدرآباد ٹیچر میں ایک مضمون ہدیہ ناظرین کرنے والے ہیں۔ ۱۳۳۶ف میں جو چیزیں دیکھی گئی ہیں وہ امتداد زمانہ کی وجہ سے نیست و نابود ہوگئی ہیں اور جو کچھ بچ گئی ہیں وہ نہایت خراب خستہ حالت میں پائی گئیں ۔ اور ہر جگہ وحشت برس رہی ہے۔ طلبہ شاہی نشست گاہ پر پہنچنے تک زیادہ محظوظ نہیں ہوئے تھے۔

بالا حصار کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی داہنے جانب ایک سہ منزلہ عمارت ملی۔ جو ہر طرف سے بند ہے۔ اس میں قدیم اسلحہ اور قدیم فتیل والی بندوقیں اور کچھ چرمی سامان اور دیگر اشیا رخور ونوش رکھی

ہوئی ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے اور سیڑھیاں اس ترکیب سے بنائی گئی ہیں کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نشست گاہیں بنائی گئی ہیں تاکہ تھکے ماندے لوگ ان پر بیٹھ کر سستا سکیں۔ تقریباً نصف چڑھائی پر ایک مکان بنایا گیا ہے اس کی دہلیز کی بائیں میں سنگ موسیٰ کا ایک کتبہ ہے۔ اس پر صرف ۱۰۵۲ھ صاف پڑھا جاتا ہے۔ باقی حروف مٹ گئے ہیں۔ اس مکان کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہ مکان دراصل انبار خانہ تھا جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جرات خاں کے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔

اسی انبار خانہ کی چھت پر ایک مسجد بنائی گئی ہے جو قطب شاہی دور کی مساجد کا ایک مختصر اور اچھا نمونہ ہے۔ ابتدائی زمانہ میں مساجد سادہ اور پست مینار والی ہوتی تھیں لیکن دور آخر کی مساجد کے مینار نسبتاً بلند اور مسجد نقش و نگار سے آراستہ ہوتی ہے۔ اس دور کی تمام مساجد کے اندر محراب پر قطب شاہی دور کا امتیازی نشان "پنجہ" کندہ ہے۔

اسی مسجد سے کسی قدر فاصلہ پر ایک چٹان پر مہاکالی کی دیول ہے۔ یہاں ہر سال اساڑہ کے مہینے میں سات جاترا ہوتی ہیں۔ اس دیول کا مسجد کے عقب میں اور محلات شاہی کے اس قدر قریب اور نمایاں جگہ پانا اسلامی رواداری کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس کے قریب ایک تہ خانہ ہے جس پر ایک بہت بڑا ہال بنایا گیا ہے۔ اس حال کی چھت پر ایک منبر نما چبوترہ ہے اس کو شاہی تخت گاہ کہتے ہیں۔ بادشاہ ٹھنڈے وقت یہاں بیٹھکر تفریح کرتے تھے۔ طلبہ جب یہاں پہنچے تو بہت خوش ہوئے اور واقعی مقام ہی ایسا ہی پر لطف ہے۔ یہیں سے دور دور کی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

یہاں بچوں کو بتایا گیا کہ دائرہ افق کتنا بڑھ گیا ہے۔ افق کے گھٹنے اور بڑھنے کے ثابت کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے عثمان ساگر۔ حمایت ساگر۔ تالاب میر عالم قصر فلک نما۔ مکہ مسجد۔ چار مینار۔ عثمانیہ عدالت العالیہ۔ عثمانیہ دواخانہ افضل گنج۔ تالاب حسین ساگر اور درگاہ حضرت حسین شاہ ولی ہتھیلی میں نظر آتے ہیں۔ یہ مقامات بتا کر طلبہ سے اسمات دریافت کئے گئے اور انہیں خندقیں بھی بتائی گئیں جو جا بجا ٹوٹ گئیں ہیں۔

واپسی میں اس تہ خانہ کو بھی دیکھا جس میں بعد راجلم کے تحصیلدار "رام داس" کو مقید کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے تحصیلداری کے زمانہ میں سرکاری رقم سے دیول بنائی تھی۔ اور حکومت کے گھمنڈ میں سرکش ہو گیا تھا۔ اس کو سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ اس کو یہاں قید کیا گیا۔

یہ بھی واقعہ مشہور ہے کہ رامچندر جی مہاراج نے اس کو غیب سے اتنی رقم دلائی کہ اس نے رقم

ادا کر کے قید سے رہائی پائی۔

اب قلعہ میں جا بجا پانی کے نل موجود ہیں۔ گزشتہ کی طرح ہم کو پانی کی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی توقع ہے کہ پانی کے نل آجانے کی وجہ سے قلعہ کی آبادی میں اضافہ ہوجائے گا اور اس کی ویرانی و وحشت دور ہوجائے گی۔

عثمان ساگر تین بجکر ۴۰ منٹ پر قلعہ روانہ ہوئے اور چار بجے عثمان ساگر پہونچ گئے۔ یہ وقت طلبہ کے لئے نہایت موزوں تھا۔ دھوپ کی شدت بھی کم ہوگئی تھی اور تالاب میں ہر جگہ رونق و سہانا پن پیدا ہوگیا تھا۔ طلبہ بھی دن بھر کی سیر و تفریح سے تھک گئے تھے طبیعتوں میں فرحت و امنگ پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی مقام نہیں ہے تالاب کے اندر بند سے لگا ہوا ایک مختصر سا چمن ہے۔ اسمیں جا بجا نشستیں بنائی گئی ہیں۔ اور پانی کے حوض بھی ہیں۔ یہیں ذرا ہٹ کر بچوں کے واسطے جھولے بھی ڈالے گئے ہیں۔ بچوں کو ان سے لطف اٹھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور مدرسین ان کی نگرانی کرتے رہے۔ بچے کھیل کود کر خوب چست چالاک ہوگئے اور ان کے چہروں پر بشاشت آگئی۔ آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ان کے دو فریق کئے گئے اور ان کو اوپر بند پر لے جا کر تالاب کی سیر کرائی گئی طغیانی کے دروازے (تم) دکھائے گئے اور "تم" بنانے کی ضرورت اور اس کے فائدے بچوں کو سمجھائے گئے۔ ان سے بند کی لمبائی کا اندازہ دریافت کیا گیا۔ اور مشرقی حد پر جو محراب بنائے گئے ہیں اور جن سے پانی مقررہ سطح آب سے زیادہ ہونے کی صورت میں خود بخود خارج ہوتا ہے بتائے گئے۔

اور پھر وہاں سے واپس ہوکر بند کے شمالی حصہ پر پہنچے۔ یہاں بند سے لگا ہوا ایک نیم دائرہ حوض بنایا گیا ہے۔ اس حوض میں پانی داخل ہونے کے لئے مختلف سطحوں پر پائپ لگے ہوئے ہیں۔ اور ان پر جالدار ڈھکنے ہیں۔ تالاب میں پانی کی جو بھی سطح ہوگی اس کے لحاظ سے اس سطح کے پائپ کے ذریعہ پانی حوض میں داخل ہوگا اور یہ پانی نہر کے ذریعہ آصف نگر کے فلٹر بیڈ کو لایا گیا ہے۔ راستہ میں نہر بعض جگہ کھلی رکھی گئی ہے اس جگہ بند پر کتبہ نصب کیا گیا ہے جس میں تالاب کی تیاری کی تاریخ "ہو مبارک ملک کو عثماں ساگر" کندہ ہے۔ ان حروف میں طلاء بھر دیا گیا ہے۔

بند کی انتہائی شمالی حد پر ایک دو منزلہ عمارت تیار کی گئی ہے۔ اس میں اکثر بڑے بڑے عہدہ دار ٹھیرا کرتے ہیں۔ اور اس سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ ہے جس سے مسافر بنگلہ کا کام لیا جاتا ہے۔

ان تمام چیزوں کے دیکھنے کے بعد پھر چمن میں آگئے تعلیمی سوالات کے ذریعہ تالاب کے

تیار کرنے کی وجہ اور اس کے فوائد بتائے گئے۔ بچوں نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ یہ تمام باتیں سنیں۔ انہیں بتایا گیا کہ شہر میں موسیٰ ندی کے داخل ہونے سے پہلے قلعہ کے قریب اس میں ایک اور ندی آکر ملتی ہے۔ اس کو "عیسیٰ" یا ساکل ندی کہتے ہیں جو شاہ آباد ضلع اطراف بلدہ سے نکلتی ہے۔ جب کبھی بارش زیادہ ہوتی ہے تو ان ندیوں کو طغیانی ہو جاتی ہے اور شہر میں پانی گھس آتا ہے کئی مرتبہ طغیانی کا پانی شہر میں آگیا۔ مگر ستمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی سب سے بڑی تھی۔ اس وقت تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ اس طغیانی میں بہہ گئے اور ہزاروں مکانات گر پڑے۔ غرض طغیانی کیا تھی ایک قیامت تھی۔ جب کبھی یہ مصیبت یاد آجاتی ہے تو دل لرز جاتے ہیں۔

طغیانی کے بعد اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں غفران مکان کی بارگاہ میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ شہر کو ہر وقت کی مصیبت سے بچانے کے لئے ان دونوں ندیوں پر تالاب بنا دیئے جائیں چنانچہ دیوان بہادر سر ویسویا انجنیر کو طلب کر کے ان دونوں تالاب کے نقشے تیار کرائے گئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت غفران مکان ان تالابوں کی تیاری کا حکم دینے والے تھے کہ چند لوگوں کے عرض معروض کرنے پر اس تجویز کو ملتوی کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے حضرت غفران مکان سے عرض کیا تھا کہ اگر یہ تالاب تیار ہو جائیں تو شہر پر اس سے زیادہ مصیبت نازل ہوگی۔ اب تو خیر چھوٹے چھوٹے تالابوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے اتنا پانی آیا تھا اگر جب یہ دونوں تالاب خدانخواستہ ٹوٹ جائیں تو سالم شہر بہہ جائے گا۔

سلا۱۹ء اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے تو یہ مسئلہ پھر اٹھایا گیا اور حضرت اقدس و اعلیٰ کے ملاحظہ میں پیش ہوا۔ آپ نے ان دونوں تالابوں کی تعمیر کی منظوری دیدی۔ آپ ہی نے اپنے دست مبارک سے ماہ رجب ۱۳۳۵ھ میں عثمان ساگر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور مشہور انجنیر سی ٹی ڈلال کی نگرانی میں یہ تالاب تیار ہوا۔ اس پر تقریباً ۶۵ لاکھ روپیہ صرف ہوئے ہیں۔

اس تالاب کے تیار ہونے سے قبل شہر کے لوگ حسین ساگر اور میر عالم کے تالاب کا پانی پیتے تھے سن ۱۳۳۰ف اور اس سے قبل دو تین سال سے برابر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اور یہ تالاب حسین ساگر و میر عالم خشک ہونے جا رہے تھے۔ تو سر رشتہ آبرسانی سے نل بند کر دیئے گئے۔ صرف دن میں دو مرتبہ صبح ۔ ۔ ۔ ایک اور شام میں ۴ سے ۶ تک نل کھولے جاتے تھے۔ اور اس وقت نل اتنی کثرت سے نہ تھے۔ وقت تھوڑا لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ایک ایک گھڑا پانی ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور جب عثمان ساگر تیار ہو چکا تو اس سے پینے کا پانی حاصل کرنے کا خیال ہوا اور مسٹر اسٹول برج کی نگرانی میں محکمہ آبرسانی

سے ایک وسیع اسکیم تقریباً (۷) لاکھ کی پیش ہوئی جو بارگاہ خسروی سے منظور فرمائی گئی۔

اب شہر کی گلی گلی میں نل لگائے گئے ہیں۔ اور پانی کی وہ تکلیف نہیں رہی۔ آصف نگر فلٹر بیڈ میں (۶۰) ہزار سالانہ خرچ سے پانی صاف کر کے ہم تک پہنچایا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی قدر نہیں۔ پانی بڑی بے دردی سے صرف کرتے ہیں۔

یہاں طلبہ جماعت ہائے دوم و سوم و چہارم کو اصطلاحات جغرافیہ مثلاً جھیل۔ راس۔ جزیرہ۔ جزیرہ نما۔ آبنائے اور خاکنائے۔ ساحل وغیرہ کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اور یہاں بھی طلبہ سے اسمات دریافت کیئے گئے۔ جنگل کی آب و ہوا اور شہر کی آب و ہوا کا فرق بتایا گیا۔

اتنے عرصہ میں مسٹر لچھمیا اور مولوی محمد عبدالرحیم صاحب مدرسین مدرسہ نے تالاب کے ایک دوسرے حصہ میں چار تیار کر دی۔ یہاں سے ہم فارغ ہو کر وہاں پہونچے اور چائے نوشی کے بعد ٹھیک ۵ بجکر ۲ منٹ کو وہاں سے نکلے۔

حمایت ساگر ۵ بجکر ۳ منٹ پر یہاں پہونچے۔ چونکہ پروگرام کے لحاظ سے ۵ منٹ زیادہ ہو گئے تھے اور آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا اس لئے یہاں اترنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ البتہ موٹروں کی رفتار بہت دھیمی کر دی گئی تھی۔ بند پر سے گزرتے ہوئے طغیانی کے دروازے بتائے گئے۔ اس کا بند عثمان ساگر کی بند سے کسی قدر طویل ہے۔ اور اس میں وہ پیچ و خم بھی نہیں ہے۔

میر عالم تالاب حمایت ساگر کا بند ختم ہوتے ہی موٹروں کی رفتار تیز کر دی گئی۔ ۶ بجے کے قریب میر عالم تالاب کے مغربی رخ پر پہنچے۔ اس وقت اچھی طرح شام ہو گئی تھی۔ تالاب کا منظر تاریکی میں دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ تاہم بچوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ میر عالم کا تالاب ہے۔

واپسی ۶ بجے ۲۰ منٹ پر مدرسہ پہونچے۔ یہاں بچوں کے والدین و سرپرست منتظر تھے۔ اور وہ اپنے بچوں کے خیر و عافیت کے ساتھ واپس آنے پر بہت خوش ہوئے۔ اور جن طلبہ کے سرپرست نہیں آئے تھے ان کو ملازمین کے ذریعہ گھر پہونچا دیا گیا اور بعض بچوں کو خود مدرسین نے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور جاتے ہوئے ان کو گھر پہونچا دیا۔

اتنے بڑے پروگرام کو کامیاب بنانے میں مددگار صاحبان مدرسہ نے بڑی مدد فرمائی مولوی سید عبدالمہیمن صاحب اول مددگار نے اپنا کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ اور گنبد ہائے قطب شاہی کے معائنہ کرانے اور تاریخی معلومات ہم پہنچانے میں جو دلچسپی لی وہ قابل تعریف ہے۔ مولوی محمد صدیق صاحب نے قلعہ گولکنڈہ کی سیر میں کارآمد باتیں بتائیں۔ قلعہ کے باشندہ ہونے کی

وجہ سے آپ کی ذات سے مدرسہ کو بے حد فائدہ پہونچا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی باتوں سے طلبہ کو بہت لطف آیا مولوی عبدالقادر صاحب نے اپنی فطری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اپنے پروگرام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔ مولوی عمر بن علی صاحب جوان آدمی ہیں۔ اور یہاں کے حالات و مقامات سے واقف نہیں ہیں آپ نے طلبہ سے زیادہ مستعدی سے معلومات حاصل کرنے میں اور جا بجا اہم باتوں کو نوٹ کرنے میں دلچسپی لی۔ اور ساتھ ہی اس کے اپنے فرائض کو بھی انجام دیتے رہے۔ مسٹر کھمپیا نے جس خوبی سے ہندو طلباء کو قابو میں رکھا اور ان کے کھانے پینے میں مدد دی وہ ان ہی کا حق تھا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب اسٹاف میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ہیں۔ اگر آپ ساتھ نہ ہوتے تو بڑی بے لطفی ہوتی آپ کے تجربوں اور معلومات سے بہت سی باتیں آسان ہوگئیں۔ رحیم الدین چپراسی اور سید رحمٰن فراش نے بھی بڑی محنت کی اور کسی قسم کی شکایات کا موقع نہیں دیا۔ اتنے بڑے پروگرام کے امکانات کو مکمل کرنا اور اختتام کو پہنچانا اسٹاف ہی کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھا۔ اگر کسی مدرسہ کے اسٹاف میں ایسے ہی شریف مدرس ہوں اور ان میں اتحاد و اتفاق ہو تو یہ کیا اس سے بڑے کام بھی انجام پا سکتے ہیں۔ اور اسی اتحاد و اتفاق کی بدولت مدرسہ ہذا ہمیشہ نیک نام رہا ہے۔

عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کی مدرسہ ہذا پر ہمیشہ عنایت رہی ہے۔ چنانچہ بلدہ کے اور مدارس تحتانیہ کے مقابلہ میں اسی مدرسہ کو ۱۳۳۶ف میں تعلیمی تفریح کرانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ اور جب اس کی رپورٹ ملاحظہ میں گزرانی گئی تو دوسروں کی اطلاع کے لئے رسالہ حیدرآباد ٹیچر میں شائع فرمایا۔ اور ۲ بہمن ۱۳۴۲ف کو بہ حین معائنہ مدرسہ تعلیمی تفریح کرانے کے لئے ارشاد گرامی ہوا۔ اور اس کو کامیاب بنانے میں بطور خاص توجہ فرمائی۔ مدرسہ عالیجناب ممدوح کا بے حد ممنون ہے۔

۱۳۳۶ف میں تعلیمی تفریح کا مدرسہ ہذا سے ایک اچھا نمونہ پیش ہونے کے باوجود بلدہ کے کسی مدرسہ نے تعلیمی تفریح نہیں کی مدرسہ ہذا کے لئے بڑے فخر و مباہات کی بات ہے کہ عالیجناب صدر مہتمم صاحب نے چھ سال کے بعد بھی پھر اسی مدرسہ کو تعلیمی تفریح کے لئے پسند فرمایا۔

اس تعلیمی تفریح سے طلبہ اور خود ہم کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور تعلیم بامشاہدہ کے ذریعہ طلبہ کے تصورات صاف اور درست ہوئے ان میں تحقیق کرنے اور اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ آخر میں کمترین نہایت ادب سے عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کی اس خاص کرم فرمائی کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔ فقط

مرزا احمد علی بیگ صدر مدرس تحتانیہ معظم شاہی۔

شکریہ

ہم مسٹر ڈی. بی بھوگلے صاحب بی. اے. بی ٹی مددگار مدرسہ فوقانیہ نامپلی کے شکرگزار ہیں کہ صاحب موصوف نے "طریقہ تعلیم ریاضی" پر ایک کتاب تصنیف کرکے اس کے حقوق طبع انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کو عنایت فرمائے۔

قارئین حیدرآباد ٹیچر مسٹر موصوف سے ناواقف نہیں ہیں۔ آپ سررشتہ تعلیمات کے دیرینہ ملازم اور پختہ کار مدرس ہیں تعلیم و تدریس سے ذاتی شغف اور خاص دلچسپی ہے اور کافی مدت تک ٹریننگ اسکول مدرسین بلدہ میں بھی کام کرچکے ہیں۔ نیز رسالہ ہذا کے انگریزی حصہ میں اکثر اپنے قیمتی خیالات اور تجربات سے پبلک کو مستفید فرماتے رہے۔ ریاضی آپ کا خاص مضمون ہے۔ مذکورۂ بالا تازہ تصنیف بیش بہا ہدایات اور عملی مشکلات کے حل سے مملو ہے جس کا مطالعہ ریاضی کے مدرسین کے لئے یقیناً سودمند ہوگا۔ انجمن اساتذہ بلدہ کی انتظامی کمیٹی نے یہ طے کیا ہے کہ پبلک کے فائدہ کی خاطر رسالہ ٹیچر میں اس کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ رسالہ ہذا کے آخر میں بطور ضمیمہ اس کی اشاعت کی جارہی ہے جس کا سلسلہ یقین ہے کہ کئی نمبروں میں رہے گا۔

ادارہ

سیرت محمد علی

انشاءاللہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہوگی

مولانا محمد علی کے ہزارہا معتقدوں اور انکی سیرت کے ہزارہا مشتاقوں کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ انکی سیرت نگاری کا کام ایک مختصر پیمانے پر ختم ہوچکا ہے اور اب مولانا عبدالماجد مدیر "سچ" مسودوں کی نظر ثانی کررہے ہیں۔ طباعت کا کام انشاءاللہ اگست سے شروع کردیا جائیگا! اور بانی جامعہ کی یہ سیرت انشاءاللہ یوم تاسیس جامعہ (۲۹ راکتوبر ۱۹۳۳ء) کو شائع ہوجائیگی قیمت غالباً تین روپیے ہوگی۔

خریداری کی تمام درخواستیں اسی وقت مندرجۂ ذیل پتہ پر بھیجدی جائیں۔ (مہتمم مکتبہ جامعہ دہلی)

شذرات

نظام العمل مرتبہ صدر مہتمم صاحب ورزش جسمانی۔ ذریعہ ہذا اطلاع کی جاتی ہے کہ سال حال فزیکل ایجوکیشن اور اتھلیٹک اسیوسی ایشن کی کارروائی پروگرام ذیل کے مطابق ہوگی۔

من ابتدائے جولائی لغایتہ فروری........ شاکراس فٹ بال ٹورنمنٹ (لیگ سسٹم)

من ابتدائے اگست تا سپٹمبر.......... معائنہ مدارس۔

من ابتدائے ۱۵ اکٹوبر تا نومبر........ کرکٹ ٹورنمنٹ۔

نومبر.......... اتھلیٹک اسپورٹس سالانہ

ڈسمبر.......... فزیکل نمائش مقابلہ

فروری ۱۹۳۳ء.......... ہاکی ٹورنمنٹ

افتتاح ماڈل پرائمری اسکول بلدہ۔ ایک جدید مدرسہ موسومہ "ماڈل پرائمری اسکول" قائم کیا جارہا ہے جس میں جدید طریقہ تعلیم اور آلات کے لحاظ سے تعلیم کا انتظام ہوگا۔ اور جس کے لئے ایک تجربہ کار اور لائق یورپین صدر معلمہ کا انتخاب ہوا ہے جو کہ عنقریب انگلستان سے آنے والی ہیں۔ نیز جائداد اول مددگارہ مدرسہ مذکورہ پر ایک یورپ کی تعلیم یافتہ ملکی خاتون کا تقرر عمل میں آچکا ہے بقیہ جائداددں پر بھی لائق و ٹرینڈ معلمات کا تقرر زیر غور ہے۔ دفتر ہذا پر متعدد استفسارات اس مدرسہ کے متعلق وصول ہورہے ہیں لہٰذا ذریعہ ہذا عوام کی اطلاع کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ماڈل پرائمری اسکول کا افتتاح یکم شہریور ۱۳۴۲ف یوم پنجشنبہ کو مسز ولمنگ کے مکان واقع حیدرگوڑہ میں (جو کہ مدرسہ مذکور کے لئے کرایہ پر لیا جارہا ہے) کیا جائے گا۔ اور اسی تاریخ سے مدرسہ میں طلبہ کے داخلہ کا آغاز ہوگا۔ اس بارہ میں مزید معلومات دفتر ہذا سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اندرون چھ سال کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص انتظام ہوگا۔

روئداد تعلیمی جلسہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ ملی تعلقہ اندرلہ ضلع گلبرگہ شریف۔ بتاریخ ۱۱ اردی بہشت ۱۳۴۱ف مدرسہ ہذا کا جلسہ زیر صدارت عالیجناب مولوی سید معین الدین صاحب مہتمم تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف منعقد ہوا۔ اولاً نمائش کا افتتاح ہوا جس میں طلبہ کا تیار کیا ہوا کام مثلاً ڈرائنگ، نقشے دستی مشاغل اور دستکاری کے مختلف نمونے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ معائنہ بوم ورک

سے اولیا کو اپنے بچوں کے محنت و شوق کے صحیح اندازہ کا موقع دیا گیا تھا۔

اس کے بعد حمد و ثنا سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سرکار کی تعداد چھ سو سے زائد تھی۔ تقریباً دو گھنٹے تک مختلف عنوانات پر تقریریں ہوئیں۔ زاں بعد صدر جلسہ نے علم کے فضائل و خوبیوں پر فصیح و بلیغ تقریر و آخر میں معلومات کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تقریباً دس سال سے مدرسہ تحتانیہ ملی کی حالت نہایت خراب و ابتر تھی۔ مجھے آج مدرسہ کی یہ روز افزوں ترقی دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی۔ دیہات میں صنعت و حرفت و دستی مشاغل کی ایسی با اصول تعلیم اور طلبہ کے ساختہ خوشنما نمونہ جات کے معائنہ کا مجھے بہت کم اتفاق ہوا۔ مسرت کی بات ہے کہ مدرسہ ہذا کے غیر مستطیع و مفلوک و یتیم طلبہ کے لئے مقامی معزز رعایا کے چندہ سے درسی کتب وغیرہ کافی تعداد میں فراہم کی گئی ہیں۔ جو اساتذہ صاحبان کی خاص دلچسپی و تعلیمی شغف کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد کسان کی تعلیمی بدشوقی اور اس کی تردید میں کنڑی مکالمہ اور جہالت کے بڑے نتائج اور علم کے فضائل پر اردو نہایت دلچسپ ڈرامہ ہوا جس سے حاضرین بہت محظوظ و متاثر ہوئے جلسہ کے ختم پر صدر مدرس صاحب نے ضروریات تعلیمی و برکات عثمانی کو بیان کرتے ہوئے اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیاں فرخندہ فال کے ترقی عمر و اقبال کی دعا مانگی اور جلسہ دعا کے ساتھ برخاست ہوا۔

سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ حیدرآباد۔ کانفرنس مذکور کا سالانہ جلسہ سال حال ۱۰، ۱۱ ر آبان ۱۳۴۱ ف کو بمقام سٹی کالج منعقد ہوگا حسب سابق نمائش تعلیمی کا انتظام بھی ہے۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ مپارم کلاں تعلقہ محبوب آباد ضلع ورنگل۔ مدرسہ ہذا کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد بتاریخ ۳۰ ر خورداد ۱۳۴۱ ف زیر صدارت عالیجناب جیورکشن راؤ صاحب سابق پٹیل تحصیل منعقد ہوا جس میں مقامی عہدہ داران دیہی و دیسکھ و دیشپانڈہ صاحبان وغیرہ جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تھی شریک جلسہ ہوئے۔ جماعت چہارم کے دو طلبہ نے اردو و تلنگی میں حمد باری تعالیٰ سے جلسہ کا آغاز کیا۔ اور مدرسہ ہذا کے چند طلبہ نے نہایت مہارت پر مکالمہ کرکے حاضرین کو نہایت محظوظ کیا۔

مولوی رضا علی بیگ صاحب صدر مدرس، و مسٹر ٹی مرہر راؤ صاحب و مسٹر ٹی کریا صاحب و مسٹر وینکٹ راما چاری صاحب اساتذہ مدرسہ ہذا کو علم و ہنر پر نہایت دلپذیر تقریر کے بعد جناب صدر نشین صاحب جلسہ نے مقاصد و ترقی تعلیم پر مبسوط تقریر فرمائی اور بعد تقسیم انعامات اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مد ظلہ العالی و صاحبزادگان بلند اقبال و صاحبزادیاں فرخندہ فال کی دعائے ترقی عمر و اقبال و ازدیاد جاہ و جلال پر جلسہ ختم ہوا۔

تنقید

دی جرمن سکول سسٹم، مصنفۂ جناب سید علی اکبر صاحب ایم، اے کینٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ واطراف بلدہ طابع وناشر لانگ مینس گرین اینڈ کمپنی لمٹیڈ۔ یہ کتاب جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کی تازہ تصنیف ہے جو انگریزی زبان میں جرمانیہ کے موجودہ نظام پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ جو علاوہ دیباچہ اور تقریظ وغیرہ کے تقریباً سوا دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔

فاضل مصنف کی شخصیت تعارف سے مستغنی ہے، آپ کے علمی اور تعلیمی شغف کا چرچا ہندوستان سے نکل کر انگلستان میں بھی ہونے لگا ہے۔ چنانچہ رائٹ آنریبل لارڈ ایوسٹیس پرسی سابق پریذیڈنٹ بورڈ آف ایجوکیشن انگلستان اسی کتاب کی تقریظ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مسٹر علی اکبر بحیثیت افسر و مبصر تعلیمات نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی شہرت رکھتے ہیں جہاں آپ نے سنہ ۱۹۲۷ء کی امپیریل ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ لندن کی بحث وتمحیص اور اس کی کارروائیوں میں نمایاں طور پر حصہ لیا اور بیش بہا امداد دی"

فاضل مصنف کو اسی کانفرنس کے بعد جرمنی جانے کا موقع ملا۔ اگست سنہ ۱۹۲۷ء سے اپریل سنہ ۱۹۲۸ء تک آپ ضروری مواد حاصل فرماتے رہے اور اس کے بعد صاحبزادہ نواب صلابت جاہ بہادر کے یورپ کے سفر میں ساتھ رہنے اور جرمنی کے مدارس کا دوبارہ معائنہ کرنے کا موقع ملا۔ اس لحاظ سے زیر تنقید کتاب جدید العصری تحریکات اور تازہ معلومات سے پر ہے۔

جنگ عظیم سے پیشتر جرمنی کا نظام تعلیم وہاں کی مختلف ریاستوں کے اغراض اور ملکی ضروریات کو لئے ہوئے تھا اور اپنے قواعد وضوابط اور پابندیوں کے باعث طلبہ کی جولانی طبع اور انفرادی جوہر قابل کو ابھارنے میں ممد نہ تھا۔ لڑائی کے بعد ہی جرمنی نے دوسرا جنم لیا، اور مدارس خالص جمہوری اصول پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک قایم ہوگئے۔ مصنف نے جنگ سے پیشتر کی تاریخ کا خاکہ پیش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کس طرح اب طلبہ کی اخلاقی تربیت کی جاتی ہے، اور ان کی مارل اسپرٹ کو سنوارا جا رہا ہے، نیز ان کی ذاتی اور ذہنی موزونیت اور ان کے جوہر قابل کو ابھار کر قومی خصائل پیدا کئے جا رہے ہیں، اور ان کے علاوہ بین الاقوام مصالحت اور مودت کے جذبہ کو اکسایا جا رہا ہے۔ جرمنی کا نصاب نہ خاصہ لچکدار ہے اور حیات انسانی کے ہر شعبہ اور اس کے

مختلف پہلوؤں اور جزئیات پر حاوی ہے۔ اس لحاظ سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک نے تعلیمی امور اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر اتنا غور نہیں کیا جتنا کہ جرمنی نے۔

فاضل مصنف نے انہی امور اور دوسری خصوصیات کو دلاویزی اور عرق ریزی کے ساتھ پیش کیا ہے کسی نوعیت کا کوئی مدرسہ صاحب موصوف کی نظر سے نہ بچ سکا جس کا اندازہ فہرست مضامین سے ہو سکتا ہے۔

(۱) مدارس کا نظم و نسق (ان کی قسمیں اور معائنہ تعلیم بالغاں)

(۲) کنڈرگارٹن

(۳) ابتدائی مدارس (طریقہ تعلیم اور نصاب)

(۴) اکارڈن اسکول (باغبانی کا مدرسہ)

(۵) مدارس وسطانیہ (مختلف مضامین کا نصاب)

(۶) فنی مدارس (تجارتی مدارس، ٹکنکل اسکول وغیرہ)

(۷) ثانویہ مدارس (مقصد و اقسام مدارس، غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے مدارس، اصول تعلیم)

(۸) تعلیم انگریزی (مقصد تعلیم انگریزی، اس کا طریقہ تعلیم، درسی کتب، ہندوستان اور جرمنی میں انگریزی تعلیم کا مقصد)

(۹) تعلیم جغرافیہ و تاریخ (مقصد و طریقہ تعلیم، ہندوستان اور جرمنی میں)

(۱۰) تعلیم ریاضی اور نیچرل سائنس (نمایاں خط و خال، ہندوستانی مدارس میں ان کی تعلیم)

(۱۱) تعلیم ڈرائنگ اور موسیقی۔ (ہندوستان میں تعلیم ڈرائنگ کا مقصد)

(۱۲) طریقہ امتحان۔

(۱۳) تعلیم جسمانی (مقصد معلم ورزش جسمانی کی ٹریننگ کا انتظام، قومیت کی تشکیل میں اس کا حصہ)

(۱۴) تحریک نوجوانان (یوتھ موومنٹ، اقامت خانے وغیرہ)

(۱۵) صحت اطفال (نگہداشت، معائنہ طبی، ناقص القویٰ کے مدرسے)

(۱۶) مدرسین (انتظام ٹریننگ، معلمات کنڈرگارٹن مدرس کے اوقات مصروفیت اور ان کی تنخواہیں)

(۱۷) استخراج نتائج (ضمیمہ معہ درسیات)

یہ قابل قدر تصنیف بلحاظ سلاست زبان و معلومات اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس کا مطالعہ ہر ہندوستانی کے لئے مفید ہوگا۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ جا بجا ہندوستانی حالات سے

مقابلہ کیا گیا ہے مثلاً تعلیم انگریزی، جغرافیہ و تاریخ، ریاضی و نیچرل سائنس وغیرہ کا مقصد جرمنی میں کیا اور ہندوستان میں کیا ہے۔

عرض کہ قابل مصنف نے کامیابی کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اہل جرمانیہ بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم کیا ہے اور اُسے کیا ہونا چاہیئے۔ نہ صرف یہی بلکہ اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ اہل جرمانیہ کما حقہ جانتے ہیں کہ علم کی اہمیت حیات انسانی کے ہر شعبہ میں کیا ہے۔ غرض کہ زیر تنقید کتاب کا مطالعہ نہ صرف اہل دکن بلکہ اہل ہند کے لئے بھی مفید ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب وقعت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ اور کاغذ نفیس ہے۔ قیمت صرف ۸؍ کلدار ہے۔ ہندوستان کے عام مشہور کتب فروشوں سے طلب کی جا سکتی ہے۔

عبدالنور صدیقی

میلاد النبی پراجکٹ۔ مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے جو سلسلہ اشاعت تعلیم کیا ہے اسکا مضمون سلسلہ نمبر (۲) موسوم بہ میلاد النبی پراجکٹ مرتبہ مولوی محمد عبدالغفار صاحب میں نے غور سے پڑھا۔ اس مضمون نے انسان کے زمانہ طفولیت کے قابل قدر جذبات کی کچھ متحرک تصویریں جو ملک و ملت کے سامنے پیش کی ہیں وہ صرف نگارخانہ جامعہ ملیہ کی قصیدہ خوانی نہیں ہے۔ بلکہ آغاز حیات انسانی کے بے لوث اور حقیقی جذبہ کا ایک مرقع ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کے صغیر سنی کا دماغ ایک ایسی جیتی جاگتی زمین ہے کہ جو تخم اسمیں بویا جاتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ نے جو علمی پودے نصب کئے تھے۔ یہ مضمون ان کے بارآوری کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ بچوں کے اس پروجکٹ سے جو میلاد نبی کے متعلق قایم کیا ہے۔ ہمکو اوس سچے احساس کا پتہ چلتا ہے جو اساتذہ کے مذہب پاشیوں اور علم تراشیوں کے اونکے دل و دماغ میں پیدا کر دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ مضمون تعلیم اطفال کس کیلئے ایک شمع ہدایت ہے جسکی روشنی میں بآسانی ہم یہ معلوم کر سکیں گے کہ بچوں کے دلوں میں کسطرح علمی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

جامعہ موصوفہ نے صغیر السن بچوں کے دلوں میں جو احساس مذہبی پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہر طرح سے لائق تحسین ہے۔ مذاکرہ پیغمبر کا شوق، دیار عرب و راہ حرم کا ذوق، معبود حقیقی سے دعائیں حضرت پیغمبر عرب سے التجائیں جو اس مضمون میں ان بچوں کی ہی معصوم تحریروں سے دکھلائی گئی ہیں ہم اونکی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب ہی کا وہ مقدس جذبہ ہے جسکے بغیر دنیا کی کوئی قوم ترقی کی منزل مقصود کی جانب گامزن نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم ساتھ ہی اس کے دعا کرتے ہیں کہ خدا ان معصوم ہستیوں کو کورانہ عصبیت کے اوس لباس سے محفوظ رکھے جو عناد و نفاق و خوں ریزی و جنگجوی کے بدنما داغوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔

سید ہاشم جلیل الہلیل

نتائج امتحان سررشتہ تعلیمات

نتائج امتحان معلمی ایف اے کامیاب اساتذہ

رجسٹر نمبر — نام معہ ولدیت — علمی نتیجہ نظری

عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ

۱۔ واحد علی ولد نذیر علی دوم۔ دوم

۲۔ سری دھر راؤ ولد رام کشن راؤ دوم۔ سوم

۳۔ سوناجی ولد بجرنگ جی دوم۔ دوم

۴۔ فیض الحسن ولد قاری محمد حسین دوم۔ سوم

۵۔ محمد عبد القادر ولد نور محمد دوم۔ دوم

۶۔ شیخ مہتاب ولد محمد حسین دوم۔ دوم

۷۔ امیر الدین صدیقی ولد محمد قاسم صدیقی دوم۔ سوم

۸۔ حاجی احمد علی ولد حاجی ہاشم علی دوم۔ دوم

نتائج امتحان معلمی میٹرک کامیاب اساتذہ

نام امیدوار معہ ولدیت

عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ

۱۔ سید جمال ولد سید عبد اللطیف دوم۔ دوم

۲۔ نرہر راؤ ولد کاشیا اول۔ دوم

۳۔ کے۔ وینکٹ راؤ ولد کے۔ کشن راؤ سوم۔ ناکام

۴۔ محمد یوسف الدین ولد محمد خیر الدین دوم۔ دوم

۵۔ ناگیش راؤ وسگاؤنکر ولد وینکٹش راؤ وسگاؤنکر دوم۔ سوم

۶۔ عبد السلام ولد لطیف حسین اول۔ دوم

۷۔ گنیش راؤ ولد شنکر راؤ سوم۔ زیر غور

۸۔ محمد عبد العزیز ولد محمد عبد الرزاق دوم۔ دوم

۹۔ منوہر راؤ ولد ہری پنت دوم۔ سوم

۱۰۔ چندریا ولد سیدپا شاہ پورکر اول۔ دوم

۱۱۔ مادھو راؤ ولد وامن راؤ دوم۔ سوم

۱۲۔ محمد صدیق ولد محمد چندہ دوم۔ دوم

۱۳۔ محمد عبد الشکور ولد محمد عبد الصمد دوم۔ سوم

۱۴۔ محمد برہان الدین ولد محمد عبد العزیز دوم۔ دوم

۱۵۔ وینکٹ راؤ اندورکر ولد کشن راؤ اندورکر اول۔ دوم

۱۶۔ محمد ہدایت اللہ ولد غلام محی الدین دوم۔ سوم

۱۷۔ ڈی۔ جگیا ولد ڈی رائے لنگم دوم۔ دوم

۱۸۔ اے۔ راجیا ولد سمیا اول۔ دوم

۱۹۔ محمد فیض عالم ولد میر عالم دوم۔ سوم

۲۰۔ پیڑی مری جگناد ہم ولد بی رام سومیا جی دوم۔ زیر غور

خانگی

۲۲۔ ڈی۔ کیول سنگھ ولد دلیپ سنگھ صرف ریاضی۔ کامیاب

نتائج امتحان ڈپارٹمنٹل

نام امیدوار معہ ولدیت

مدرسہ وسطانیہ بھوکردن

۷۔ غلام مصطفےٰ خاں ولد غلام جیلانی خاں سوم

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ ناندیڑ

۱۴۔ شیخ فرید ولد محمد سرور سوم

مدرسہ وسطانیہ مدھول

۱۵۔ عبدالعلی ولد شیخ راجہ سوم

۱۶۔ محمد فضل الرحمن ولد شیخ حبیب سوم

۱۷۔ محمد ابراہیم ولد محمد عبدالکریم دوم۔

مدرسہ وسطانیہ دیگلور

۲۰۔ شیخ میراں ولد شیخ عبدالقادر سوم

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نظام آباد

۲۶۔ سید خواجہ عبدالعزیز ولد محمد عظیم الدین اول

۲۸۔ محمد وقارالدین حسن ولد محمد فیاض حسین دوم

۲۹۔ قاضی حسین بن محمد بن علی سوم

مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی

۳۱۔ وینکٹ نارائن ریڈی ولد رام ریڈی سوم

مدرسہ وسطانیہ مدور

۳۵۔ محمد عبدالولی ولد وزیر علی دوم

۴۰۔ محمد بشیرالدین ولد شیخ فرید دوم

مدرسہ وسطانیہ انگریزی یاریپٹھ

۴۱۔ گانم سیتارام ریڈی ولد ویرا ریڈی دوم

مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ مریالگوڑہ

۴۴۔ محمد افضل حسین ولد محمد امام علی دوم

۴۵۔ مرزا منصور بیگ ولد مرزا حسین بیگ سوم

مدرسہ وسطانیہ سداسیوپیٹھ

۴۶۔ محمد عثمان اول ولد محمد یعقوب علی دوم

مدرسہ وسطانیہ مکتھل

۴۷۔ محمد اکبر علی ولد محمد حسین دوم

۴۸۔ محمد عبدالرحمن ولد شیخ حسین دوم

۴۹۔ رئیس۔ ناگیا ولد رامیا دوم

۵۰۔ کے۔ یلیا ولد کے۔ سوریا دوم

مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ گرمٹکال

۵۳۔ محمد خواجہ ولد شیخ محی الدین اول

۵۴۔ سید حمیداللہ حسینی ولد سید فخراللہ حسینی دوم

۵۵۔ محمد سلطان الدین ولد محمد عبدالرحمن سوم

مدرسہ وسطانیہ عسکریہ چیتاپور

۵۷۔ سیویا ولد تکیا سوم

مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ نلنگہ

۶۹۔ محمد اسمٰعیل علی ولد محمد مہتاب علی دوم

۷۰۔ محمد حشمت علی ولد محمد محبوب علی سوم

۷۱۔ وامن مسلگے کر ولد کشن راؤ مسلگے کر دوم

۷۲۔ محمد امین ولد محمد قاسم سوم

مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ احمدپور

۷۳۔ محمد افضل الدین ولد محمد امام الدین سوم

مدرسہ وسطانیہ عالم پور

۷۵۔ محمد عبدالوہاب ولد محمد عبدالرزاق دوم

مدرسہ وسطانیہ کوڑلمہ

۷۹۔ غلام حسین ولد شیخ نتھو سوم

مدرسہ وسطانیہ بانا کنڈور

۸۰۔ سید احمد ولد سید شرف الدین دوم

۸۲۔ سید محبوب حسین ولد سید اکرام علی سوم

مدرسہ تسنیم المعلمات بلدہ

۱۲۰۔ احدی بیگم بنت میر واحد علی سوم

۱۲۲۔ قادر بیگم بنت محمد عبدالقادر سوم

۱۲۳۔ عصمت النسا بیگم بنت محمد عثمان سوم

۱۲۴۔ آمنہ خاتون بنت غلام محمد خان دوم

۱۲۵۔ سیدہ طاہرہ بیگم بنت حبیب علی سوم

۱۲۷۔ نجم النسا بیگم بنت محمد وزیر علی سوم

۱۳۰۔ احمد النسا بیگم بنت سید ظہور الحق سوم

مدرسہ للنسوان اردو ہنمکنڈہ

۱۴۶۔ صابرہ بیگم بنت محمد خلیل الرحمن سوم

۱۴۷۔ فاطمہ النسا بیگم بنت محمد نذیر حسین سوم

وسلین گرلس اسکول سکندرآباد

۱۶۳۔ ڈی۔ شانتی بنت ابراہام سوم

۱۶۴۔ وائی سندرم بنت گرے گری سوم

۱۶۵۔ آر۔ شانتی بنت یسوع داس دوم

مدرسہ وسطانیہ شفیع پور

۱۷۴۔ عبدالقادر ولد فقیر محمد سوم

۱۷۶۔ مرلیدہر ولد یادو راؤ سوم

مدرسین مدرسہ وسطانیہ قندھار

۸۳۔ سید ابراہیم ولد سید اسمٰعیل سوم

۸۴۔ رگھوناتھ سنگھ ولد گوپال سنگھ سوم

۸۹۔ فقیر محمد ولد شیخ ڈہین سوم

مدرس مدرسہ تحتانیہ پرہ پلی

۱۰۱۔ محمد جلال الدین ولد سید امین الدین سوم

مدرس مدرسہ تحتانیہ کروڑ گو

۱۰۸۔ سید نصیر الدین ولد سید رسول دوم

مدرس مدرسہ امدادی لوکلفنڈ رامپور

۱۱۶۔ پی یریج۔ راجم ولد جی۔ رامیا اول

مدرس مدرسہ لوکلفنڈ مامنور

۱۱۷۔ پی۔ نرہری راج ولد کشم راج سوم

مدرس مدرسہ تحتانیہ تانڈور

۱۱۸۔ محمد اعظم ولد جمال محمد سوم

نتیجہ امتحان معلمی مڈل کامیاب اساتذہ

نام امیدوار معہ ولدیت

مدرسہ تعلیم المتعلمین ورنگل

۲۔ سید ظہور الحسن ولد سید حیدر علی دوم

۳۔ محمد محبوب خاں ولد محمد یوسف خاں سوم

۵۔ سید حسین ولد سید شاہ علی تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۶۔ محمد عبدالعزیز ولد محمد نواز سوم

۷۔ سید اسمٰعیل ولد سید عمر دوم

۸۔ سید احمد حسین ولد سید میر سوم

۱۰۔ محمد عبدالکریم ولد شیخ حیدر دوم

۱۱۔ احمد حیات خاں ولد محمد ابراہیم خاں سوم

۱۲۔ محمد افضل ولد محمد معصوم علی دوم

۱۳۔ محمد وزیر ولد فتح محمد دوم

۱۴۔ غلام دستگیر ولد شیخ چاند اول

۱۵۔ محمد عبدالغفار ولد محمد بادشاہ دوم

۱۶۔ محمد شیر علی ولد محمد قاسم علی سوم

۱۷۔ محمد فخر الدین ولد محمد برہان الدین سوم

۱۹۔ محمد عبد الحق ولد حاجی عبد الہاشم تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۲۰۔ اننالارام نرسیا ولد اننا لکشمن نرسیا اول

۲۱۔ محمد عبد العزیز ولد محمد ابراہیم علی سوم

۲۲۔ محمد عثمان علی ولد محمد صاحب حسین دوم

۲۳۔ اے۔ ایودھیا رامیا ولد اے۔ لچھمی نرسیا دوم

۲۴۔ آر۔ کرشنا مورتی ولد آر۔ وینکیا۔ ریاضیات میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۲۵۔ کے۔ آر۔ کشن راؤ ولد کے۔ سوبہنا دہری راؤ دوم

۲۶۔ سی۔ سری راملو۔ ولد سی کشٹیا سوم

۲۷۔ محمد ہاشم ولد محمد محبوب علی دوم

۲۸۔ محمد نذیر الدین ولد محمد قاسم علی دوم

۲۹۔ غلام دستگیر ولد غلام نبی دوم

۳۰۔ محمد شمشیر خاں ولد حسین خان دوم

۳۱۔ سید عبد الستار ولد سید مولانا دوم

۳۲۔ محمد عبد الرحمن ولد یونس صاحب سوم

۳۵۔ شیخ امام ولد شیخ علی۔ تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۳۶۔ محمد خان ولد محمد شریف خاں سوم

۳۷۔ سید باقر علی ولد خطیب سید احمد۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۳۹ احمد خیر الدین ولد محمد عبد الغفار سوم

۴۰۔ محمد ناصر علی ولد جمال محمد۔ سال آئندہ سائنس میں امتحان دینا ہوگا۔

۴۱۔ بجو بینیا ولد بجوا نتیا سوم

۴۲۔ غلام محی الدین ولد محمد حفیظ الدین دوم

۴۳۔ سید خواجہ ولد سید سالار سوم

۴۴۔ قمر الدین شریف ولد مرتضی شریف سوم

۴۵۔ شیخ محبوب ولد شیخ محی الدین سوم

۴۸۔ محمد صفدر علی ولد شیخ حیدر۔ ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۴۹۔ ریس گوپیا ولد ستیا دوم

۵۰۔ سید عبد الدین ولد سید اسمٰعیل دوم

۵۱۔ محمد عبد اللہ ولد محمد عبد الکریم۔ تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۵۲۔ سید بن علی دوم

۵۳۔ محمد جہانگیر ولد محمد بادشاہ دوم

۵۴۔ ہری داس رام کشن راؤ ولد نرسیا سوم

۵۵۔ محمد شہاب الدین ولد محمد نظام الدین دوم

۵۶۔ محمد عبد الحفیظ ولد ولی محمد سوم

۵۷۔ محمد عبد الرحیم ولد محمد اسمٰعیل۔ ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۵۸۔ میر حسین ولد میر محب علی۔ ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۵۹۔ محمد ابراہیم ولد محمد قاسم دوم

۶۰۔ جی دیویداس ولد جی نرسملو سوم

۶۱- منظور احمد ولد محمد غوث دوم

۶۲- انتیا ولد بابیا دوم

۶۳- محمد عبدالقادر ولد محمد اسمٰعیل سوم

۶۵- محمد اسمٰعیل ولد فتح محمد دوم

۶۹- محمد عبدالعزیز ولد محمد وزیر علی سوم

۷۰- محمد عبدالحمید ولد عنایت خان سوم

۷۳- غلام نبی ولد عباس علی سوم

۷۴- محمد غوث ولد محمد یعقوب۔ تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۷۷- ناگیا ولد سوگیا سوم

۷۹- پی شنکر راؤ ولد نارائن راؤ نگڑی سوم

۸۱- ٹی نارائن سوامی مدلیار ولد ٹی نرسواجی مدلیار۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا

۸۳- گنگو لکشمی نارائن ولد گنگو راچندریا سوم

۸۴- یم راگھواچاری ولد یم وینکٹ کرشنا چاری اول

۸۵- اینول رام کرشنیا ولد اینول ہانکیا سوم

وسلین مشن اسکول میدک

۸۷- ڈیگلا برناباس ولد سلاس۔۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۸۹- جلا سورتم ولد جوزف سوم

۹۰- موگیلی پربھوداس ولد وینکیا سوم

۹۱- ایرونا لاجان ولد لانڈرس سوم

۹۲- درسنا سیمیول ولد اسوداس سوم

۹۳- گدم دیویداس ولد جوزف سوم

۹۴- یوچرلا جوزف ولد شانتیا سوم

۹۵- پریچی سالومن ولد رامیا سوم

۹۶- یگولا دیورتم ولد سیمیول دوم

۹۷- ایلا دیوا شائم ولد جوزف۔ ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۹۸- اکا پیتری چارلس ولد نتھل دوم

۱۰۰- مدلیا بنجمن ولد فلپ۔ صرف ریاضی۔ کامیاب

خانگی امیدواران

۱۰۶- سید ابراہیم دوم ولد سید امیر علی۔ اردو معہ طریقہ تعلیم کامیاب۔

۱۱۴- محمد محبوب علی ولد قادر علی۔ صرف ریاضی کامیاب

۱۱۷- ڈی راجنا ولد شینا۔ سال آئندہ صرف ریاضی میں امتحان دینا ہوگا۔

مدرسہ تعلیم المعلمین مرہٹی اورنگ آباد

۱۲۲- سداشیو راؤ دالکر ولد نارائن راؤ دالکر دوم

۱۲۳- لکشمن راؤ ولد ماروتی راؤ سوم

۱۲۵- اننت راؤ ولد اچندر راؤ۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۲۷- محمد رحمان خاں ولد محمد عبداللہ خاں سوم

۱۲۸- محمد اسمٰعیل ولد محمد عبدالقادر سوم

۱۲۹- محمد عبدالاحد ولد عبدالباری دوم

۱۳۰- سید ولی الدین ولد سید حسن الدین سوم

۱۳۱- محمد عبدالقادر ولد محمد خواجہ دوم

۱۳۲- محمد یٰسین خاں ولد غلام محی الدین خاں سوم

۱۳۳- محمد احمد علیخاں ولد محمد امیر علیخاں سوم

۱۳۴- راجیشور راؤ ولد گنپت راؤ سوم

۱۳۵ - محمد یعقوب خاں ولد گلاب خاں دوم

۱۳۶ - محمد احمد خاں ولد محمد شریف خاں دوم

۱۳۷ - غلام حسین ولد غلام مصطفٰے دوم

۱۳۸ - شیخ علی ولد شیخ احمد - ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا

۱۳۹ - محمد تاج الدین ولد غلام محمد سوم

۱۴۰ - محمد خاں ولد محمد عبد اللہ خاں سوم

۱۴۲ - سوریشور راؤ ولد شنکر راؤ دوم

۱۴۳ - مرزا محمد محبوب بیگ ولد مرزا محمد قاسم بیگ دوم

۱۴۴ - کاشی ناتھ راؤ ولد ڈھونڈی رام دوم

۱۴۵ - محمد اسمٰعیل ولد غلام محمد سوم

۱۴۶ - سید محمد علی ولد سید مولانا - سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۴۷ - محمد عبد الصمد خان ولد محمد جلال خاں دوم

۱۴۸ - محمد عبد العلی ولد عبد النبی سوم

۱۵۰ - محمد عبد العلی ولد شیر علی دوم

۱۵۱ - محمد عبد الرحیم ولد محمد مولانا دوم

۱۵۲ - انا راؤ ولد وینکٹ راؤ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۵۴ - گوپال راؤ راجہ رام سوم

۱۵۵ - محمد امیر الدین ولد شیخ احمد دوم

۱۵۶ - مرزا فدا حسین بیگ ولد مرزا ثابت علی بیگ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۵۷ - محمد عبد العزیز ولد محمد اعزاز ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۵۸ - محمد عبد الکریم ولد محمد مستان دوم

۱۵۹ - محمد فیض الدین ولد محمد ابو الحسن دوم

۱۶۰ - محمد اسمٰعیل ولد شیخ مہتاب دوم

۱۶۱ - محمد اسمٰعیل ولد سید احمد سوم

۱۶۲ - محمد عبد القیوم ولد حافظ محمد صدیق سوم

۱۶۳ - محمد عطاء الرحمٰن ولد محمد یوسف - تاریخ و جغرافیہ سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۶۴ - محمد حسین ولد محمد بہاء الدین دوم

۱۶۵ - دولت راؤ ولد مانک راؤ اول

۱۶۶ - محمد عثمان علی ولد محمد یعقوب علی دوم

۱۶۷ - سید عاشق علی ولد سید اکبر علی سوم

۱۶۹ - وشومبر راؤ جوشی مولے ولد ڈھونڈی راج جوشی مولے سوم

۱۷۲ - محمد بخش اللہ خاں ولد محمد یوسف خاں دوم

۱۷۳ - امرت راؤ سب نویس ولد شنکر راؤ سب نویس سوم

۱۷۴ - گنگا دھر راؤ جوشی ولد وشنو پنت جوشی دوم

۱۷۵ - انبا داس راؤ جوشی ولد رامچندر راؤ جوشی دوم

۱۷۷ - سندر راؤ ولد نتھو پنت سوم

۱۷۸ - محمد عبد المجید خاں ولد محمد عبد الرحمٰن خاں ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۷۹ - محمد علیم الدین ولد محمد شفاء الدین - ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۸۰ - محمد عبد الحمید ولد شیخ حسین - ڈرائنگ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

۱۸۱ - محمد عثمان خاں کمالی ولد غوث محمد خاں دوم

۱۸۲ - محمد معین الدین ولد محمد حیات دوم

۱۸۴۔ سید خواجہ حسین ولد سید خواجہ قاسم سوم
۱۸۵۔ محمد عبدالسلیم ولد محمد حنیف دوم
۱۸۶۔ محمد عبدالرزاق ولد محمد عبدالرحیم۔ تاریخ و جغرافیہ میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۱۸۷۔ محمد حبیب الدین ولد محمد شہاب الدین سوم
۱۸۹۔ بھگوان راؤ ولد کرشن راؤ سوم
۱۹۰۔ محمد شجاع الدین ولد محمد عبدالکریم سوم
۱۹۱۔ رامچندر راؤ ولد لکشمن راؤ سوم
۱۹۲۔ سید یونس ولد سید غلام نبی دوم
۱۹۵۔ یل۔ ہنمنت راؤ ولد رامچندر راؤ اول
۱۹۶۔ رام نایک ولد اچھیا نایک سوم
۱۹۸۔ علی حسین ولد محمد حسین دوم
۱۹۹۔ رگھوناتھ راؤ ولد گنیش راؤ۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۰۰۔ سید غلام صمدانی ولد سید اکبر حسین دوم
۲۰۱۔ محمد عبدالواحد ولد شیخ علی سوم
۲۰۲۔ شیخ حسین ولد تاج الدین سوم
۲۰۴۔ مادھو راؤ ولد ملہار راؤ۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔

خانگی امیدواران مرکز اورنگ آباد

۲۰۵۔ نرہر راؤ شیلکے ولد بھوان راؤ شیلکے۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۰۶۔ دیویداس کدم ولد مارتی راؤ کدم۔ صرف ریاضی۔ کامیاب۔
۲۰۹۔ دیویداس ولد دتاتری سیتارام۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۱۱۔ ڈگمبر راؤ پٹواری ولد ناگور راؤ اننت راؤ مرہٹی معہ طریقہ تعلیم۔ کامیاب
۲۱۳۔ جیون راؤ ولد ہری ہر راؤ۔ ریاضی میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۱۴۔ شنکر راؤ ولد مادھو راؤ۔ صرف ریاضی۔ کامیاب
۲۱۵۔ باپو راؤ کرہاڑے ولد بلی رام کرہاڑے صرف ریاضی۔ کامیاب۔
۲۱۶۔ نذیر احمد ولد غلام نبی۔ صرف سائنس کامیاب

مدرسہ تعلیم المعلمین گلبرگہ

۲۲۱۔ میریا ولد تیجیا۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۲۲۔ شیولنگپا ولد سدپا۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۲۳۔ رامیا ولد راجیا۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۲۴۔ ششی گیر راؤ ولد وینکٹیش راؤ دوم
۲۲۷۔ پربھو راؤ ولد بھیمن راؤ سوم
۲۲۸۔ چنبسپر راؤ ولد تمن گوڑہ سوم
۲۲۹۔ شامیا ولد لنگیا۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۳۲۔ سید غوث پیر ولد سید غلام مصطفےٰ سوم
۲۳۳۔ رنگیا ولد پریا۔ سائنس میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا۔
۲۳۴۔ شیخ حسین ولد محمد گیسو دراز سوم

خانگی امیدواران مرکز گلبرگہ شریف

۲۳۶- زیبا ولد تیجیا۔ صرف اردو۔ کامیاب۔

۲۴۱- شیخ احمد ولد محمد حفیظ۔ صرف ریاضی۔ کامیاب

۲۴۲- محمد احمد خاں ولد وزیر خاں۔ صرف ریاضی۔ کامیاب۔

نتیجہ امتحان معلمی اعلیٰ پرائمری

نام امیدوار معہ ولدیت

مدرسہ تعلیم المعلمات بلدہ

۱- خیر النساء بیگم بنت محمد یٰسین خاں اول

۲- رحیم النساء بیگم بنت محمد عبدالواحد اول

۳- رقیہ بیگم بنت سید اصغر حسین اول

۵- عائشہ بیگم بنت سالم بن احسن المہری اول

۶- کریم النساء بیگم بنت محمد عبدالرزاق اول

خانگی امیدواران

۷- خیر النساء بیگم بنت عبدالقدوس اول

۸- سیدہ پیاری بیگم بنت سید فضل اللہ شاہ قادری سال آئندہ علوم عامہ میں امتحان دینا ہوگا۔

ویسلین گرلز نارمل اسکول سکندرآباد

۹- جلا پریا۔ بنت جے ڈیوڈ۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۱۰- کرونا سنگھ بنت کرویا سنگھ۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۱۱- وینکٹ بنت وینکٹ رامیا دوم

۱۲- رجیا بنت سیمول۔ سال آئندہ صرف زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

مدرسہ تعلیم المعلمات ورنگل

۱۴- ایس کرشنا بنت اول

۱۵- جی سروجن بنت سبرانیم سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۱۶- دی مہالکشمی بنت دی پی راج۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۱۷- ڈی سرسوتی بائی بنت وینکٹ سوامی نائیڈو سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا

نتیجہ امتحان ادنیٰ پرائمری

نام معہ ولدیت

مدرسہ تعلیم المعلمات بلدہ

۱- محمودہ بیگم بنت عبدالواحد دوم

۲- شریفہ بیگم بنت سید حبیب علی۔ سال آئندہ اسباق الاشیاء میں امتحان دینا ہوگا۔

۴- سیدہ جمال بی بنت سید عبداللہ قادری۔ سال آئندہ فارسی میں امتحان دینا ہوگا۔

۵- شہزادی بیگم بنت سید امان اللہ حسینی اول

۶- عابد النساء بیگم بنت محمد شجاع الدین دوم

۷- زلیخا بیگم بنت محمد علی اول

۸- آمنہ بی بنت محمد میران۔ سال آئندہ زبان دوم فارسی میں امتحان دینا ہوگا۔

۹- کریم النساء بنت محمد عثمان۔ دوم

۱۲- کلثوم بی بنت محمد عباس علی سال آئندہ زبان دوم فارسی میں امتحان دینا ہوگا

۱۳- فاطمہ بی بنت محمد یعقوب دوم

۱۵- آمنہ بی بنت محمد امام الدین اول

خانگی امیدواران

۱۶- ہاجرہ بی بنت سید غضنفر علی۔ صرف ریاضی۔ کامیاب

۱۹۔ ریحانہ بی بنت محمد عبد الصمد۔ صرف فارسی۔ کامیاب۔

۲۰۔ فاطمہ بیگم بنت شیخ محمد بن احمد۔ سال آئندہ ریاضی میں امتحان دینا ہوگا۔

۲۲۔ لطیف النسا بیگم بنت محمد مجاہد الدین صرف فارسی کامیاب۔

۲۴۔ جانی بیگم بنت سید حسین آغائی۔ صرف فارسی۔ کامیاب

گرلز نارمل اسکول سکندرآباد

۲۶۔ گنگا بنت رنگیا نائیڈو۔ سال آئندہ صرف زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۲۸۔ آر۔ سانتی بنت موزس۔ سال آئندہ صرف زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۲۹۔ انندم بنت سائنا۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۳۱۔ کملا بائی بنت وینکٹ چلم۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۳۲۔ اے۔ پدما بائی بنت کلن۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۳۳۔ رابعہ بیگم بنت حاجی محمد قطب الدین۔ صرف ریاضی۔ کامیاب۔

۳۴۔ نور جہاں بیگم بنت غلام محمد۔ صرف ریاضی۔ کامیاب۔

خانگی امیدواران

مدرسہ تعلیم المعلمات مرہٹی اورنگ آباد

۴۱۔ گوداوری بائی بنت شنکر راؤ۔ سال آئندہ صرف زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

۴۲۔ لکشمی بائی زوجہ زسیون راؤ۔ صرف اردو۔ کامیاب

مدرسہ تعلیم المعلمات تلنگی ورنگل

۴۵۔ شنکرا بنت پی سائنا۔ سال آئندہ زبان دوم اردو میں امتحان دینا ہوگا۔

طریقہ تعلیم حساب

مصنفہ ڈی۔ سی۔ بھوگلے۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار فوقانیہ نام پلی۔

تعلیم حساب کے مقاصد مدارس تحتانیہ میں زبان دانی اور حساب یہہ دو مضامین زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور نظام الاوقات میں اسی لحاظ سے مضامین مذکورہ کے لئے زیادہ وقت رکھا جاتا ہے۔ حساب کی تعلیم بچوں کو دو مقصد سے دیجاتی ہے جو ذیل میں درج ہیں۔

(۱) دنیاوی کاروبار و بازاری لین دین میں حساب سے مدد ملے اور

(۲) حساب کی تعلیم سے بچوں کی قواء عقلیہ، تخیل اور استدلال وغیرہ کی تربیت ہو سکے مندرجہ بالا اغراض کو مدنظر رکھتے ہوے حساب کی تعلیم۔

(۱) بہ حیثیت فن۔ اور (۲) بہ حیثیت علم دینی چاہئے۔

حساب بہ حیثیت فن

چونکہ حساب کا استعمال روزانہ کاروبار و بازاری لین دین میں ہوا کرتا ہے۔ لھذا دنیاوی کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوے حساب کے اصلی طریقوں سے ناواقف رہنا کوئی بھی روا نہیں رکھے گا۔ اس مضمون کی ضرورت بہی کھاتہ رکھنے اس کی جانچ یا تنقیح کرنے یا فرد حساب تیار کرنے ہی میں نہیں ہوتی بلکہ تمام پیشوں مثلاً نجاری۔ خیاطی۔ معماری خانہ داری۔ وغیرہ میں۔ جو دنیا سے تعلق رکھتے ہیں پیمایش اور گنتی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

اگرچہ اس مضمون کی تعلیم محض دنیوی کامیابی کی غرض سے یا روٹی کمانے کی غرض سے دیجاتی ہے۔ پھر بھی بچوں میں سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرنے کی استعداد پیدا کرنی ہو تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے حساب کے اصول اس قدر واضح طور پر سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ زمانہ آیندہ میں اپنی حسابی واقفیت کا استعمال نئی نئی مشکلات کو رفع کرنے میں کر سکیں۔ الغرض بچوں کو اس مضمون کی تعلیم اس طرح دیجاے کہ وہ اپنے عمل کو خود سمجھکر دوسروں کو بھی واضح طور پر سمجھا سکیں اور دنیوی لین دین کے سوالات جلدی اور صحت کے ساتھ حل کر سکیں۔

حساب بہ حیثیت علم

حساب کی تعلیم سے دنیاوی فائدے کے ساتھ ساتھ بچوں کی عقلی تربیت بھی بہت کچھ ہوتی ہے سوال کا جواب صحیح ہے یا غلط اگر غلط ہو تو غلطی کہاں ہوئی یہ فیصلہ بچے اپنی قوت استدلال کو کام میں لا کر کرسکتے ہیں۔ حساب کی تعلیم سے طلبہ میں خیال جمانے کی عادت پیدا ہوسکتی ہے اس لئے ان کی قوت متخیلہ کی تربیت ہوتی ہے حساب میں بے شمار مثالیں حل کرنی ہوتی ہیں جن میں قوت متخیلہ کو کام میں لانا پڑتا ہے بچوں کی قوت استدلال کی تربیت اسی صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ بچہ کوئی چیز اپنی ذاتی کوشش سے دریافت کرے اور اصول کا استخراج کرسکے۔ سوال کے حالات سے پوری طور پر واقف ہو کر اس کے حل کے ذرایع اور طریقے معلوم کرسکے۔ حساب کی تعلیم میں بہ نسبت محصلہ معلومات کے طریقۂ حل زیادہ اہمیت رکھتا ہے نیز بہ نسبت واقفیت طریقہ تحصیل زیادہ اہم ہے

حساب اور زندگی کا باہمی تعلق

حساب کا تعلق روز مرہ کاروبار سے بہت کچھ ہے آدمی کی زندگی اس کا میلان طبع اس کے پیشہ کا انکشاف اس کی عملی میدان میں ترقی وغیرہ وغیرہ سے حساب کا تعلق ہوسکتا ہے اس مضمون کی تعلیم دینے میں بعض وقت مدرسین انسانی دلچسپیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اور اس مضمون کو خشک اور دقیق بناتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ میں حساب کے متعلق خوف پیدا ہوتا ہے اور اس خیال سے کہ یہ نہایت مشکل مضمون ہے گھبراتے ہیں نتیجے اکثر انھیں باتوں کو ٹھیک نظر سے دیکھتے ہیں۔ جن کا تعلق ان کی زندگی سے ہو اور جن سے وہ مانوس ہوں اور جو باعث دلچسپی ہوں لہذا اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مدرسین اپنے مضمون کو اس قدر دلچسپ بنائیں کہ طلبہ خود بخود اس مضمون کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب ہوں حساب کے اسباق میں دلچسپی پیدا کر کے طلبہ کو خود کوشش کرنے کا موقعہ بہم پہونچائیں۔ ان سے کام لیں ان کی ذاتی کوشش سے کوئی قاعدہ اخذ کرانے کی تجویز اختیار کریں اور کسی قدر ان کی ہمت افزائی کرتے رہیں۔

اگر حساب مناسب طور پر پڑھایا جائے اور اس میں دلچسپی پیدا کی جائے تو طلبہ کو یہ مضمون بے لطف کبھی نہ معلوم ہوگا۔ حساب کی تعلیم میں ناکامیابی کے اسباب اکثر غلط طریقہ تعلیم اور بچوں کی طبیعت سے عدم واقفیت یہی ہوسکتے ہیں۔ بچے عموماً کام کرنا پسند

کرتے ہیں۔ خالی بیٹھنا ان کو تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ حرکات کے خواستگار ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے کاموں میں وہ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ جس شخص نے بہترین مدارس میں بچوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے اس کا یہ خیال کبھی نہیں ہوگا کہ حساب کے اچھے نتائج نکالنے میں بچوں کا کوئی قصور رہا ہو۔

حساب کی تعلیم میں ناکامیابی کے اسباب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ابتدا میں غیر واجبی عجلت۔
۲۔ ناموزوں تحریص کا استعمال۔
۳۔ موزوں آلات تعلیمی کی کمی۔
۴۔ ناقص طریقہ تعلیم۔

غیر واجبی عجلت

ابتدائی جماعتوں میں جس قدر وقت اسباق کے سمجھانے اور مشق کرانے میں دینا چاہیے نہیں دیا جاتا۔ ایک بات بچوں کی سمجھ میں پوری طور پر آنے کے قبل ہی مدرسین ان کو دوسری بات سمجھانا چاہتے ہیں۔ اس عجلت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے گھبرا جاتے ہیں۔ اور مضمون حساب کو ایک نہایت مشکل مضمون سمجھ لیتے ہیں۔ بچہ جب گنتی سیکھتا ہے اور گنتی کرنے لگتا ہے تو جلدی کبھی اختیار نہ کی جائے۔ یہ ممکن ہے کہ جب بچہ ایک ایک چیز (گولی۔ بیج۔ پیسہ روپیہ وغیرہ) بار بار گنتا ہے تو مدرس کو بعض وقت پریشانی محسوس ہوتی ہوگی۔ لیکن بچے کے بار بار گننے سے مدرس یہ سمجھے کہ گنتی کا یقین کر لینے کی غرض سے یا اپنے کام کا اطمینان کر لینے کی نیت سے بچہ متعدد بار گننا ضروری سمجھتا ہوگا۔ ایسی صورت میں اس پر غصہ ہونا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ عجلت سے پختگی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ ناموزوں تحریص کا استعمال

بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے یا ان کو کام کرنے کی ترغیب دینے کی غرض سے اگر کوئی تدبیر سوجھی ہو تو اس وقت مدرس اس بات کا خیال رکھے کہ ذہین بچوں کے مقابلہ میں کند ذہن بچوں کے قوائے کو نہ دبایا جائے کیونکہ کند ذہن بچوں کے قوای کو

دبانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پست ہمت ہوں گے۔ اور حساب میں جی نہ لگائیں گے۔ چند چھوٹے بچے آہستگی سے ترقی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بالکل صبر سے کام لیا جائے۔ ان پر غصہ کرنے سے یا ان کو تنبیہ کرنے سے وہ ہمت ہار دیں گے۔ اور ان میں خود اعتمادی نہیں رہیگی اور بعد میں دلچسپی پیدا کرنا۔ اور ان سے سوالات حل کرانا محال ہوگا۔

۳۔ آلات تعلیمی کی کمی

ابتدا میں مجرد اعداد کا تصور دلانے کے لئے یا نیا قاعدہ بتانے کے لئے اشیا محسوسہ کا استعمال کرنا سخت ضروری ہے محض لفظی معلومات بچوں کے ذہن میں ٹھیک طور پر نہیں اتر سکتے مقرون اشیاء کی مدد سے اور بچوں کے ذاتی تجربہ سے نئی بات ان کی سمجھ میں جلد آجاتی ہے شروع میں گنتی سکھانے کے لئے مختلف اشیاء کا استعمال کیا جائے۔ صرف یہ زبانی کہنا کہ ایک کا ہندسہ '۱' ایسا لکھتے ہیں دو کا ہندسہ '۲' ایسا لکھتے ہیں کافی نہیں ہوسکتا۔ اس سے بچوں کی دماغی تربیت تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اور نہ مجرد اعداد کا تصور ہی ہوگا۔ اعداد کا تصور دلانے کے لئے پہاڑے سکھاتے وقت۔ نیا قاعدہ بتاتے وقت۔ یا کسی مشکل کو حل کرنے کے لئے مقرون سے مجرد کی طرف جانے کا اصول اختیار کیا جائے تو بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مقرون اشیاء سے کام لینے کے لئے بہت سے سامان کی ضرورت پڑتی ہے مدرس سامان نہ ملنے کی وجہ سے سبق کو خراب نہ کرے بسیدھا سادہ خود ساختہ سامان بازاری قیمتی اشیاء کی بہ نسبت زیادہ موثر ہوتا ہے مٹی کی گولیاں ریتھے اناج کے دانے بیج وغیرہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ناقص طریقہ تعلیم

بعض وقت ناموزوں طریقہ اختیار کرنے سے اکثر طلبہ کی دلچسپی رخصت ہوجاتی ہے۔ وقت واحد میں بہت سا پڑھانے سے کسی قاعدہ کا کافی تصور دلائے بغیر اس کو حفظ یا یاد کرانے سے کوئی بات ذہن نشین نہیں ہوسکتی بچے حیران ہوتے ہیں۔ اور آخر میں سست اور کاہل بن جاتے ہیں۔ کسی اصول یا قاعدہ کو ٹھیک طور پر سمجھے بغیر بچے رٹنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی دماغی تربیت مٹی میں مل جاتی ہے۔ سوالات کی ناموزوں ترتیب بھی حساب کی تعلیم میں ناکامیابی کا سبب ہوسکتی ہے۔

لہذا مشقی سوالات کی ترتیب نہایت احتیاط کے ساتھ کرنی چاہئے۔

حساب کی اہمیت

حساب کو بہ حیثیت فن وعلم جدا کرنا مشکل ہے کیونکہ عقلی تربیت جو آیندہ زندگی کے لئے ضروری سمجھی گئی ہے۔ دنیوی فوائد میں شمار ہو سکتی ہے حسابی تعلیم سے بچوں میں صفائی اور خود اعتمادی پیدا کی جا سکتی ہے۔ علم حساب اس قدر اصلیت رکھتا ہے کہ اس کی نسبت کسی زمانہ میں کسی ملک کو شک وشبہ نہیں ہوا۔ اور نہ اس کی اصلیت میں کچھ تغیر ہو سکا۔ ۴+۵=۹ یہ بات ہر جگہ اور ہر زمانہ میں قائم تھی۔ قائم ہے اور قائم رہے گی۔ اس میں کچھ تبدیلی نہ ہوگی حساب کی اہمیت کو پیش نظر رکھکر اس مضمون کی تعلیم بچوں کو نہایت احتیاط سے دینی چاہئے۔

مدارس تحتانیہ کے لئے حساب کا معمولی نصاب

تحتانیہ مدارس میں حساب پڑھانے کا مدعا اوپر بیان کیا گیا ہے کہ طلبا روزمرہ کے لین دین کے سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کر سکیں۔ روزمرہ کے کام میں عام طور پر معمولی شخص کو مندرجۂ ذیل باتوں کا جاننا ضروری ہے کیونکہ ان سے ہمیشہ کام پڑتا ہے۔

۱۔ سکے مثلاً پیسے۔ آنے۔ روپیے وغیرہ۔

۲۔ وزن مثلاً۔ تولہ۔ چھٹانک۔ پاؤسیر۔ سیر پسیری۔ من وغیرہ۔

۳۔ ناپ کے پیمانے انچ، فیٹ۔ گز وغیرہ

۴۔ وقت کے پیمانے۔ مثلاً۔ سکنڈ۔ منٹ۔ گھنٹہ۔ دن۔ ہفتہ۔ وغیرہ۔

ہر موقعہ پر جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم کے عمل کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے چاروں ابتدائی قاعدے اور پہاڑوں کا جاننا ضروری ہے۔ مکان۔ زمین۔ یا دیگر اشیاء کا طول۔ عرض۔ بلندی وغیرہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پیمائش کا جاننا ضرور ہے۔ روپیوں کے لین دین کے لئے سود کے قاعدہ کی واقفیت ہونی چاہئے۔ عام طور پر معمولی مرکب وکسر کے قاعدے بھی جاننا ضروری ہے۔ مندرجہ بالا امور کی واقفیت سے معمولی طور پر ہر ایک شخص کا کام چل سکتا ہے۔ اس لئے تحتانیہ مدارس میں چار ابتدائی قاعدے مرکب قاعدے کسر کے قاعدے۔ پڑھائے جائیں۔ باقی قاعدے انہی چار قاعدوں پر مبنی ہیں۔

پختہ بنیاد کی ضرورت

طلبہ کو سب سے زیادہ مشکل ابتدائی چار قاعدوں کے سیکھنے میں پیش آتی ہے۔ ان قاعدوں کی مشق اگر کافی اور پختہ طور پر ہو تو دیگر قاعدوں کا سیکھنا آسان ہوتا ہے ابتدائی چار قاعدے علم حساب کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ بنیاد پختہ ڈالی جائے تو اس پر جو عمارت تعمیر ہوگی وہ بھی مضبوط اور مستحکم ہوگی ابتدائی قاعدوں کی نسبت مرکب قاعدوں کا تصور دلانا آسان ہے۔ حساب میں سخت محنت کی ضرورت ہے۔ پیمانے و پہاڑے یاد کرانے ہوتے ہیں۔ بچوں سے سوال کے جواب عجلت اور صحت کے ساتھ نکلوانے ہوتے ہیں۔ لہذا روزانہ باقاعدہ دس منٹ بھی اس کام کے لئے مختص کئے جائیں تو بچوں میں دلچسپی کے ساتھ کام کرنے کا مادہ پیدا ہوگا اور بنیاد پختہ پڑے گی۔

عام اصول جو تعلیم کے وقت پیش نظر رہیں

حساب میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ مقروں سے مجردات کی طرف چلو۔

ابتدا میں بچے مجرد اعداد کا تصور نہیں کر سکتے ان کو مجرد اعداد کے متعلق مقرون اشیاء کی مدد سے معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ مثلاً دو آم۔ دو پیسے۔ دو پیڑے۔ دو گولیاں وغیرہ اشیا محسوسہ کے ذریعہ دو کا تصور دلایا جائے۔

۲۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف چلو۔

بچوں کے سابقہ علم کی بنیاد پر نئے علم کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ تو بچوں کو کسی قسم کی مشکل محسوس نہیں ہوتی۔ مرکب قاعدوں کی تعلیم دیتے وقت مفرد قاعدوں سے مدد لو۔ دونوں میں اصول ایک ہی ہیں فرق صرف پیمانوں میں ہے۔

۳۔ تدریج کا خیال رکھو۔

سبق مختلف درجوں میں تقسیم کرو۔ آسان باتیں ابتدا میں بتائی جائیں مشکل بعد میں۔ مثلاً جمع کے سوالات بتانے ہوں تو پہلے جمع بلا حاصل کے سوالات دیئے جائیں۔ بعد میں اکائی اور دہائی کی جمع با حاصل بتائی جائے۔

۴۔ ہر ایک قاعدہ کی تفہیم میں استقرائی طریقہ کو کام میں لاؤ۔ خاص خاص مثالوں کے

ذریعہ عام اصول قائم کرو۔ بعد میں اصول سے قاعدہ کی طرف چلو۔ چھوٹی چھوٹی مثالیں پیش کر کے طلبا کی کوشش سے ہی قاعدہ اخذ کراؤ کیونکہ تربیت ذاتی کوشش وسعی سے ہی ہوا کرتی ہے

۵۔ ہر ایک قاعدہ صاف صاف اور کھلے الفاظ میں سمجھاؤ تاکہ طلبا بغیر کسی مدد کے خود سوال نکال سکیں۔ دوسروں کی نقل اتارنے کی ضرورت ان کو محسوس نہ ہو۔

۶۔ ابتدا میں زبانی سوالات سے کام لو۔

تقریری حساب کوئی الگ مضمون نہیں ہے۔ ہمیشہ تحریری حساب سے پہلے چند منٹ تقریری حساب کے لئے دئے جائیں ہر دو کی مشق ساتھ ساتھ کرائی جائے۔

۷۔ بچوں کی ذہنیت و شخصیت کا خیال رکھو۔

بعض بچے قاعدہ سمجھ سکتے ہیں۔ بعض کمزور لڑکوں کو کئی دفعہ سمجھانے کی ضرورت ہوتی لہذا ان کو برا بھلا مت کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ گھبرا جائیں اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔

۸۔ جب تک ایک ایک بات سمجھ میں نہ آجائے دوسری شروع نہ کرو۔ ورنہ بچے کسی کو بھی ٹھیک طور پر نہیں سمجھیں گے۔ اور پریشان ہوں گے۔

۹۔ سوالات کو سوچنے کے لئے کافی وقت دو۔ ایسا نہ ہو کہ بچے عبارتی سوالات میں بغیر سوچے سمجھے کچھ نہ کچھ عمل کرنے لگیں۔

۱۰۔ سوالات کے حل کرنے میں طلبہ کو صحت وصفائی ترتیب وسرعت عمل وغیرہ پر حاوی ہونا چاہئے صحت کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کامل ہو۔ صفائی کے لئے ہندسے خوبصورت ہوں۔ مدرس کے اپنے ہندسے اچھے ہوں سرعت کے لئے پہاڑے اچھی طرح یاد کراؤ۔

عام طور پر حساب کے کسی قاعدے کے سبق کا خاکہ حسب ذیل ہوتا ہے۔

۱۔ تمہید۔ زبانی مثالیں۔ اول مقرون بعد مجرد پیش کرو۔ مثالیں قاعدہ کی توضیح کرنے والی ہوں۔ زبانی سوالات میں چھوٹے چھوٹے اعداد استعمال میں لائے جائیں۔ سولات مذکور میں جانی پہچانی چیزوں کا ذکر ہو۔

۲۔ قاعدہ کی دریافت۔ اوپر کی زبانی مثالوں کی مدد سے بچوں کی ذاتی کوشش سے قاعدہ اخذ کرایا جائے۔

۳۔ نمونہ کی مثال جو قاعدہ طلبہ کے ذہن میں سرسری طور پر آیا ہو۔ اسی قاعدہ کے ذریعہ یہ مثال حل کراؤ۔ اس میں مدرس بچوں کی رہنمائی کرے۔ اور بعد میں سوال کا حل تختہ سیاہ

بچوں کو نمونہ کے لئے بتا دے۔

۴۔ قاعدہ۔ سوال کے حل کے پورے عمل پر نظر ثانی کر کے بچوں سے قاعدہ نکلوایا جائے

۵۔ مشق۔ چند سوال قاعدہ کو ذہن نشین کرانے کی غرض سے طلبہ سے حل کراؤ سوالات پہلے ہی سے سوچ سمجھکر مرتب کئے جائیں۔

حساب کی اہمیت و فوائد۔

علم حساب یہہ ریاضی کی ایک شاخ ہے مگر سب شاخوں سے زیادہ مفید اور اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی زندگی آسانی کے ساتھ بسر کرنے کے لئے جو ذرایع درکار ہیں ان میں حساب بھی ایک ذریعہ ہے نیز انسانی زندگی میں جو اہمیت حساب کو حاصل ہے اس سے کوئی بھی انکا نہیں کر سکتا ہم دنیا میں جہاں کہیں جائیں۔ ہر جگہ حساب سے کام پڑتا ہے حساب میں روز مرہ زندگی سے متعلق اس قدر کثیر التعداد نظیریں اور مثالیں موجود ہیں جن کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کسان معمار۔ لوہار۔ دوکاندار۔ انجنیر۔ سائنس دان۔ غرض کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی صورت میں حساب کا محتاج نہ ہو۔

اس علم کے سیکھنے سے انسان کو بیشمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ حساب سے اندھی تقلید کا مادہ کم ہوجاتا ہے۔

۲۔ حساب سیکھنے سے لین دین کے سوالات حل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۳۔ علم حساب تحقیق و تفتیش کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

۴۔ حساب کی تعلیم سے خود اعتمادی اور استدلال جیسی صفات محمودہ پیدا ہوتی ہیں۔

۵۔ حسابی معلومات جس قدر وسیع ہوتی جائیں گی اس قدر دائرہ تحصیل وسیع ہوتا جائیگا

مدرس صاحب کے اوصاف

چھوٹے چھوٹے بچوں کو گنتی سکھانے کا کام بہت مشکل ہے اس لئے ان کی تعلیم میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ تجربہ کار اور ہوشیار مدرس ہی چھوٹے بچوں کو اعداد شناسی کی تعلیم دے سکتا ہے۔ صبر کے ساتھ کام لینا ضروری ہے۔ مدرس ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئے۔ اور کھیلتے کھیلتے مختلف چیزیں بتاکر بتدریج گنتی سکھائے غصہ والا اور چڑچڑا استاد صغیر عنایت

کیلئے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا بچے خاموش اور بیکار بیٹھنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ حرکات کے خواستگار ہوتے ہیں لہذا کام کرنے کے لئے اور کھیلتے کھیلتے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے واسطے کھلا میدان رکھا جائے۔ سبق کی اہمیت محض معلومات بہم پہونچانے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ سبق کی اہمیت معلومات کو عملی جامہ پہنانے کی استعداد پیدا کرنے میں مضمر ہے بچوں کی زبان سے۔ صرف۔ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ سن لینا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ اعداد جانتے ہیں۔ بہت سے بچے تقلیدی طور پر استاد سے یا دیگر بڑے اشخاص سے سن سن کر بھی علاوہ کے نام۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ وغیرہ یاد رکھ سکتے ہیں۔ اعداد کا تصور بچوں کو اس وقت ہوگا جب کہ تین گولیاں۔ چار کاڑیاں۔ سات پیسے گن کر بتاسکیں۔ یا چیزوں کی تعداد ٹھیک طور پر بتاسکیں۔

حساب کے مدرس کو حساب کے اصول و قاعدوں سے واقف ہونا ضروری ہے اس کو طریقہ تعلیم حساب سے بھی واقفیت رکھنی چاہئے علاوہ اس کے مدرس ملنسار بھی ہو صبر سے کام لے بچوں کی مزاج سے واقف ہو۔ تاکہ بچوں کے ساتھ رحم دلی سے پیش آکر ان کو تعلیم دے سکے

اعداد شناسی

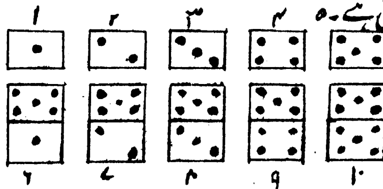
اوپر بیان ہوچکا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو حساب کی تعلیم مقروں اشیاء کے ذریعہ دیجائے۔ پس گنتی سکھانے کے اسباق میں مختلف اقسام کی چیزیں مثلاً گولیاں (بالفرم)۔ تیلیاں۔ مکعب۔ کوڑیاں۔ بیج۔ وغیرہ استعمال میں لائی جائیں۔ ذاتی تجربہ سے اور استاد کی رہنمائی سے بچے گنتی کی تعلیم حاصل کریں۔ بچوں کو گنتی سکھانے میں ان کی قوت باصرہ و قوت لامسہ ہر دو سے کام لیا جائے۔ تاکہ ذاتی تجربہ سے نئی بات معلوم کرسکیں مندرجہ بالا اشیاء اور تاش گنتی سکھانے میں بہت کارآمد ہوں گے۔

۱ سے ۹ تک کی گنتی

ایک سے نو تک کے اعداد کا تصور دلانے میں بہت سے اسباق مرتب کرنے ہونگے بہ نسبت اسباق کی اسکیم مرتب کرلینے کے استاد کی ذاتی تدبیر اور مہارت زیادہ کارگر ہوسکتی ہے۔ مدرسہ میں آنے کے پیشتر ہی بچے چند ہندسوں کے نام سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ

ان کو اس عدد کا صحیح تصور نہیں ہوتا۔ مختلف کھلونے، میوہ، مٹھائی، وغیرہ کو ہاتھ میں لیکر ان کی طرف بار بار دیکھکر اس قسم کے جملے مثلاً۔ ایک لٹو لاؤ۔ دو آم دو۔ تین پیڑے دو وغیرہ۔ اسی طرح گولیوں، گیند، وغیرہ سے کھیلتے کھیلتے چند اعداد سے بچے واقف ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ ایک۔ دو۔ تین وغیرہ مجرد اعداد کا خیال ان کو مطلق نہیں ہوتا جس طریقہ سے بچے مکان میں اعداد گننا سیکھتے ہیں۔ وہی طریقہ گنتی کے اسباق کے لئے مدرس بھی اختیار کرے الغرض اعداد اور ہندسوں کی تعلیم مقروں اشیار کی مدد سے ہی ہو بجائے البتہ رنگین و دلکش چیزوں کا استعمال نہ کیا جائے۔ ورنہ بچوں کی توجہ بہ نسبت تحصیل سبق کے زیادہ تر چیزوں کے دیکھنے کی طرف ہی لگی رہے گی۔ گنتی سکھانے کے اسباق بالکل چھوٹے چھوٹے ہونے چاہئیں۔ ابتدا میں زیادہ سے زیادہ (۲۰) منٹ تک سبق دیا جائے۔ زیادہ دیر تک بچے متوجہ نہیں رہ سکیں گے۔

اگرچہ بچے مدرسہ میں داخل ہونے سے پیشتر اعداد کے چند نام جانتے ہیں۔ پھر بھی مدرسہ میں آنے کے بعد اُن اعداد کا صحیح تصور دلانا ضروری ہے۔ ایک سے ۹ تک کے اعداد کا تصور دلانے میں زیادہ وقت صرف کرنا ہوگا عجلت مفید ثابت نہ ہوگی۔ ابتدا میں چھوٹے بچے کسی عدد کو مجموعہ کی طور پر نہیں دیکھتے بلکہ صرف مقام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ جب وہ تین چیزوں کو گنتے ہیں تو پہلی مرتبہ اٹھائی ہوئی چیز کو ایک دوسری مرتبہ اٹھائی ہوی چیز کو دو اور تیسری مرتبہ اٹھائی ہوی چیز کو تین کہتے ہیں گویا۔ ایک دو تین وغیرہ خاص چیزوں کے نام ہیں۔ نادانی کی وجہ سے بچوں کا اعداد کا تصور زیادہ تر صفاتی ہوتا ہے۔ پس استاد کو چاہئے کہ گنتی سکھاتے وقت مختلف اشیار کی مدد سے یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی جائے۔ کہ دو تین چار۔ پانچ وغیرہ۔ چیزوں کا مجموعہ ظاہر کرتے ہیں۔ بچوں کو یہ بات واضح طور پر سمجھائی جائے کہ دو تین، چار وغیرہ سے دوسری تیسری اور چوتھی چیز نہیں ہے۔ چیزوں کا مجموعہ بچوں کے سامنے رکھنے سے بچوں کی غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔



ایک کا تصور

مدرس مختلف چیزیں پیش کرکے بچوں سے ان کے نام دریافت کرے مثلاً تیلیاں قلم۔ کوڑیاں پر مکعب۔ گولیاں وغیرہ اسی قسم کی چیزیں بچوں کے سامنے رکھدیجائیں۔ اور ہر ایک چیز کا نام ان سے دریافت کیا جائے۔

مدرس ایک گولی اٹھائے اور طلبہ سے بھی یہی عمل کرائے۔ مدرس خود کہے اور بچوں سے کہلوائے کہ یہ ایک گولی ہے۔ اسی طرح مختلف چیزیں پیش کرکے چیزوں کے ساتھ تعلق دیکر ایک 'کا تصور دلایا جائے۔ یہی عمل کوڑی قلم۔ مکعب وغیرہ کا استعمال کرکے مدرس خود کرے اور بچوں سے تقلید کرائے۔ بعد میں بچوں سے حسب ذیل سوالات کئے جائیں کہ تمہارے کتنے سر ہیں۔ ناک کتنی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

عدد ایک کا پختہ تصور ہونے کے لئے ان کے سامنے پڑی ہوی چیزوں میں سے 'ایک' گولی اٹھاؤ۔ "ایک" کتاب لاؤ وغیرہ عملاً بچوں سے کرایا جائے۔ بعد میں "ایک" وقت دوڑو۔ "ایک" مرتبہ کودو وغیرہ حرکات سے کام لیا جائے۔ اس طرح سبق دینے "ایک" کا تصور بچوں کو اچھی طرح ہوگا۔ زیادہ مشق کے لئے مندرجہ ذیل قسم کا کام بچوں سے کرایا جائے۔ تختہ سیاہ پر 'ایک' نقطہ لگاؤ۔ 'ایک' لکیر کھینچو اپنی تختی (سلیٹ) پر "ایک" خط بناؤ۔ وغیرہ۔

اسی طرح دو کا تصور مندرجہ بالا یا دیگر اشیاء کی مدد سے دلایا جائے۔ جب تک کہ اعداد کا تصور کافی طور پر بچوں کے ذہن میں نہ ہو۔ اعداد نویسی بتانے کی ضرورت نہیں ورنہ اعداد نویسی اور اعداد شناسی میں بچے صحیح طور پر تمیز نہیں کر سکیں گے۔ "ایک" کا پختہ تصور دلانے کے بعد ایک کا ہندسہ '۱' ایسا لکھتے ہیں یہ ان کو بتایا جائے۔ دو کا تصور ٹھیک طور پر ہوجانے کے بعد 'دو' کا ہندسہ '۲' ایسا لکھتے ہیں بتایا جائے۔ اور اس کی ترکیب بتائی جائے۔ اور ان کی سلیٹ پر انھیں سے ہندسہ بنوایا جائے۔

اعداد نویسی

اعداد کی شناخت ان کے نام و نشان

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ مدرسہ میں داخل ہونے کے پیشتر سے بچوں کو ہندسوں کے نام کسی قدر معلوم رہتے ہیں۔ اعداد کے بے ترتیب الفاظ مثلاً۔ ایک۔ دو۔ پانچ۔ سات بارہ وغیرہ بہت سے بچے زبان سے کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ ان کو اعداد کا صحیح تصوّر نہیں ہوتا مدرسہ میں آنے کے بعد اس نامکمل تصوّر کو واضح اور پختہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرأت وکتابت اعداد کے سبق کے مدارج

کسی عدد کی قرأت وکتابت کی تفہیم میں حسب ذیل مدارج مدنظر رکھے جائیں۔

ا۔ چیزوں کی گنتی کرانا۔ اور بعد میں ان چیزوں کے مجموعہ کو خاص نام سے مربوط کرنا۔ مثلاً۔ تین گولیاں لاؤ۔ چار تیلیاں الگ کرو۔ وغیرہ۔

ب۔ بچوں کو چند چیزیں دے کر انہیں سے ان چیزوں کی تعداد معلوم کرانا

ج۔ چند چیزیں دے کر ان میں اور چند چیزیں جمع کرنے کے لئے یا ان میں سے چند چیزیں گھٹانے کے لئے کہنا اور ان کی گنتی معلوم کرانا۔ مثلاً مدرس بچوں کو پانچ گولیاں دے اور ان کو کہے کہ اور دو گولیاں ان میں ملاؤ۔ یا ان میں سے دو گولیاں گھٹاؤ اور کل گولیوں کی تعداد معلوم کرو۔ اسی تعداد کو ہندسوں کے ذریعہ ظاہر کرنا۔

ترتیب اعداد

بچوں کو اعداد کا تصوّر اور ان کی شناخت کافی طور پر ہونے کے بعد مختلف چیزوں کے مجموعہ کے نام ان سے دریافت کئے جائیں۔ اور ان اعداد کی کوئی خاص ترتیب بتائی جائے حسب رائے ڈاکٹر مانٹسری صاحبہ۔ یہ ترتیب اعداد عمودی طور پر دو دو کے مجموعہ میں ظاہر کیجائے جو ذیل میں درج ہے۔

ڈاکٹر مانٹسوری صاحبہ کی ترتیب سلسلہ اعداد۔

اس ترتیب سے بچوں کو اعداد کا سلسلہ معلوم ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بچے یہ بھی معلوم کرسکیں گے کہ قبل کے عدد میں ایک زیادہ کرنے سے نیا عدد بن سکتا ہے۔ اس ترتیب سے جفت اور طاق اعداد کی شناخت جلد ہو سکتی ہے۔

ولنبنٹ صاحب (Wellent) کی ترتیب اعداد

ولنبنٹ صاحب مندرجہ ذیل ترتیب پسند کرتے ہیں۔

○	○ ○	○ ○ ○	○ ○ ○ ○	○ ○ ○ ○ ○	○○○ ○ ○○	○○○ ○ ○○○	○○○○ ○ ○○○	○○○○ ○ ○○○○
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
							۱۰ }	○○○○ ○ ○ ○○○○

یہ ترتیب پانچ پانچ کے مجموعہ کے لحاظ سے بنائی گئی ہے۔ اس ترتیب کا اصول یہ ہے کہ

ا۔ جلد شناخت کے لئے یہ ترتیب زیادہ اچھی ہے۔ بچے آسانی سے ۴ کا مربع اور پانچ کا مجموعہ معلوم کرسکتے ہیں اور ایک دوسرے میں تمیز بھی آسانی سے کرسکتے ہیں۔

ب۔ یہ ترتیب سلسلہ اعداد کو زیادہ واضح طور پر ظاہر کرسکتی ہے۔ ماقبل کے عدد میں صرف ایک زیادہ کرنے سے بعد کا جدید عدد بن سکتا ہے۔ اور پہلی ترتیب کو بگاڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

ج۔ ہر ایک عدد ۱۰ سے کس قدر کم یا زیادہ ہے ترتیب مذکور سے جلد معلوم ہوسکتا ہے

د۔ پانچ پانچ کے جمع یا تفریق پانچ کا پہاڑہ۔ پانچ کی تقسیم صاف طور پر واضح کی جاسکتی ہے لہذا جلد شناخت اور مشق کے لئے یہ ترتیب ہمیشہ استعمال میں لائی جائے تو مناسب ہوگا۔

۵۔ کی قرأت و کتابت

کسی عدد کا تصور دلانے میں حسب ذیل مدارج ہو سکتے ہیں اگر ۵ کا تصور دلانا ہو تو۔

۱۔ پہلے ۴ چیزوں مثلاً گولی تیلیاں۔ بیج۔ کوڑیاں وغیرہ۔ لے کر ان کی تعداد بچوں سے دریافت کی جائے۔ یا ان کو چند چیزوں میں سے ۴ چیزیں الگ نکالنے کے لئے کہا جائے۔ یا اعدادی تختہ میں سے ۴ کی شناخت کرائی جائے۔ اور بچوں سے چار کا ہندسہ لکھوایا جائے۔

۲۔ بعد اس کے چار چیزوں میں ایک چیز اور زیادہ کی جائے۔ بچوں سے بھی یہی عمل کرایا جائے گا۔ اور جدید مجموعہ کی تعداد بچوں سے دریافت کی جائے گی۔ ممکن ہے کہ کوئی بچہ صحیح تعداد پانچ بتا سکے ورنہ صحیح جواب نہ ملنے کی صورت میں مدرس خود بتائے کہ یہ جدید مجموعہ پانچ چیزوں کا ہے

۳۔ اس کے بعد مدرس بچوں سے پانچ پانچ چیزوں کے ڈھیر بنوائے گا۔

۴۔ بچے اپنی سلیٹوں پر ۵ لکیریں ||||| ۵ نقطے ∴∵ پانچ گول شکلیں ⁘ بنائینگے

۵۔ پانچ مرتبہ یا پانچ دفعہ کا تصور دلانے کے لئے بچوں سے کہا جائے گا کہ وہ پانچ مرتبہ کودیں۔ پانچ مرتبہ دوڑیں۔ پانچ دفعہ ہاتھ اوپر اٹھائیں وغیرہ تاکہ ان کی حرکات کی وجہ سے ان کو سبق دلچسپ معلوم ہو۔ یہ سبق ایک روز کے لئے کافی ہوگا۔ ۵ کے ہندسہ کی شکل بتانیکا سبق دوسرے روز دیا جائیگا۔

دوسرے روز سابقہ واقفیت میں پانچ کی گنتی کا اعادہ کیا جائے گا۔ اور بعد پانچ کا ہندسہ لکھنے کا طریقہ بتایا جائے گا۔ تختہ سیاہ پر ۵ کا ہندسہ موٹے پیمانہ پر لکھا جائے تاکہ بچے دور سے بھی اس ہندسہ ۵ کی صورت و شکل اور اس کی ترکیب کو آسانی سے دیکھ سکیں ہندسہ کی صورت و شکل بچوں کے دل پر نقش کرانے کے لئے قوائے باصرہ و لامسہ کو کام میں لایا جائے۔ تختہ سیاہ پر ۵ کا ہندسہ لکھنے پر بچوں کو اس کی بناوٹ معلوم کرانے کے لئے ایسے تاش پیش کئے جائیں جن پر ۵ کا ہندسہ موٹے قلم سے واضح طور پر بنایا گیا ہو تاکہ بچہ اس ہندسہ پر ہاتھ پھیر کر اس ہندسہ کی ترکیب و بناوٹ معلوم کریں۔ تاش پر لکھے ہوئے اور تختہ سیاہ پر بنائے ہوئے ہندسہ میں کافی مشابہت ہونی چاہئے۔ ہاتھ پھراتے وقت بچوں کی توجہ زیادہ تر ہندسہ مذکور کی شکل و بناوٹ کی طرف مبذول کرائی جائے۔ بعد میں وہی شکل ریتی یا مٹی پر بچوں کے ہاتھ سے بنوائی جائے۔ بیج۔ کوڑیاں۔ دانے وغیرہ ترتیب وار رکھکر

وہی شکل بچوں سے بنوائی جائے اس طرح ہندسہ کی شکل کا تصور بچوں کو پختہ طور پر ہو جائیگا آخری ہیں وہی ۵ کا ہندسہ بچوں کی سلیٹوں پر انھیں سے لکھوایا جائے اعدادی نقشہ Number Chart میں ۵ کا ہندسہ بنانے کے لئے کہا جائے۔ مختلف ہندسوں کے تاش ان کے سامنے رکھ کر ان میں سے '۵' کا تاش الگ کرنے کے لئے بچوں سے کہا جائے۔ اس طرح پانچ کی قرأت وکتابت کا سبق بچوں کو دیا جائے۔

اعداد کا تصور پختہ طور پر دلانے کے بعد ان کے اجزائے ترکیبی بھی بچوں سے انہی کی کوشش سے اور ان کے ذاتی تجربہ سے اخذ کرائے جائیں۔ اجزائے ترکیبی Composite Numbers کا تصور دلانے میں سبق کے مدارج حسب ذیل ہوں گے مثلاً

۵ کے اجزار ترکیبی بچوں سے یوں اخذ کرتے ہیں

۱۔ دفعہ اول عمل بذریعہ اشیار محسوسہ۔

گولیاں تیلیاں۔ بیج وغیرہ جیسی چیزیں بچوں میں تقسیم کئے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ ۵ گولیاں ۵ تیلیاں ۵ بیج الگ کرو۔ اور باقی چیزوں کو دور رکھدو۔ بعد میں بچوں سے کہا جائے کہ ان ۵ گولیوں میں سے ۲ گولیوں کا ایک ڈھیر بناؤ۔ ۵ تیلیوں میں سے ۲ تیلیوں کا ایک ڈھیر بناؤ وغیرہ اب ان سے یہ بات دریافت کی جائے۔کہ ایک ڈھیر دو چیزوں کا بنا باقی چیزیں کتنی رہیں؟ باقی چیزیں ان سے گنوائی جائیں اور مندرجہ ذیل باتیں اخذ کرائی جائیں۔

۲ گولیاں اور ۳ گولیاں مل کر ۵ گولیاں ہوتی ہیں

۲ تیلیاں اور ۳ تیلیاں ملکر ۵ تیلیاں ہوتی ہیں

پھر پانچ گولیاں (تیلیاں وغیرہ جو چیزیں پیش کی ہوں) ایک جگہ کرنے کے لئے کہا جائے اور ان میں سے تین چیزوں کا ایک ڈھیر بنانے کے لئے کہا جائے اور باقی چیزوں کی تعداد دریافت کی جائے اور بذریعہ سوال وجواب حسب ذیل نتیجہ اخذ کیا جائے۔

۳۔گولیاں اور دو گولیاں ملکر ۵ گولیاں ہوتی ہیں۔

اسطرح ۴۔گولیاں اور ایک گولی ملکر ۵ گولیاں ہوتی ہیں

۱۔ گولی اور چار گولیاں ملکر ۵ گولیاں ہوتی ہیں۔وغیرہ

"The Elements of Algebra"

BY

N. PANCHAPAGESHA AIYAR, B. A., L. T.

Published by Messrs. Srinivas Varadachari & Co., Madras. Pages 501, Price Rs. 2/-

---

ORIGINALLY the book was the result of the combined efforts of three experienced mathematicians. In revising the book Mr. N. Panchapagesha Aiyar, B. A., L. T., has tried to bring it into line with the syllabus for Optional Mathematics in the Madras and Mysore S. S. L. C. schemes. The book also satisfies the requirements of the Optional Mathematics course prescribed for the H. S. L. C. Examination in our State. The gradation of examples is quite satisfactory and they are based on the principle "from Simple to Complex". The chapters are arranged on "The Concentric System" of treating a subject, where extensivity and intensivity are both duly considered.

It is a very careful work, satisfactory from the point of treatment, get-up, figures, and printing. The treatment is lucid and accurate, while the examples are well-chosen. The Examination papers at the end of the book have been brought up to date. The book is well adapted for the use of the secondary school students and it is one of the best books that can be put in the hands of the students of Mathematics.

D. C. BHOGLE

The chapters dealing with the methods of teaching reveal the thoroughness with which Germany has sought out and applied to her particular needs the technique of teaching. One notes the emphasis on the cultural idea as opposed to the utilitarian, while the self-activity principle is seen to be latent throughout. The latitude given to teachers in handling their subjects is also conspicuous. The same change of emphasis applies to Inspections; the Inspector is no longer a bureaucrat as of old, but an adviser and a friend.

The Physical Education and Child Welfare chapters show how seriously Germany has taken up this problem, imperative to her in view of the physical deterioration consequent on the Great War, and show the success she has achieved in arresting the physical decline of her people. The account also of the Wandervögel (Wandering Birds) or Youth Movement is most interesting and stimulating.

The book is well got up. The Charts and Appendices setting forth graphically the organisation of the schools, their proportionate numbers, hours, subjects, etc. bear the imprint of the author's thoroughness and are elucidating and useful, and similarly the illustrations of the actual work in progress.

One value of the book, it seems to us, is to be found in the incidental comments and inferences the author frequently makes regarding the applicability of the methods of German Education to India, and the last chapter is most suggestive from this point of view. Indeed it is just here that the value of the book is most apparent, for if we may apply Lord Eustace Percy's remarks to India, " We have a cultural inheritance older, richer and more varied than that of Germany and it is the more necessary that we should learn from her the power of focussing that inheritance into a philosophy comprehensive enough to include its varieties and to develop it to meet the demands of a changing world."

It is a book which should certainly find a place in the Teachers' Library of every school.

F. C. PHILIP

The introductory chapter reveals what can be done by a nation in earnest concerning educational matters, for in the post-war transition period German education was entirely overhauled, and its whole aim and outlook changed from an over-regularised bureaucratic system to a more democratic one with greater emphasis on initiative, character building, physical education etc. All this is very pertinent to India where sooner or later a similar transition period seems imminent. The emphasis on initiative, self-activity, civic and physical education with national culture as the central theme suggests just the elements needed in India to-day where a Nation is similarly feeling its way to a more national system of education. It may also be remembered that "Germany was the first country to recognise and enforce the principle of compulsory education."

After a description of the rather intricate system under which the German Schools are organised, the different types of schools are dealt with in detail. The chapters on the "Garden School at Wilmersdorf" and on Vocational Schools are particularly interesting, and show what can be done in the way of adapting a national system of education to the particular needs of a people. Mr. Ali Akbar attributes the success of such schools to their being organised on the basis of the actual and social needs of the country, and to the close co-operation between the schools and the industries. It is noteworthy that the curriculum of each type of school: Trade, Commercial and Continuation,—includes some elements of general education.

The chapter on Secondary education provides much food for thought to those engaged in Secondary Schools in India, especially the emphasis on the principles of Concentration and Correlation and the Free Activity Groups, while the idea of the Maturity Examination which entitles a pupil to enter a University, and which is held by the school itself in conjunction with the Inspector, and not by the University, is extremely suggestive.

Reviews

"THE GERMAN SCHOOL SYSTEM"

BY

S. ALI AKBAR, M. A. (CANTAB.)

Published by Messrs. Longmans Green & Co., Ltd.—
Price Rs. 3/8

This survey of the German School system based on the first-hand experience and impressions of the author provides a most useful study for all students of education. As Lord Eustace Percy points out in his foreword, "Germany possesses one quality................she has a conscious grasp of what education is and ought to be "........and " shows it over the whole field of education." No true educationist can therefore afford to be ignorant of the results she has achieved. This book reveals her efficiency in the realm of education in a striking degree. Considering the range of topics treated in the 210 pages which comprise the book, one cannot fail to be impressed with its compactness and conciseness to which is linked a lucidity of treatment which makes it most interesting reading.

The titles of the chapters give some idea of the variety of the subjects dealt with :—Administration and Organisation, Kindergarten, Elementary Schools, A Garden School, Middle Schools, Vocational Schools, Secondary Schools; the Teaching of English, History and Geography, the Teaching of Mathematics and the Natural Sciences, Drawing and Music, Examination System, Physical Education, the Youth Movement, Child Welfare, Training of Teachers. The book should be read in order to be appreciated properly, but certain outstanding features may be mentioned.

the material which appeals to pupils between 12 and 15 years of age.

Mr. Tahir has not only argued out his case clearly but has also worked out an outline of a lesson calculated to help the teacher in realizing the aim he advocates. We are sure that Mr. Tahir's article will be read with great interest.



been contributed to the *Hyderabad Teacher* by different writers on the various aspects of the teaching of English in Indian schools. One of the most important questions in regard to the study of English as a foreign language is, what should be the aim of teaching English in Indian schools? It will be remembered that the Sub-Committee appointed by the Teachers' Association came to the conclusion that the aim should be cultural, and not merely utilitarian. In an interesting article which Mr. Mohd. Osman, Vice-principal, Osmania Training College, contributed to the last issue of the *Hyderabad Teacher*, he expressed the opinion that having regard to the difficulties which Indian students experience in learning English, the cultural aim is feasible only so far as "cultural" is taken to mean "informational." It seems to us that at any rate in the high school classes, the teacher should aim at something higher than merely imparting to the pupils information about English life and English institutions, for obviously such information can be conveyed to them more easily through their mother tongue. As the sub-committee have pointed out, the cultural aim implies the understanding of of the genius of the English people through their literature.

Another aspect of the cultural aim is to teach the boys to appreciate all that is noble and beautiful in English literature. It is to this aspect that Mr. Mehboob Ali Tahir has drawn attention in his article on "The Study of a Poem" published elsewhere in this issue. He suggests that the teacher who teaches English to boys over 15 years of age should endeavour to cultivate in them an appreciation of the poems taught. As English is a foreign language to Indian students, we are afraid that even a trained teacher would find it difficult to realise in its entirety the aim recommended by Mr. Tahir. Nevertheless, Mr. Tahir's article is extremely thought-provoking and is replete with useful suggestions to teachers of English. We should like in particular to invite attention to what he says regarding.

Editorial.

The Model Primary School, Hyderabad-Dn.

The Education Department of H. E. H. the Nizam's Dominions is opening a new Primary School for boys at the Headquarters in July 1932. As it is intended that this institution should be a model for other primary schools in the Dominions, it will be known as "The Model Primary School." A well-qualified English lady who has had considerable experience of teaching young children in England will shortly arrive to take over charge of the School as Headmistress, while the First Assistant will be a Hyderabad lady who, as a State scholar, has received Montessori training in Rome under Madame Montessori herself. The other members of the staff will also be well-qualified and trained mistresses. A feature of this school will be that special arrangements will be made for the education of children below 6 years of age, for whom up-to-date apparatus will be provided.

We are of opinion that there was a real demand at Hyderabad Deccan for a Model Primary School, and we take this opportunity of congratulating the Education Department on their decision to supply this demand. Though some of the Secondary Schools at the Headquarters have excellent primary sections attached to them, there was need for a pure primary school with a special Kindergarten and Montessori Section. We welcome the advent of this new school especially because we feel confident that it will provide an opportunity for new experiments in the field of child education in India.

The Teaching of English in Indian Schools.

Since the publication of the Report of the Sub-Committee on "The Teaching of English," appointed by the Hyderabad Teachers' Association, a number of articles have

The Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association will be held on the 15th and 16th September, 1932. Members desiring to move resolutions or to read papers at the Conference are requested to communicate with the General Secretary, Office of the Divisional Inspector of Schools, Headquarters. As usual, an educational Exhibition will also be held along with the Conference.

The programme of the Tournaments and Athletic Sports organised annually by the Hyderabad Athletic Association for the year 1932-33 is as follows:—

July to February	....	Shawcross Football Tournament (League System)
15th August to September.	....	Departmental Football Tournament for Balda & Dist. Schools.
15th October to November	....	Cricket Tournament.
November	....	Annual Athletic Sports
December	....	Physical Displays Competitions.
February 1933	....	Hockey Tournament.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year.		Six months.		Per Issue.	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs.	As	Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page ..	6	0	3	8	2	0
Quarter page	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B.G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscription Re. 1-14 As. a year.

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
Hyderabad Teacher,
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

particularly pleased to hear that you have opened a branch for girls' education. You know how much girls' education has been taking its more and more important part in the educational consideration of the people. I know also what a great and important part the women of our country are going to play in its progress in the future. I am therefore glad that this institution has tried to see that the women of the Mahratta community are also included........I cannot help saying how deeply I realise the importance of all endeavours on behalf of the Mahratta section of His Exalted Highness' the Nizam's subjects. You know that I come from Bombay and am proud to say so. Let me tell you that whenever I see people of the Mahratta community around me, I feel as if I am in my own country. Ladies and gentlemen, Mahrattas are generally known to have produced great fighters and great diplomats, but our people are apt to forget this, that you have also great saints and great singers. Not only are the Mahrattas enlightened in culture and civilization, but the Mahrattas of His Exalted Highness the Nizam's Dominions will long continue to produce great fighters, great philosophers and also great thinkers. There will be need of them, there will be room for them, for the Mahrattas, Andhras and Cannadas to render their services for the progress of this State in future. This State knows no distinction of caste or creed. His Exalted Highness the Nizam's Government has expressed that in these Dominions every element of the population can have the fullest opportunity in the development and progress of the State, and that no man in these Dominions will have any cause for complaint. That which is supposed to be a dream, the State will try to bring to a full realisation, as it has always tried, and every effort will be made to make this a United Hyderabad, united without reference to caste and creed, and united in one great ambition to make Hyderabad worthy of its name of Asafia Dynasty in the whole world."

Notes and News.

The Vivek Vardhini Educational Society held its Silver Jubilee during the first week of April, 1932. The Society maintains two schools—a Girls' School called the Kanya-shala and a Boys' High School known as the Vivek Vardhini Patashala. The latter had 817 pupils on the roll at the end of March, 1932. Nawab Sir Akbar Haidar Nawaz Jung Bahadur presided over the prize distribution which was held on the 6th April, the Hindu New Year's Day. Raja Dhanraj Girjee welcomed the guests in a brief speech. His Excellency Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, G. C. I. E., President of the State Executive Council, also graced the occasion with his presence. The Honorary Secretary of the Society read a long report in which he traced the development of the Vivek Vardhini Patashala from 1907 to 1932 and appealed to Government for an increased grant. Sir Akbar Hydari congratulated the Society on the good work it had done and assured the Managing Committee of the support of Government. The following are extracts from his speech:—

"I am mindful of the peculiar auspiciousness of this occasion when I realise that it is the New Year Day of a large section of His Exalted Highness's subjects. (Cheers). I join the prayer that this day will mark a fresh turning point in the activities of this institution..........I am extremely interested to hear the report that has been read out to you. It gives me a certain amount of pleasure when I hear that I was helpful in getting this institution its first grant..........We shall take the latter part of this report earnestly into our consideration, for the splendid work of the school deserves as much help as possible, and we shall take every step to place this institution on a firm footing (Cheers). I have been extremely gratified to hear that you have extended your activities in all directions. I was

of caste, creed or race. Sir Dorab has also set apart a sum of Rs. 2,500,000 for instituting scholarships for research in what are commonly known as incurable diseases. Born in 1859, Sir Dorab was 73 years old when he died. His death creates a gap in the public and industrial life of Bombay which may not be filled for years.

MADRAS.

1. The results of the S. S. L. C. examination conducted by the Government have just been published. While there is a fair amount of satisfaction at the results, still there are several cases of real hardship and the Moderation Board appointed by the University of Madras has recommended certain modifications in the rules of eligibility. A meeting of the syndicate is expected to come off on the 25th June, after which a supplementary list of eligibles will be published.

2. A conference of Medical Inspectors of schools will be held early in August. The Minister for Health is expected to open the conference and Major. J. R. D. Webb, Director of Public Health, to preside. The Minister for Education will watch the conference. This conference is arranged in good time as it is expected to throw light on the results so far achieved by the system of Medical Inspection in schools, and make valuable suggestions for more effective Medical Inspection.

3. The Government of Madras acting on the recommendations of the Retrenchment Committee have ordered that one teacher in every Government secondary training school for men be retrenched. It is estimated that this will result in an immediate saving of Rs. 50,000 and an ultimate saving of Rs. 75,000 per annum.

The salaries of teachers in Government employ have already been subjected to the 10 per cent cut and this measure is expected to increase the quantity of work of teachers. Thus underpay and overwork will be the result of the economy measure. Will it lead to better results?

4. The Y. M. C. A., Madras conducted its annual Summer school of Music this year also. A large number of Women Teachers attended the school.

A very interesting case concerning the N. R. E. C. College, Khurja is engaging attention at present. The principal allowed a Mushaira to be held in one of the College hostels. A local watchmaker perhaps suspected by students to be an informer was belaboured by boys. Some teachers including the Superintendent of the hostel got involved and had to leave. Certain members of the managing committee holding the Principal rather than the teachers responsible for the whole thing have resigned, thus causing an impasse. Developments are being watched even by The Leader ordinarily accused of being indifferent to teachers' lot.

6. Due to representation of the U. P. Secondary Teachers' Association the Government has agreed to effect a 10 p.c. cut on the Government grant-in-aid rather than on teachers' salaries as was previously proposed.

BOMBAY.

When about a month ago it was announced that Sir Dorab Tata had made a trust of his property —about 3 crores—no one had any idea that that announcement was soon to be followed by the announcement of the death of Sir Dorab Tata and the conditions of the trust were discussed in newspapers, where it was maintained that a good part of the trust money should be ear-marked for the benefit of the Parsee community.

This is the second big endowment for charities on a cosmopolitan basis, the first being the well-known N. M. Wadia charities, and it is worth nothing that both of them are made by Parsee millionaires. India owes a lot to the foresight, courage and patriotism of the late Sir Jamshed Tata and on his death his mantle had deservedly fallen on his two sons who maintained the high traditions of their illustrious father. It was the Tatas who gave India its Iron and Steel Industry and it was they whc founded and helped to maintain the Indian institute of Science at Bangalore, a premier institute of research in Chemistry and Electrical Engineering. There is hardly a line of trade where the Tatas do not have a prominent share and by their enterprise they have given India some notion of what real industrialism may mean. The Tata Hydro-electric works, the Tata Oil Mill Industry, the Tata construction syndicate, are some of their well-known undertakings and recently they were planning to run an air line across the country from Karachi to Bombay.

Sir Dorab Tata who died of heart failure on the 3rd of June was the last of the famous house of Tatas, there being no male member now left to continue the line for Sir Jamshed. Ever since his wife's death last year Sir Dorab had been anxious to make some kind of settlement of his properties and a trust deed was duly executed on March 11. It follows the same lines as those of the Wadia charities, the funds being utilised without any consideration

Bangalore, Kolar, Shimoga and Mysore Districts are running Scoutmaster Training Camps during the Summer Holidays. Bangalore and Kolar Districts are holding a Cubbers' Camp as well.

A Rally of Chicmaglur Scouts was held under the August presidentship of His Highness The Chief Scout on the 2nd March.

June, 1932.

DELHI.

A severe heat wave is passing over Delhi and its neighbourhood, the temperature rising to 120.° Several deaths are reported each day. Acting on the advice of the Municipal Health Officer, all the schools in Delhi have changed their working hours. The schools will close at 10-30 a. m. June is a very hot month. In the interests of young pupils, it is suggested that schools change their working hours, working only in the cooler hours, of the day.

UNITED PROVINCES.

1. Powers of chairmen of Education Committees of District Board are being gradually cut down. Sometime ago the headmasters of vernacular middle schools were given the power to select books for their schools. Now the Department itself has decided which books of which publisher will be used as text in primary classes.

2. A little before the A. V. schools closed for the summer vacation, the Inspector of Schools, Benares Division, launched on an interesting experiment of supplying sprouting gram to scholars in the mid-day recess. Boys are reported to have taken to it with much liking.

3. The new edition (1932) of the Education Code is out. It is reputed to be the best of all Educational Codes in the country. It is noteworthy that the powers of heads of schools in matters of internal administration have been defined. This is expected to save the heads of institutions from unauthorised raids of managing committees in this respect.

4. Speculation is much rife regarding the proposed legislation to compel the Allahabad and Lucknow Universities to have honorary Vice-Chancellors. Educationists like Dr. Ganeshprasad and Dr. Tarachand are arrayed on opposite sides.

5. June is the month of anxiety for teachers. Notices to quit are the order of the season. Even the most insignificant members of managing committees suddenly grow important.

It is understood that replies have been received by the Commissioner for Government Examinations and that the department is considering them.

The 24th Provincial Educational Conference will be held at Madura on the 12th 13th and 14th May. Mr. V. Saranatha Aiyangar, M. A., Principal, National College, Trichinopoly, will preside. A refresher course for elementary teachers will be held under the auspices of the conference from the 9th May to the 14th May. It is interesting that in this regard the authorities of the conference have secured the co-operation of the department. There will also be a refresher course in Geography for secondary grade teachers.

At the last meeting of the Senate of the University of Madras, a decision to confer honorary doctorates on Mahamahopadyaya Swaminatha Aiyer, Sir Sankaran Nair, Sir J. H. Stone, Rev. E. M. Macphail, Sir R. Venkatrathnam Naidu, Sir P. S. Sivaswami Aiyer, The Rt. Hon'ble V. S. Srinivasa Sastry, Sir Akbar Hydari, Rev. Meston, Sir Raja Annamalai Chettiar, Sir C. V. Raman and Her Highness the senior Maharani of Travancore for valuable services rendered to the University or to education in general was taken.

In the adult Education Centre at Mannargudi, which owes its origin to the generosity of Rao Sahib S. V. Kanagasabai Pillay, a special fortnightly course of lectures and demonstrations in Tamil for adults in the locality will be conducted from the 21st April to 2nd May. The course shall comprise lectures on Religion, Civics, Rural Hygiene, Rural economics, study of Tamil, History, and outlines of Modern Science.

MYSORE.

All-India Ambulance Competitions, Lahore.

A Party of five Rovers (members of the St. John Ambulance Brigade, Boy Scout Headquarters), competed for the General Haji Hafiz Obeidullah Khan Ambulance Challenge Shield held in February last, and came out successful, standing first among the successful teams. The party was presented with a shield costing about Rs. 1,2000, cash of Rs. 100, and individual silver medals by His Excellency the Commander-in-Chief Sir Phillip Chetwode.

SUMMER TRAINING CAMPS.

An Advanced Training Camp for Active Scoutmasters from all over the State will be held at Sri Ramadevara Katte in Hassan District, in the latter part of May.

A Training Camp for Rover Scout Leaders will be held near Balehonnur in Kadur District from 27th April to 12th May 1932.

and take over charge from Mr. J. M. Bottomley, the acting Director of Public Instruction. The latter will go on leave for a year.

The All-Bengal Teachers' Association will start a Physical Training Centre for teachers at Rajshahi (North Bengal). A five weeks' training, both theoretical and practical, will be given free by competent qualified instructors. Mr. James Buchanan, the Director of Physical Education, Government of Bengal has promised to co-operate in the work.

A resolution was moved in the Bengal Legislative Council by Mr. Syamaprasad Mookerjee, to deprovincialise the Government College on the ground that they are far more costly and they no longer serve as models. The Minister of Education has promised to give serious consideration to the matter.

Female education is making rapid progress in the Province. The number of girl students in the last Matriculation Examination numbered more than 1000. There are 33 Girls' High Schools recognised by the University. Two Girls' Colleges managed by private bodies are being established in Calcutta.

UNITED PROVINCES.

Mr. A. H. Mackenzie who is the Director of Public Instruction, United Provinces, received on March 7th a deputation of the U. P. S. F. Association. He gave a sympathetic hearing to what the teachers of non-government institutions had to say regarding cuts in salary and promised to make enquiries which should result in some relief to teachers in aided institutions.

By a recent departmental circular Head-Masters of Vernacular Middle Schools have been given the right of selecting Text-books from the approved lists in the Departmental Curricula. Hitherto the choice lay with the Chairman of Education Committees and Deputy Inspectors of Schools.

The board of High School and Inter. Education has resolved to allow music as an optional subject for the High School Examination.

MADRAS.

The Director of Public Instruction, Madras, recently issued to Head-masters of secondary schools and Secretaries of District Teachers' Guilds inviting their opinion on the following points regarding the remodelled S. S. I. C., (1) Should the optional be retained? (2) In how many subjects should the candidate be examined? (3) Is it necessary to include Algebra and Geometry in the present Elementary Mathematics syllabus? (4) Should there be any modification of the syllabuses in History and Geography and Elementary Science? (5) Should the B group be retained?

enthusiasm evoked all over the country when Mr. R. P. Paranjpye returned to India as the first senior wrangler and it was most fitting that he should have presided on the occasion. This society forms one of the ties that bring together Madras and Bombay. The Secretary of the society and his office are in Madras and the society journal is published in Madras. The library of the society is housed at the Fergusson College, Poona, and the members of the society are mostly from the two Presidencies.

The Shivaji Memorial Society is contemplating conducting in Poona a preparatory school on training cadets for a military career. It is expected that work will start in June.

Since July last when a student of the Fergusson College, Poona, made an attempt on the life of Sir. E. Hotson, the then Governor of the Presidency, heavy clouds had surrounded the college and it was at one time rumoured that Government would force unwelcome conditions on the society. The annual grants of the Fergusson College and other institutions of the Deccan Education Society were withheld and it was feared that whatever be the result of the fight anticipated, the college and other institutions would have to face a difficult situation next year. About the 15th of March, however, Government gave up all the major points under dispute but insisted that the college should reduce down its number to 1200. This the college authorities readily accepted and the clouds have since disappeared.

BENGAL.

1. The Special Committee appointed by the Senate of the Calcutta University to report on the Provision of the Matriculation Syllabus has submitted its report. It has recommended for the Matriculation Examination seven compulsory subjects viz. English (two papers), Classical Language (one paper), Vernacular (two papers), Mathematics (one paper), History (one paper), Geography (one paper), Elementary Science (one paper), and at least one and not more than two optional subjects out of a group of more than half a dozen subjects including Biology, Indian administration etc. The Committee has also recommended the Vernacular as the medium of instruction and examination in all subjects except English. The report will shortly come up before the Senate for discussion.

2. The two years' term of the Arbitration Board to hear appeals from the aggrieved teachers of non-government High Schools of Bengal came to an end in December last. The Board was reconstituted in January last. The Government of Bengal has recently given its sanction to the new Board. It is doing very useful work in correcting the injustice done to the teachers of privately managed schools by the Managing Committees.

3. Mr. H. E. Stapleton, the Director of Public Instruction, Bengal, on long leave will return from Home in the middle of April·

Educational News Bulletin

Reprinted from the South India Teacher, Vol. 5. No. 4

[Issued under the auspices of the All-India Federation of Teachers Associations, by the Association of the Editors of Educational Journals in India, 41, Singarachari Street, Triplicane, Madras.]

April, 1932.

PUNJAB.

The Punjab Government have enhanced the fees for the several departmental examinations, Vernacular Final, Junior and Senior Vernacular Certificate Examinations for men teachers, Junior Anglo-Vernacular Certificate Examinations.

The Headmasters' Association, Ludhiana, is reported to have passed a resolution against the order of the Ministry of Education, according to which Government "College and High School Scholarship" will be tenable only in Government and Board Colleges and Schools, provided there are such institutions in the town in which the scholarship winners reside, or as near their homes as any recognised institution under private management.

BOMBAY.

The Khandesh Secondary Teachers' Association held its Annual Conference at Jahagaon in February last, when Prof. V. B. Naik of Poona presided. This is one of the few district associations which has been holding its meetings regularly every year and doing useful work.

Dr. R. P. Paranjpye gave about 3000 volumes from his private library to the Fergusson College, of which he was the Principal from 1902 to 1920.

Some of the schools in this presidency are getting due for their centenary celebrations. The Beyron Smith High School, Belgaum, celebrated the completion of the hundredth year of its existence in February last. The Wilson College, Bombay, had its celebrations on the 29th of March. It may be noted that both of them are Missionary Institutions. In this presidency it was the Christian Missions who first entered the field of education even before Government thought of doing it.

The Indian Mathematical Society also had its jubilee celebrations on the 26th March. The society had its origin in the

Results of the Different High Schools in H. E. H. The Nizam's Dominions in the H. S. L. C. Examination, 1932.

NAMES OF SCHOOLS	Examined	I	II	III	Total.
Osmania Intermediate College, Aurangabad ...	31	5	8	12	25
Government High School, Chaderghat ...	126	6	28	43	77
City Intermediate College ...	81	4	22	36	62
Osmania Intermediate College, Gulbargah ...	37		7	10	17
Jagirdars' College, Begampett ...	11		2	5	7
Madrasa-i-Aliya ...	21		5	8	13
Osmania Intermediate College, Warangal ...	31	1	11	14	26
All Saints' High School ...	38		6	12	18
A. V. High School, Bolarum ...	14		4	4	8
Dharamwant High School ...	19			2	2
Islamiah High School, Secunderabad ...	19		1	3	4
Madrasa-i-Aizza, Hyderabad ...	14			1	1
Mahaboob College, Secunderabad ...	55		9	16	25
Methodist Boys' High School ...	23		1	7	8
Mufidul Anam High School ...	22		1	5	6
Vivek Vardhini High School ...	75	1	12	19	32
Wesleyan High School, Secunderabad ...	30	3	12	13	28
Zenana College, Nampalli ...	8		1	3	4
Girls' Patashala, Secunderabad ...	4		2	1	3
Stanley Girls' High School ...	22		3	4	7
Private (Boys) ...	158		1	51	52
,, (Girls) ...	5			4	4
Teachers ...	13			3	3
Total ...	857	20	136	276	432

fair trial during their inspections, which would save their time and also give them a good opportunity for testing the real progress of boys and girls. Educationists should give their careful thought and attention to the need for improving our present system of 'Information Tests' and making them more genuinely 'Intelligence Tests.'



Indian History meant for our Middle Schools. It is quite possible to extend the system to High Schools also. If the foundation of our educational edifice can be truly and deeply laid by attempting genuine 'intelligence tests' in the schools, our Universities also can find a convenient method of reforming their public examinations.

The questions given below are in accordance with the three types of tests mentioned above.

Indian History : Time 20 minutes.

I. Some of the following statements are true and some are false. If the statement be true mark T, if not mark F against each. Marks will be deducted for wrong answers.

a. Buddha and Mahaveer were contemporaries.
b. Mahmud Taughlak was not really a mad king.
c. The Slave-kings were the first Muslim rulers of India.
d. Sir Thomas Roe visited the court of Akbar.
e. Aurangazeb was the ablest of 'Moghul' rulers.
f. The Black Hole tragedy is not a probable event.

II. Fill up the blanks in the following:

a. The British came to India first as...........and in 1600 founded.. ....Their rivals were......... ....The foundations of British rule were laid by Lord.......... after his victory in the battle of...............

III. In each of the following statements choose from among the names in brackets the one that will make the statement true.

a. In 1761 the battle of Panipet was won by (Hemu, Baber and Ahamed Sha Abdali).

b. Fardousie lived in the time of (Akbar, Asoka, Mohamad Gazni).

c. The Sepoy mutiny broke out in the time of (Wellesley, Dalhousie, Canning).

Usually, there should be as many questions of the above type as possible and the time for answering them should not exceed half an hour. Similar questions may be framed in the other subjects. Inspecting officers may give them a

individual or of national life. Hence the fewer of these public examinations the better it would be for education.

The tendency in some western countries seems to be towards avoiding examinations. In India their wholesale abolition cannot be advocated, but there is need for rationalising them. Some irreconcilable foes of examinations there are who describe them as 'obstacles to education.' Some denounce them as 'begetters of strife,' others consider them as 'presumptuous attempts to guage the depths of human ignorance.' They cannot be considered to be essentially bad or mischievous, but they are imperfect measurements of intelligence and therefore need improvement. It is true that no tangible means of measuring intelligence can be invented in the way in which a thermometer is invented to measure temperature. Time was when phrenologists, physiognomists and physiologists endeavoured to invent such a machine, but success worth the name could not be achieved. Even the aesthesiometer was not very useful in this respect. Researches in psychology, however, have proved that intelligence can be measured and attainments tested by reforming the methods and the systems of the present-day examinations.

A specimen of "Intelligence tests" Paper.—The old type of examinations which are in vogue in our country are conducted by setting a small number of questions that are to be answered within two or three hours. Naturally 'essay' type answers are preferred. The new type of examinations aim at giving sixty or even eighty questions to be answered in less than half an hour. In setting these 'intelligence test' papers, the questions are usually divided into three classes:

1. True and false tests.
2. Completion tests.
3. Recognition tests.

These tests can be applied to all the subjects of a school curricula. We give below a few specimen questions on

is a language other than his mother tongue, his difficulties will increase tenfold. One is driven to the conclusion that our present examinations are mere 'information tests' and not 'intelligence tests.' Even these 'information tests' are not without defects. For one thing, they are not objective. Every examiner has his own whims and fancies. In valuing a paper his judgment is naturally influenced by such considerations as those of neatness, arrangment of thought and the style of the examinee. He may also be tempted to find out more of what the candidate does not know than of what he knows. The results are naturally disastrous. Dr. P. B. Ballard in his illuminating and thought-provoking book the 'New Examiner' relates an instructive story. A group of examiners in the United States of America once resolved to arrive at a just estimate of the answers of certain candidates and each of them proposed to value them separately and record their marks on a separate sheet of paper. One of the examiners had prepared a 'Model answer paper.' It seems that this particular paper got mixed up with the answer papers of the candidates and was valued in the ordinary course. It was afterwards found that the model paper received marks varying from 20 to 80 per cent. Although in India no such incident has yet been reported, the story goes to prove that such examinations can never be objective. Secondly, these examinations test more of what one remembers than what one understands. A scholastic or a public examination cannot be a correct measuring instrument either of intelligence or of attainment. The essay type answers reduce their measuring value. They are rightly described as 'Incorrect yard-sticks.' They do not examine what they profess to examine. Thirdly, they stunt the growth of 'creative powers.' This supreme faith in their powers perhaps accounts for the paucity of original thinkers in the country. 'Text-book and Criticism' fed brains are necessarily barren. Fourthly, being more of a bugbear, they cannot be said to be very helpful for the healthy growth either of

Reform of Examinations

BY

G. A. CHANDAVARKAR, M. A.

It is almost a truism to say that our present system of education is dominated by public examinations. This is largely due to the importance attached to examinations in the various departments of human activity. Administrators test the fitness of a candidate for a post by means of competitive examinations. Inspecting officers often judge the merits of teachers by the percentage of passes in the schools. Even those universities that claim to be 'teaching bodies' still set great store by the results of their annual examinations. When educationists feel the necessity of raising the standard of education, what they usually do is to prescribe a large number of text-books and to demand their intensive as well as extensive study. That study is finally tested by setting ingenious question papers and demanding elaborate answers. It may therefore be safely assumed that examinations play a very important part in the whole of our educational system. How far such examinations are real 'intelligence tests' needs careful scrutiny.

Defects of Information tests.—If we cast a glance at any question paper set for any school, college or university examination, we shall invariably find that on an average a candidate is expected to answer six or seven questions based on several text-books within a period of two or three hours. In such cases it always happens that the answers are to be given in the form of 'essays.' A candidate has therefore to depend largely on his memory and power of expression. If he is deficient in either of these, he has absolutely no chance of success. His intelligence will count for nothing. Again, if the medium of his expression

Again, the single seat is a real necessity. Isolation is needed to prevent dissemination of diseases, not merely the acute infectious diseases, but grosser forms of sores, impetigo, scabies or lice; and to mitigate the offensiveness of odours from decaying teeth, discharging ears, dirty clothes, and other kinds of uncleanliness. Isolation is also required to ensure sufficient ventilation. The condition of fatigue, so wasteful of educational effort, is largely due to insufficient elimination of heat and aqueous vapour. The removal of these is a physical necessity.



It has been estimated that for proper and healthy functioning of the body and mind, an adult needs 3,000 cubic feet of fresh air every hour; children require a little less. This should always be kept in mind at the time of building school rooms and lecture halls. I have already mentioned at the beginning that this is very easy in India, since we can directly admit outside air into the room without changing its temperature. All that we need to do is to provide sufficient inlets and outlets, properly situated, in the form of doors and windows, and the perflating action of the air will take care of the ventilation. But in hot weather, when the outside air is too hot to be admitted directly, it becomes necessary either to limit its entry into the rooms or to make it cool by some device such as the use of electric fans.

School furniture:—The growing child whose muscles cry out for exercise while he is made to sit at desk for hours daily, is liable to suffer from myopia or from spinal curvature. The obvious preventive is to diminish or break up the continuous desk lessons into short periods, alternating with more active work; and to make the child sit in a natural, upright posture when reading or writing. This posture is retained by constant muscular activity, chiefly of the back muscles, and soon leads to strain and muscular fatigue. The problem, therefore, is to relieve fatigue in the writing position and in the listening position. This can be done by providing a low back rest which helps the child to sit in an upright position without putting undue strain on his back muscles. A properly adjusted desk in front will help to support the weight of the child while reading or writing. It is advisable to have seats moving on an axis parallel to the desk edge, since this helps the child to adjust himself properly to his seat, and muscular fatigue is to a certain extent eliminated. The distance between the back rest and the desk should be so adjusted that the child is able to read the ordinary type in the books without having to strain his eye-muscles.

ground. The higher we ascend the purer the air becomes. New York skyscraper hotels advertise rooms "above the dust and insect line."

Expired air contains only about 17 per cent of oxygen, that is, about 4 per cent less than fresh air; and although under moderate conditions of crowding the air in a school room might be rebreathed many times, the percentage of oxygen would not fall to such an extent as to render the air irrespirable from lack of oxygen and increase of carbon-di-oxide until long after it had become insanitary from other causes. It was Haldane who proved conclusively by experiments that the increase of carbon-di-oxide *per se* is not the cause of evil effects that are noticed in crowded and ill-ventilated rooms, but they are mostly due to increased humidity, temperature, and absence of movement of air in contact with the body. As soon as the stagnant air is set in motion by an electric fan, all the evil effects disappear. This is also everybody else's experience.

Various odorous substances of a volatile nature, chiefly from decomposition of materials about the teeth, skin, or intestinal canal, from soiled clothes, or unwashed skin or feet, occur in school air. Their effect is strong at first but to those remaining in the air is scarcely noticeable. Probably these materials account for the theory that there is an effluvial or crowd-poison in the respired air of a subtle and poisonous nature.

No experiment has yet proved that these emanations have really any injurious effect on health. Expired air is sterile as regards micro-organisms, although school air contains numerous germs, especially from the clothing of younger children, and from droplets sprayed about in coughing, sneezing, sniffing, or speaking. As a rule, infection through the expired air is limited to a short distance, and is due to this sprayed material rather than to genuinely air-borne germs.

attendant evils. Moreover, dirty privies and urinals are a great danger to public health, as they pollute the atmosphere.

Ventilation :—The efficient ventilation of a school is another important problem of school hygiene ; but the elaborate and graphic methods described by European writers on Hygiene are mostly unnecessary in a tropical country like India. We do not need to warm the air before letting it into the rooms or to heat our rooms by hot water pipes and electricity. Our local conditions are altogether different.

The aim of good ventilation is to provide pure, fresh and moving air to the inmates of a building, and to make provision for the expired air to be expelled as early as possible. This is necessary because the expired air contains substances which are deleterious to health and in some cases even dangerous. The most harmful ingredients of air, both out of doors and in schools, are bacteria. In towns where dust and soot abound, the lungs of the inhabitants become very dark coloured through the inhalation of these small particles. If the dust contained only particles of dead and inorganic matter, there would perhaps be no great danger from inhalation, although it is certain that inhalation of some kinds of dust—particularly that consisting of sharp, hard and mineral matter—is highly injurious. When, however, dust contains pathogenic bacteria, the case is wholly different. The bacteria causing consumption are commonly present in the dust derived from the expectoration of people who are suffering from this disease. In the towns it is in the dusty weather that attacks occur of what are known as common colds; and when we consider the constitution of town dust, this is not surprising. Solid particles, however small they may be, are heavier than the air, so that when the air is still, dust and bacteria are present only in small quantity and only a few feet above the

by sanitary authorities in schools and colleges. This is, of course, the safest method, but, unfortunately, it is too expensive, and thus impracticable in the present state of our country. Wherever the water is supplied by pipes, it is always desirable to have a drinking-fountain, a little bubbling jet of water which can be drunk without a cup. There should be one such fountain for direct drinking to every hundred children in school. This method necessitates a preliminary cleansing of hands, for which separate arrangements should be made.

Disposal of waste :—No system of sanitation is complete unless proper attention is paid to the construction and management of privies and urinals in schools. With the introduction of the water carriage system of disposal of waste and excreta in the city ot Hyderabad, it is hoped that the latest method will soon be in vogue, and the difficulties of the school authorities will be satisfactorily solved. But it will be a long time before District and Taluq schools can hope to have this system, and resort will have to be had to old methods.

The privies and urinals should be situated in a separate block, away from the main building, and should be open to skylight. The number of seats for secondary schools should be one for every 15 girls, up to 100, then one for every succeeding 20; one for every 25 boys, up to 100, then one for every succeeding 40. Each seat should be properly screened from the others. The floor should be made of some non-absorbable material, such as tiles or Shahabad stone. Efficient drainage of ablution water should be provided by means of drains and their regular cleaning insisted upon. I must be excused for mentioning these facts which appear so insignificant, but I have reasons for doing so. I have noticed on more than one occasion that want of sufficient number of seats and proper attention to cleaning, has led young children to abstain from answering the calls of nature. This leads in time to chronic constipation and all its

the glands in the groin are often enlarged, and the patient may even get a little fever. The worm is packed from end to end with young larvae, and when such patients go to wash themselves, or their clothes, in wells, these young larvae find an access to drinking water. The fresh water crustaceans or cyclops, as they are ordinarily called, swallow up these young larvae, and in the stomach of these cyclops the guineaworm larvae undergo development. If you take a little water in a clean glass tumbler from an infected well and hold it against light, you can always see these little cyclops moving about with sudden jumps and starts. They are little insects, almost transparent and of a peculiar shape, and you have to look carefully for sometime before you can see them. These infected cyclops are the forerunners of guineaworm infection. The suspected well should at once be disinfected as described above, and the use of such water prohibited for some time. Boiling destroys these cyclops in no time, and it is always the safest method.

I think I have said enough about the two most prevalent water-borne diseases. As regards the other four, viz., Typhoid, Dysentry, Hill diarrhoea and Hookworm disease, it will have to be left to laboratory workers to decide whether that particular specimen of water contains the micro-organisms respectively of the above diseases. Thus, whenever suspected, the water should be sent to the nearest laboratory in stoppered bottles for proper examination and culture.

The storage of drinking water is as important as its supply. I have already mentioned the deplorable way in which drinking water is stored in most district schools. It should always be stored in clean vessels in a cool dry place free from dust. Whenever possible, a glazed earthenware jar with a tap should be preferred. The common drinking cup is a positive danger to health and should always be condemned, as it leads to the spread of contagious diseases. In most European countries, paper drinking-cups are supplied

is not long lived and is easily destroyed by disinfectants, such as potassium per manganate etc. Boiling is, however, the most certain method of purification of water infected with cholera organisms. In times of an epidemic, it is necessary to guard against possible contamination of the school water supply. If the well has any steps, they should be closed down. Washing of clothes, and bathing in or near the well, should be stopped. A special bucket with a rope should be kept for drawing water from the well, and private vessels should not be allowed for this purpose. The well should be disinfected from time to time by the following method :—

A strong solution of potassium per manganate should be prepared in a bucketful of water and poured into the well, the well-water being continucusly stirred throughout this procedure. Sufficient solution should be used to impart a light pink colour to the well water. The quantity of the drug required will naturally depend upon the quantity of water in the well.

This method is an effective safeguard against cholera germs but, whenever practicable, boiled water should be used for drinking purposes during the epidemic.

Guineaworm:—Guineaworm infection is very common in villages and district-towns in the Nizam's Dominions. Wherever this is found, it must be taken for granted that the water supply is at fault. The adult worm is about twelve to twenty inches long, almost threadlike in appearance and of white milky colour. The usual habitat of the adult worm is the Subcutaneous tissues of man. When the worm gets matured, it finds its way out through a sore or a blister, commonly on the legs or the feet—sometimes even other parts of the body are affected—and a tiny threadlike worm makes its appearance. The appearance of the sore is sufficiently characteristic, and once seen, the sore can seldom be mistaken. The leg is red, hot, swollen and very painful;

No hard and fast rule can be laid down so far as the size of the building is concerned. It will naturally depend upon local requirements and the amount of funds available at the moment. However, large central halls, formerly advocated as educationally useful, are often resonant. The voice of the teacher suffers unduly leading to hoarseness or aphonia in the young teacher and produces fatigue and inattention in the children.

Water:—The question of supplying drinking water to children at school ought to receive more attention than it usually does. In tropical countries more water is drunk even by the adults than in cooler climates, and children generally require more water than adults. In Districts and Taluq Schools one often finds an earthen pot with an earthen drinking cup by its side, both covered with dust or moss, lying in some obscure corner. All the children use the same cup for drinking purposes. Often the well from which this water is drawn is also unsuitable.

If the number of water-borne diseases is kept in mind, it will be easy to understand the importance of the supply of good drinking-water in district schools. Taken in order of frequency, the following diseases are commonly found in the Hyderabad Dominions :—

(i) Cholera
(ii) Guinea worm
(iii) Typhoid
(iv) Dysentry
(v) Hill Diarrhoea
(vi) Hookworm (Ankylostma Duodenalis)

The first two are the commonest, and so a short description of both is necessary.

Cholera:—Cholera is an epidemic disease spread by a small Micro-Organism—the Comma bacillus—first discovered by Koch in 1885. This micro-organism is found in water infected with the excreta of a cholera patient. The organism

detection of diseases and isolation of such children as suffer from them, is one of the most important problems of school hygiene. In cities and towns, public health authorities are competent enough to take care of the needs of the schools; but in forlorn districts and taluqs this help is not always at hand, and the school teacher has to depend upon his own knowledge and discretion to deal with questions of school health. With a view to helping such teachers, I have tried to touch on all the aspects of school hygiene, emphasizing those that need special consideration in view of the local conditions.

Site:—The site of a school is frequently a matter in which the educationist has not much choice. In this country, it is generally left to the discretion of the Department of Public Works, and all that the teacher has to do is to make the best use of what is provided. The site area required by the Board of Education Regulations is a minimum of a quarter acre for two hundred children in Elementary Schools, and, in Secondary Schools, two acres for one hundred children, excluding the playing fields. Too much importance need not be attached to such things as ground, air or dampness of site, for so long as the site is well drained and the construction of the school is satisfactory, an elaborate consideration of sub-soil is not needed. It is, however, important to secure an open site where there is plenty of air and the building has good perflation and wide exposure to skylight. It is always advantageous to avoid main roads and crowded streets for the construction of school buildings, as intermitting noises are very distracting, and constant noise from any source is nerve straining and attention becomes easily fatigued.

Objectionable odours from dust heaps or stable manure together with the fly nuisance may become especially offensive in warm weather. The presence of cesspools in the vicinity, which are the breeding places of mosquitoes, should be guarded against, and care should be taken to ensure the effective drainage of rainwater.

" Mens Sana in Corpore Sano "

BY
S. A. RAZVI, M. B. B. S.

WITH the advance of education in this country and with the number of schools that are multiplying from day to day, it is becoming more and more necessary for the average school teacher to get acquainted with facts that were hitherto known only to medical men. Since that portion of the child's life is spent in school which is vital to the processes of growth and development, both physical and mental, it is absolutely necessary for the teacher to see that these natural processes are not interfered with in any way. Thus an elementary knowledge of the conditions and environments required for healthy growth is very desirable in those who are entrusted with the education of the young.

In recent times, the subject of school hygiene has attained such enormous proportions that a brief article like this should be considered a mere introduction to the subject. My excuse for writing this is that even this might prove useful to those who either have no time to devote to large volumes or are not in a position to do so. Moreover, books written on this subject by European authors are, in many ways, not useful, because the local conditions here are entirely different from those of other countries. The climate, the weather, the nature of prevalent infectious diseases, and the types of children that we have to deal with here, are essentially different from those of European countries. The methods suggested for the public health authorities in those books are impracticable and, sometimes, impossible.

The crowding together of little children, between the ages of five and ten in small and, often, unhealthy school rooms, is fraught with dangers of infection. The early

training, both in theory and practice, for a period of one year. After completing the course, these teachers should be sent back to their respective schools to start a Manual Training Class, which can be equipped properly with 20 benches and required tools at an initial cost of nearly Rs 2000/-and a recurring expenditure of about Rs 200/-per annum at the rate of Re. 1/-per student.

It has been already explained in detail how Manual Training develops in a student the powers of observation, of initiative, of arriving quickly at the right decision at the right moment, and a strong will-power. These qualities are essential for a statesman, if he is to succeed in discharging the heavy responsibilities that fall on his shoulders. They are equally important for a merchant or a manufacturer, a lawyer or a doctor, to ensure success in life. Apart from this, Manual Training is useful from the professional point of view also. With the industrial awakening in the whole of India, and especially in this State, where our benign Government has taken up seriously the question of developing the various industries, the services of those that have undergone this training will certainly be very useful. Besides, the question of unemployment among the educated classes is becoming more and more acute every year with the increase in the number of discontented graduates and undergraduates. The remedy lies in diverting the energies of these youths into a different and more profitable channel, and a young man who has received technical training, will certainly be much better off than others, because of his greater income and greater independence. The demand for such trained persons in every part of India is rapidly increasing owing to the efforts that are being made to develop the industries of the country.

must listen to the Cabinet of Reason and carry out its decisions.

The question of practical instruction in the Middle and High Schools in these Dominions has received a great deal of attention during the past few years, so much so that the current school year has begun with a new curriculum, which includes Manual Instruction for all the classes from the Primary to the High School. It consists of clay modelling, card-board construction and wood-work, which create in the child an instinctive interest in performing such activities as develop his latent powers gradually. The child finds familiar things in the clay modelling and card-board work, things which he sees in his school, in his house, and in his neighbourhood.

Wood-work begins in Class VI with Sloyd Knife as the chief tool in the course prescribed for the higher classes, we find models arranged in three groups. The first group is purely eductional and the boys are made to work one model after another, giving opportunity to the more advanced boys to prepare models in the second group, consisting of either geometrical solids or turning models (lathe-work). The third group is an optional one, which gives the boys an opportunity to prepare more difficult models with joints. In schools where regular carpentry is taught, the supplementary course only may be found very useful to achieve the end in view. Decorative work, such as inlaid work and simple carving, may be given to a more advanced boy, until the other boys come up to the same stage, so that the whole class may begin with a fresh model simultaneously.

Now, in order to work out this new curriculum successfully, a band of teachers, well-trained in Sloyd, should be employed. It is my humble suggestion that a sufficient number of young energetic teachers, who are at least Matriculates, be selected from the High Schools to undergo

is liable to appear and widen. Every one knows how some men have a clear judgment and the best of intentions, and yet fail to take the right action at the right moment for want of will-power or quick decision.

Will-Power in Business.

The Will is the hammer of the brain. It settles the brain-disputes; it puts an end to mere discussion, and enables the mind to decide. Consequently, will-power is absolutely necessary to any businessman who wishes to be among the leaders.

Employees need it too. An employee with will-power needs less supervision and possesses more initiative. His labour produces better results than that of the passive obedient worker.

The strong-willed man does not merely want and wish. He makes up his mind, he decides, he knows what he wants, and gets it. The difference in men lies in their will-powers rather than in their abilities. There are plenty of men who know, but few who can decide and act.

The world is full of wise but feeble men. They have many ideas and theories, and even facts, in their minds; but they lack the strength to put them into actual practice. It is easy to be too judicious, to look on all the sides of every question, before daring to act. Ideas unused are like food uneaten. Information is only useful when it leads to action and improvement. Put a quart of petrol in an open barrel, and it will evaporate. Put it into the tank of an automobile and use it, and it becomes power. Ideas only become powerful when they are used. Many brains have no sparking-plugs; and, for lack of a sparking-plug, much of our thinking power is wasted.

While some men have too little of will-power, others have too much of it. The ideal situation is that in which your will rules your brain as a constitutional monarch. Your will must not rule like a Kaiser, nor like a weakling; it

Baroda and Hyderabad, and even provinces of British India like the Bombay Presidency, borrowed the services of teachers from this pioneer batch to introduce the sloyd system into their High Schools and Normal Schools. Later on, Madras, the Punjab, Bengal and the Central Provinces, likewise started Manual Instruction, and in the Bombay Presidency, it is one of the optional subjects for the High School Examinations.

Wood-cutting, digging a pit, carrying a weight, running, field games, gymnastics, drill, etc.—every one of these, requires the use of strong muscles. They demand very little training and very little brain-work. They make boys rough, strong, and sturdy rather than gentle, keen and quickwitted, for such exercises bring into play only the muscles of strength and locomotion, (which we also find in the lower animals,) and not the delicate muscles of skill. Unskilled labour develops only a few and crude motor ideas; skilled labour, on the other hand, develops accurate motor sensations, ideas, and a fine co-ordination of muscular movements. The latter alone is educational. Excessive unskilled labour produces "The Man with the Hoe" and makes him "Brother to the Ox."

Dr. T. M. Balliet says in one of his lectures: "The muscular movements involved in the handling of tools are made at first by nerve energy, which comes from the brain; but, after these movements become automatic by practice, they are relegated to the lower centres of the brain and the cord. Such movements cease to be of much educational value when they are no longer directed consciously by the brain. Any process in Manual Training ought to stop when it ceases to be brain-work."

Muscles are the organs of the Will.

Muscles are in a most intimate and peculiar sense the organs of the Will. If they are undeveloped or grow relaxed or flabby, the dreadful chasm between good intentions and their execution

purpose. The teacher should be willing to explain these to the pupils whenever the latter desire him to do so.

Sloyd in India

BY

MOHAMMED ABDUL JABAAR

Manual Training Teacher, City College, Hyderabad-Dn.

(Continued from the October-December issue).

MYSORE was the first State in India to introduce the system of manual training into secondary schools. In 1907, Mr. H. J. Bhabha, the then Inspector General of Education, was deputed by the Government to study the systems of Manual Instruction followed in different countries of Europe and America, and to suggest such methods of practical education for the Mysore State as might benefit the younger generation in future. Mr. Bhabha, on his return, recommended stongly the Swedish system of Sloyd, and the services of Dr. Gustaf Larsson were borrowed from the Sloyd Training School, Boston, to train a batch of 20 teachers including myself. These teachers, after the training, were appointed in different High Schools and the Normal Schools of the State to teach Manual Training. It is interesting to know what opinion Dr. Larsson formed of these Indian teachers when compared to those of Western countries. Before leaving India, he submitted a report to Government, in which he remarked: "These teachers were well educated. They were also teachers of experience, but with no technical training. Nevertheless, they showed an aptitude, skill and interest quite equal to the American and European teachers."

When the Mysore State wanted to have its own university, the Government abolished Sloyd for want of funds. The progress of Sloyd in these ten years in Mysore had been so remarkable that some other Indian States like Cochin,

to employ more than one kind of illustration in a single lesson. In describing a campaign, for example, the teacher may have to resort to pictures, plans of battle and charts. Apart from this, he will certainly make use of verbal illustrations. But it should be emphasised that too many illustrations spoil a lesson. Considering the time that is usually allotted in schools to history periods, the use of too many illustrations in a history lesson will leave very little time for exposition by the teacher. This will create the false impression in the minds of the pupils that illustrations rather than exposition are of chief value. Besides, the displaying of many illustrations in the course of one single lesson creates some confusion and will distract the attention of boys from the main points of the lesson. Thus the teacher is encouraged to adopt a variety of illustrations, but he is cautioned against using too many of these in one lesson. Variety is useful in rousing interest and in conveying the desired meaning, and limitation in number is necessary to hold fast the attention of pupils to important points of the lesson.

There is no rigid rule as to when the illustrations are to be used. Should they be used in the beginning of the lesson, in its middle, or at its end? The answer depends upon the aim of the teacher in using the illustrations. In general, if illustrations are used in the beginning of the lesson, their aim is preparatory—preparing pupils for the lesson that immediately follows. If they are used in the intermediary stages of the lesson, their purpose is elaboration of the lesson and the fixing of important points. Illustrations when used at the end of the lesson, help in summing up of details and in concentrating the attention of boys upon the principal and fundamental features of the lesson.

It will be decidedly helpful if opportunities are given to pupils to see the various illustrations during their leisure hours. In other words, schools should arrange and display these illustrations in rooms specially provided for the

general ideas, which will have to be elucidated by means of apt stories, quotations, extracts and examples. These are mostly in the nature of verbal illustrations, the success of which depends upon the possession of a stock of stories and instances by the teacher. He should be able to make use of suitable literary extracts and particularly historical novels and poetry, and should be ready with extracts from historical sources for purposes of supplementing his description and illustrating the broad ideas of history. 2 There are illustrations such as pictures, diagrams (pictorial) and models used for developing the imagination of pupils and for the purpose of creating reality in history. There are two points to bear in mind in this connection. In the first place, the illustrations should not unduly arrest and check the imagination of the boys. A variety of pictures, portraits and models, if displayed properly, will go a long way in counteracting the inherent defect of arresting the growth of imagination which such illustrations possess. In the second place, illustrations should be in harmony with the subject. In other words, they should be, as far as possible, accurate and should in no way contradict the evidence of history. 3. There are illustrations in the form of symbolic devices which aim at helping pupils in understanding the relation between facts and the course of events. Charts and tables belong to this category. With regard to the use of symbols, there is this much to say that they should not be allowed to degenerate into bare and meaningless symbols. Such illustrations are useful only so far as they relate to and help in summing up the actual experiences of pupils.

The type and the subject matter of the history lesson will decide whether to use each kind of illustration separately and by itself or in combination with other kinds of illustrations. In general, it may be stated that there is an imperceptible gradation between the quality of illustrations, but there is no hard and fast line of demarcation between them. In matters of practice, there is the common tendency

history with other subjects has the lurking danger, specially when raw teachers are dealing with the subject, that history may be merged in other subjects and lose its identity. However close an affinity there may be between one subject and another, the essential differences of the two should not be overlooked, and illustrations should recognize these dissimilarities, and must be based upon them if they are to bring home to students the real significance of the subject. Take the case of maps for example. Maps for teaching history should contain principally all those features that are important historically, omitting out all those geograhical details that have insignificant place in history. Consider again the use of pictures and models in history teaching. Art and history are no doubt related, but in historical pictures and models artistic considerations are subservient to the historical. Similarly, extracts that are taken from literature for teaching history must have firstly historical accuracy.

Notwithstanding their variety, all.historical illustrations have one common essential feature. They elucidate the exposition of the teacher or illuminate the description of the book, and the general argument for all, save the verbal illustrations, is at bottom the eye-versus-the-ear argument. They indicate the effort to give concrete shape to ideas and descriptions. Pictures, portraits, models and pictorial sketches create reality and vividness in history by their direct appeal, whereas maps, charts, diagrams and graphs do the same indirectly through exercising the imagination, knowledge and thought of pupils. The purpose of illustrations is generally accomplished in three ways:
1. There are illustrations that are introduced to elucidate some general conception by means of particular instances. To explain, for instance, the causes and consequences of a war, the policy of a state, or the character of an important historical personage, the teacher is forced to deal with many

are, in a lesson of this type, put to a test. Illustrations that will be used in this lesson are of a higher type than those employed in the dramatic narrative. Pupils that are capable of solving historical problems are also capable of understanding and employing more difficult and more meaningful illustrations such as the symbolic. In their case the object of illustrations will not be to give reality to history so much as to enable them to grasp at and interpret historical relations and the occurance of historical events. The source method lesson is of the highest type. When students reach this stage they come to rely upon themselves, more or less, for learning history. Teaching and, along with it, its aids almost entirely drop off. In other words, instead of serving as aids to the exposition of the teacher illustrations become aids to the study and examination of material for understanding and explaining the sources. The work of the teacher is now replaced by that of the student who finds it necessary to choose his own explanatory and elucidatory devices.

Secondly, in deciding upon the suitability of illustrations, due regard should be paid to the mental equipment of pupils. In selecting the illustrations, their knowledge, experience and understanding have to be taken into account. A picture of a historical scene, for instance, will not be understood by all the pupils equally. Pupils living in towns may have enjoyed the facilities of visiting museums and places of historical interest or they may have seen some of the things which the picture represents. For them the picture is a helpful illustration. But for rural pupils whom such opportunities have been denied, the picture will be difficult to understand. For them it will not be a suitable illustration. Cases of such nature are many and they all point to the need of proper grading of illustrations.

Thirdly, illustrations should correspond with the subject, which they are intended to illustrate. The correlation of

he is able to expose the original matter. In other words, he must possess, firstly, a stock of ideas and must also know how to present these to the people he is addressing. After this, if he finds that the exposition of original material is insufficiently understood by his addressees supplementary words shall come to his aid in clarifying and conveying his intended meaning. Now the possession of matter in speech or writing and the ability to deal with that material are the first essentials while elucidatory words and phrases are mere aids to successful exposition of the topic Similarly in the teaching of school subjects, illustrations are aids to teaching. They are the devices which teachers employ to make the exposition of the subject or description of the book clear, effective or interesting. From this it follows that any amount and the best type of illustrations cannot save the situation if the teaching is defective in matter or in quality, for the simple reason that illustrations cannot substitute teaching.

Illustrations are to be considered suitable when they fulfil, among others, the following important conditions. To begin with, there should be a close relation between the type of teaching and the nature of illustrations used. For a dramatic narrative lesson, for instance, pictorial illustrations will be more suitable, as these help building up imagination of pupils and help making emotional appeal. But more important is the descriptive power of the teacher, for whom it will be necessary to present word pictures infusing reality in history and giving vividness to his descriptions. If the lesson is intended for senior pupils and is of the problem method type the aim of the teacher will be to lead his pupils to arrive at the correct solution of the problem or problems raised in the lesson. Emotional appeal is not so important here and it is not essential for the teacher to possess any high degree of power, of description. Pupils' activities and efforts are relied upon for reaching the solutions of problems, and their intellectual capacities for reasoning and judgment

with the every-day experience of pupils, thus rendering the correlation easy.

This method, it need hardly be said, applies to a lesson in an advanced class. While dealing with younger pupils, a few modifications of the method advocated above are necessary. Instead of the appreciation of the poet's message, which they may be too young to grasp, the pupils should be made mentally to visualise the pictures and enjoy the progress of the story and the metre. As to the last, the teacher should make use of methods which help the pupils to realise the rhythm; for instance, he should let them tap out the stresses while repeating a verse. The inflicting of technical terms on them will serve no useful purpose and hinder their enjoyment of the poem. "The poem must be read to be enjoyed, or not at all."

Illustrations in the Teaching of History.

BY

MIR AHMED ALI KHAN,

M. A., M. Ed. (Leeds) Barrister-at-Law.

NOT only in the teaching of school subjects but also in our everyday speech and writing when we feel that the words we have already used are inadequate in explaining ourselves and in conveying our ideas we employ other words—many or few—as supplementary to those that we have used so as to convey the meaning that we desire to be conveyed. These additional and supplementary words help to make our speech or writing more effective by either supplying the required knowledge or by making the requisite emotional appeal in the wider sense. But the elucidatory words will only help the speaker or writer in making his speech or writing clear to his audience only when his speech or writing has matter enough and when.

endeavours to deliver through his poem should be conveyed to pupils through the poet's own words, and the teacher, therefore, should remove himself and not be an obstacle between the poet and the pupils.

Merely reading a poem without adequate preparation, both intellectual and emotional, or taking a verse and paraphrasing it or dealing with its grammatical constructions only, to the detriment of the more noble emotional side, or making the pupils recite it along with the teacher—these are some of the methods which are objectionable inasmuch as they cannot be calculated to contribute to the moral or intellectual development of the educands.

Having just touched on what should be avoided, I shall endeavour to throw out a few suggestions with regard to what I consider the correct method of approaching a poem. The teacher should first of all try and study the poem in such a way as to be able to convey the emotional appeal to the pupils. For example, while dealing with a poem like Milton's "Blindness" which, by the way, being lyrical is suitable only for advanced pupils, the emotional interest will be aroused by saying a few words about Milton's life, his blindness, his religious-mindedness and by reading out the biblical story concerning the talents, etc., etc.

The teacher should then proceed to the consideration of the intellectual side which includes the form and the meaning of the poem. With regard to the form, he should aviod the use of too many technical terms. Only as much of prosody as will help the pupils to appreciate the form is permissible—the Sonnet, its metre, its rhyme-scheme, its division, etc.

Then the teacher should pass on to the meaning of the poem—suitability of words and phrases, figures of speech and pictures suggested by the form, ornamental devices, etc. And lastly the teacher should wind up the lesson by linking up the chief emotion—the message the poet wants to convey

This brings us to the important consideration of the selection of topic to be studied by pupils. The choice of subject, therefore, is our premier concern. A poem dealing with noble deeds, replete with unceasing action, picturing splendid self-sacrifice, the ultimate end of which is the overcoming by the hero of all obstacles, is the sort of material that must be presented to pupils. Lyric poetry reflects the poet's own feelings, at times too subtle to be grasped even by adults, his passion and his ideas about profounder things of this world and the one to come. All this, so far as pupils of thirteen or fourteen are concerned, is dry-as-dust; it can never appeal to them. They positively refuse to reflect on the immortality of the soul or the thing of beauty being a joy for ever. If there is a poet who gives his thoughts the garb of a story and gives vivid descriptions, he can expect to be patiently read by pupils. But once the pupils begin to feel the hard and uninviting stratum of philosophical reflection underlying the sparkling mirage of the emotional story, their interest begins to wane. Nevertheless lyrical poetry should not be entirely ignored for there are certain simple lyrical poems which appeal even to the junior pupils, for example, some of Hood's or Tennyson's poems. So much then about the selection of the material.

Now with regard to the treatment of a poem which is a matter of as much importance as the choice of a poem. While dealing with a poem, the teacher must bear in mind two points: the sentiment of the piece and its form. A poem can be dealt with in various ways, and each of these ought to be considered for its individual merit. Nevertheless there are some general methods of treatment common to all. Mere intensive study by the teacher is not suffiicient; emotional appreciation is equally necessary. Often in a lyric poem, for instance, the preparation is the preparation of the mood; the teacher should find out something of the pupils' everyday experience and link it up with the experience expressed in the poem. The message the poet

it; first impressions are more vivid and lasting than those formed by subsequent readings. Then the need of very careful preparation is another essential point. In an appreciation lesson a careful preparation, both intellectual and emotional, of pupils is very important. Before beginning a poem the teacher must make sure if it is suitable to the pupils, that is, he must consider the sentiment and language of the poem. Between the age of twelve to fifteen, the boy feels as if he has been transplanted from a gloomy world into one of brightness and consciousness. It is the age of early youth when he gradually feels the consciousness of self and, whenever possible, lashes himself into enthusiastic assertion. He refuses to be hindered from exercising his self-activity. This is the age of 'hero-worship' when the pupil takes great interest in the perusal of poems or stories of great heroes, national or foreign, and delights in identifying himself with the hero whose sacrifices and exploits appeal to him most. At this age, therefore, poems which describe noble deeds and which deal with endurance and courage will attract him. Pupils at this age are too young to be able to reflect and to have the sense of values concerning philosophy and other abstractions. Poetry embodying philosophical thought, therefore, cannot interest them unless the profound reflectiveness of it is veneered with an obviously stirring emotion or sentiment. However, it would be better to avoid reflective poetry altogether. They are too young to discover, or to be interested in, the morality or immorality of an action, or to rack their minds over fathoming the motives of the agent. Instead, they are interested in the action and the agent. Poems describing duels or fights between a giant and a knight—these attract them. If the fight between a giant and a knight were not to end in the death of one, preferably the giant, the poem suffers from pupils' point of view. Pupils want, and are goaded into paroxsysms of delight at reading, poems and stories describing blood, great exploits, unceasing action, the pursuer and the pursued and so on and so forth.

The Study of a Poem

BY

Mehboob A. Tahir, M. A., M. Ed. (Leeds).

CULTIVATION of taste is a question not only of academic but of national importance. Good music, good literature, good pictures, however indirectly, do influence life. Appreciation of a piece of literature or a good picture presupposes the presence of emotion. Beauty, truth and goodness are the three supreme values of life. To understand life, therefore, one has to understand the significance of these supreme values. And literature, if properly taught in schools, will be greatly valuable in making pupils appreciate and understand life. Hence the importance of literature as an essential part of school syllabus.

The human value of literature is comparable to that of history. There are human problems in both, and the study of either brings us face to face with these problems. The human value lies in our judgment with regard to human actions, motives and feelings.

Nothing comes out of a forced study of literature. Literature should be read and appreciated by pupils. Repetition of opinions about authors and their works proves diffidence and want of assertiveness and originality. A study of literature gives ample scope for the enlargement of sympathies and imagination; but this is only possible when pupils form their own opinions. The teacher may certainly give his opinions to the class but he must not endeavour to inflict them and thus jeopardize the growing possibilities and potentialities of many a promising boy inasumch as no two people necessarily think alike.

The presentation of a poem must be earmarked with some such peculiarities that pupils may always remember

THE HYDERABAD TEACHER

April—June 1932.

CONTENTS.

Vol. VI. REGISTERED ASAFIA No. 47. No. 4.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

APRIL - JUNE, 1932

Editorial Staff:

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1932.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VI. No. 4.

THE

HYDERABAD TEACHER

APRIL - JUNE, 1932



Editorial Staff :

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1932.